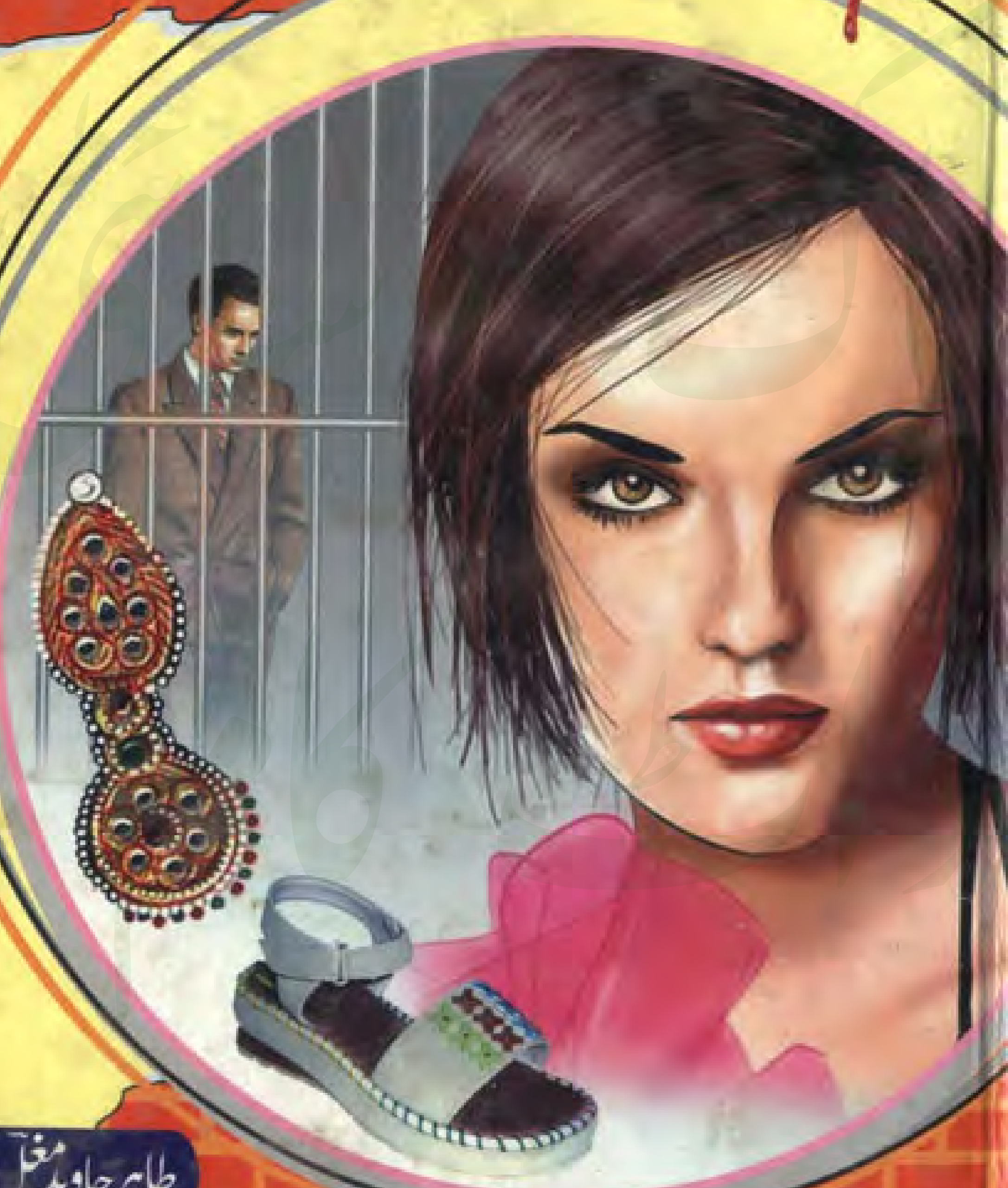
جرم و سزا

انسپکٹر نواز خان کی جرم و سزا پر مبنی تفتیشی کہانیاں

جوتی جھمکا اور جیل



طاہر جاوید مغل

سردیوں کے دن تھے، میں ان دنوں جالندھر کے مضافاتی علاقے میں تھا۔ صبح آٹھ بجے کے قریب تھانے پہنچا تو پہلوان اختر بھورا پہلے سے آیا بیٹھا تھا۔ اس کے ساتھ گاؤں کا نمبردار چوہدری گوجر سنگھ بھی تھا۔ دونوں کے چہروں پر دبا دبا جوش ظاہر کر رہا تھا کہ وہ کوئی اہم خبر لائے ہیں اس کے ساتھ ہی یہ اندازہ بھی ہوتا تھا کہ اس خبر کا تعلق ان کی اپنی ذات سے نہیں۔ اگر خبر کا تعلق ان کی اپنی ذات سے ہوتا تو چہرے اس طرح ہشاش بشاش نظر نہ آتے۔

سلام دُعا کے بعد میں نے دونوں حضرات سے آنے کا مقصد پوچھا۔ پہلوان اختر نے ہولے سے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ پہلوان کی عمر قریباً پینتیس برس تھی۔ اس میں پہلے جیسا زور نہیں رہا تھا لیکن ورزش بڑی باقاعدگی سے کیا کرتا تھا۔ قصبے میں اس کی عزت تھی۔

کہنے لگا۔ ''تھانیدار صاحب! صبح سویرے ایک کڑی اغواء ہوگئی ہے پنڈ سے۔''

یہ بڑی دھماکہ خیز خبر تھی۔ میں سوالیہ نظروں سے پہلوان کا چہرہ تکنے لگا۔ پہلوان نے ایک نظر چوہدری گوجر کی طرف دیکھا۔ پھر پگڑی سنبھالتا ہوا بولا۔ ''میں صبح بانگ کے ٹائم اکھاڑے میں جاتا ہوں۔ آج بھی جا رہا تھا۔ دوڑ لگاتا ہوا جب میں ''مستری احاطے'' کے پاس سے گزرا تو کسی کی چیخ سنائی دی۔ یہ کوئی لڑکی تھی۔ ایسا لگا کہ نور شاہ کے کُھوہ کے پاس کچھ بندے اس سے زبردستی کر رہے ہیں۔ میں خالی ہاتھ تھا۔ پہلے تو ایک دو سیکنڈ سوچا پھر ہمت کر کے کُھوہ کی طرف گیا۔ اسی وقت گھوڑے دوڑنے کی آواز آئی۔ میں نے دیکھا کہ تین بندے ایک کڑی کو گھوڑے پر لاد کر بھاگ رہے ہیں۔ کڑی کی آواز بھی نہیں نکل رہی تھی۔ شاید انہوں نے اس کا منہ بند کر دیا۔ میں نے انہیں للکارا لیکن وہ ایک منٹ میں یہ جا وہ جا ہو گئے۔ میں نے موقع پر پہنچ کر دیکھا۔ یہ جوتی وہاں پڑی ہوئی تھی اور اس کے ساتھ یہ جھمکا بھی تھا۔'' پہلوان نے جوتی اور جھمکا دونوں اپنی ڈب میں سے نکال کر میرے سامنے رکھ دیے۔ میں نے دونوں اشیاء پر نگاہ

ڈالی۔ زنانہ جوتی دیکھ کر میں بری طرح چونکا۔ یہ ایک نئے فیشن کی بے حد قیمتی جوتی تھی۔ کچھ نہیں تو سوڈیڑھ سو روپیہ قیمت ہوگی...... چھوٹے موٹے شہروں میں ایسی جوتیاں فروخت ہی نہیں ہوتیں، لیکن جھمکا بالکل معمولی تھا۔ کسی سستی سی دھات کا بنا ہوا تھا۔ غالباً کسی میلے ٹھیلے سے خریدا گیا تھا۔ ایسے جھمکے میں نے سانسیوں اور چنگڑوں کی عورتوں کے کانوں میں اکثر دیکھے تھے۔ دونوں چیزوں کا ایک ساتھ ملنا حیران کن تھا۔ فوراً خیال آتا تھا کہ یہ دونوں اشیا ایک ہی عورت یا لڑکی کی نہیں ہوسکتیں۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ یہ جھمکا پہلے سے کہیں موقع پر گر کر پڑا ہو اور پہلوان نے اسے جوتی کے ساتھ ہی ثبوت کے طور پر اٹھا لیا ہو۔

پہلوان نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا، ''میں بھاگا ہوا چوہدری کی طرف گیا لیکن راستے میں پل کے پاس مجھے ''بڑے صاحب'' مل گئے۔ وہ ابھی ابھی اپنے بنگلے سے نکلے تھے مجھ سے پوچھنے لگے کہ کیا ہوا ہے۔ میں نے سارا واقعہ انہیں بتایا۔ وہ اندر سے اپنی جیپ لے آئے۔ ان کی پکی رائفل پہلے سے جیپ میں پڑی تھی۔ ہم نے سیدھا روہی نالے کا رخ کیا۔ نالے کے کنارے کنارے اور کھیتوں میں ہم نے کافی جیپ چلائی لیکن گھڑسواروں کا کہیں کھوج نہیں ملا۔ ابھی آدھ گھنٹہ پہلے ہم تھکے ہارے واپس آئے ہیں اور آتے ساتھ ہی آپ کو رپورٹ لکھوانے پہنچ گئے ہیں۔''

میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اختر پہلوان جس شخص کو بڑے صاحب کہہ رہا تھا اس کا نام پیٹر اسمتھ تھا۔ وہ محکمہ انہار میں سپروائزر تھے۔ بڑے پڑھے لکھے اور قانون دان افسر تھے۔ اگر یہ معاملہ ان کے نوٹس میں آ چکا تھا تو اس کی فوری تفتیش اور بھی ضروری ہوگئی تھی۔

میں نے اختر پہلوان سے پوچھا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے۔ اغوا کرنے والے کون تھے اور اغوا ہونے والی کون تھی؟''

اختر بولا۔ ''جناب! سیدھی سادی بات ہے۔ اغوا ہونے والی اس گاؤں کی تو نہیں تھی ورنہ اب تک دہائی مچ چکی ہوتی۔ ہوسکتا ہے وہ کوئی سانسی یا چنگڑ عورت ہو۔ یہ جھمکا جو آپ دیکھ رہے ہیں عام طور پر سانسی عورتیں ہی پہنتی ہیں۔ پھر وہ لوگ گئے بھی روہی نالے کی طرف ہیں۔ نالے کے ساتھ ساتھ کچھ نہیں تو پانچ چھ بستیاں تو چنگڑوں اور سانسیوں کی ضرور ہیں......''

میں نے کہا۔ ''تمہارا خیال ہے کہ وہ کوئی سانسی ہے جسے اس کے والی وارث ہی اٹھا کر لے گئے ہیں۔''

پہلوان اپنا چھوٹا سا سر ہلا کر بولا۔ ''بالکل ایسا ہوسکتا ہے جی! میں ٹھیک طرح نہیں دیکھ سکا لیکن مجھے شک پڑتا ہے کہ گھڑسواروں کے پاس لاٹھیوں کی بجائے کلہاڑیاں تھیں اور آپ

کو پتہ ہی ہے کلہاڑیاں ان خانہ بدوشوں کے پاس ہی ہوتی ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''اور یہ جو میموں جیسی جوتی تمہیں ملی ہے، اس کو کس خانے میں فٹ کرو گے؟''

''آپ کی بات ٹھیک ہے جی...... لیکن کیا پتہ یہ چوری شوری کا مال ہو۔ آپ کو پتہ ہی ہے یہ ٹپری واس کہاں کہاں ہاتھ مارتے ہیں۔''

میں نے اندازہ لگایا کہ پہلوان اور چوہدری اس معاملے میں پھنسنے کے بعد اپنی جان چھڑانا چاہتے ہیں اور ان کی خواہش ہے کہ خواہ مخواہ انہیں گواہیوں کے لیے تھانے کچہری کے چکر نہ لگانے پڑیں۔

میں نے تمام ضروری معلومات حاصل کرنے کے بعد پہلوان اور چوہدری کے ساتھ جائے وقوعہ کا معائنہ کیا۔ فیشن ایبل جوتی اور گھوڑوں کے سموں کے علاوہ کوئی خاص نشانی نظر نہیں آئی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اغوا ہونے والی قصبے کی شمالی جانب سے آئی۔ وہ کافی دیر ''مستری احاطے'' کے پاس گھومتی رہی۔ اس دوران نور شاہ کے کنوئیں کی طرف سے تین گھڑ سوار آئے اور مغویہ کو گھوڑے پر لاد کر لے گئے۔ میں نے پہلوان سے کہا کہ وہ سہ پہر کے وقت پھر تھانے آئے۔ میں اس کے ساتھ روہی نالے کا ایک چکر لگانا چاہتا ہوں۔

توقع کے مطابق دوپہر کے وقت سپروائزر صاحب کا پیغام بھی آ گیا۔ انہوں نے ہدایت بھیجی کہ اس واردات کا جلد کھوج لگایا جائے اور جیسے بھی ہو مغویہ برآمد کی جائے۔

سہ پہر تین بجے کے قریب میں اور اختر پہلوان گھوڑوں پر سوار روہی نالے کی طرف روانہ ہوئے۔ نالہ وہاں سے قریباً چار کوس دور تھا۔ پہلوان نے کئی جگہ مجھے ٹائروں کے نشانات دکھائے یہ سپروائزر صاحب کی جیپ تھی جس میں وہ اور پہلوان گھڑسواروں کو ڈھونڈتے رہے تھے لیکن قصبے کے قریب ہی کہیں کہیں کسی اور گاڑی کے ٹائر بھی دکھائی دیے۔ ان نشانات کے متعلق پہلوان کو کچھ علم نہیں تھا۔

ایک چھوٹی سی پلی سے نالہ پار کر کے ہم دوسری جانب چلے گئے۔ یہ خاصا غیر آباد علاقہ تھا۔ زمین کلری تھی۔ دور تک جنتر کی جھاڑیاں اور کیکر کے خود رو پودے تھے۔ اس علاقے میں گیدڑوں، جنگلی کتوں اور بلوں کی کثرت تھی۔ کبھی کبھی دریا کی طرف سے سؤر وغیرہ بھی نکل آتے تھے۔ یہاں دس میل کے ''ایریے'' میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ٹپری واسوں کے کئی پڑاؤ تھے۔ ان میں چنگڑ، اوڈ، سانسی، دیندار، گگڑے، نٹ کئی قبیلے تھے۔ سانسی زیادہ تعداد میں تھے۔ یہ لوگ خونخوار شکاری کتے پالتے تھے۔ ان کو بلی مار بھی کہا جاتا تھا کیونکہ بلیوں کا گوشت بڑی رغبت سے کھا جاتے تھے۔ اس کے علاوہ چوری اور رسہ گیری بھی ان کے

پسندیدہ مشغلے تھے۔ سانسیوں کے بڑے مکھیا کا نام سترام جاہ تھا۔ یہ شخص چھٹا ہوا بدمعاش اور قانون شکن تھا۔ مجھے پتہ چلا کہ وہ قبرستان سے لاشیں نکالنے کا کام بھی کرتا ہے اور پٹیالے کے بدنام لاش چوروں سے اس کے رابطے ہیں...... میں نے اس منحوس شخص کی مخبری کے لیے پچھلے چند ہفتوں سے دو مخبر اس کی بستی میں داخل کر رکھے تھے۔ یہ دونوں مخبر سانسیوں کے بھیس میں بڑے کامیاب تھے اور اب تک مجھے کئی اہم اطلاعات دے چکے تھے...... بہر حال یہ ایک علیحدہ داستان ہے۔ اس وقت میں مغویہ لڑکی کی بات کر رہا ہوں جو اپنی بہت قیمتی جوتی اور بہت بے کار جھمکا نشانی کے طور پر ہمارے پاس چھوڑ گئی تھی۔ میں نے جو دو مخبر سانسیوں کے ڈیرے پر بھیج رکھے تھے ان میں ایک بلال شاہ تھا۔ بلال شاہ سانسی اور لگڑے وغیرہ کے بھیس میں بڑا کامیاب رہتا تھا۔ اس سے پہلے ایک دفعہ امرتسر میں بھی میں اس سے ایسا ہی کام لے چکا تھا۔ میں نے سوچا کیوں نہ سترام جاہ کی بستی کا رخ کیا جائے۔ سترام بڑا باخبر شخص تھا۔ ٹپری واسوں کے ہر برے بھلے کی خبر رکھتا تھا عین ممکن تھا کہ اسے اس معاملے کی بھی سن گن ہو اور یہ بھی کوئی ایسی ناممکن بات نہیں تھی کہ وہ خود ہی اس معاملے میں ملوث ہو۔
میں نے چند لمحے غور کیا اور پھر گھوڑوں کا رخ سترام جاہ کے ڈیرے کی طرف موڑ دیا۔

☆======☆======☆

سترام جاہ کا ڈیرہ ایک پرانے شمشان گھاٹ کے دامن میں واقع تھا۔ قریباً ایک سو جھونپڑے اور جھونپڑیاں تھیں۔ اردگرد کوڑے کرکٹ کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ یہ کوڑا کرکٹ سانسیوں کی عورتیں جمع کرتی تھیں اور بعد میں ان سے کارآمد چیزیں علیحدہ کر کے بیچی جاتی تھیں۔ مختلف چیزیں تولنے کے لیے کنڈے وغیرہ بھی لگے ہوئے تھے۔ پڑاؤ میں جگہ جگہ بار برداری کے جانور نظر آ رہے تھے۔ اس کے علاوہ رکھوالی کے خونخوار کتے کھونٹوں سے بندھے ہوئے تھے۔ میں تین چار مرتبہ پہلے بھی یہاں آ چکا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ لوگ چوکنے ہو گئے۔ ایک ننگ دھڑنگ شخص بھاگتا ہوا سترام جاہ کے جھونپڑے کی طرف گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ادھیڑ عمر سترام جاہ اپنا پٹکا سر کے گرد لپیٹتا ہوا باہر نکل آیا۔ اس کے جسم پر صرف ایک دھوتی تھی۔ بالوں بھرے سینے پر کلہاڑی کا ایک پرانا گھاؤ تھا اور دور سے ہی صاف نظر آ رہا تھا۔
”آؤ مائی باپ...... ست سلام...... ست سلام۔“
وہ اپنے مخصوص انداز میں بولا اور جھومتا ہوا ہماری طرف بڑھنے لگا۔ بستی میں اس کی دہشت تھی۔ لگتا تھا انسان تو انسان پڑاؤ کے جانور بھی اس سے بدکتے ہیں۔ ایک بکری پھدک کر اس کے راستے سے ہٹ گئی اور ایک بھاری بھرکم مرغی کو اس نے خود ٹھوکر مار کر

راستے سے ہٹا دیا۔ میں نے گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے اس سے ہاتھ ملایا۔ مصافحے کے بعد اس نے اپنے کالے کلوٹے ہاتھ کو چوما اور ماتھے سے لگانے کے بعد سینے پر رکھ لیا۔ اس انداز میں عزت سے زیادہ اکڑفوں اور بناوٹ تھی...... وہ مجھے اور اختر پہلوان کو لے کر اپنے جھونپڑے میں آ گیا۔ جھونپڑے کے دروازے پر اس کا خوفناک چت کبرا کتا حلق سے خوفناک آوازیں نکال رہا تھا۔ اندر سترام جاہ کی تیسری بیوی اپنے دو ماہ کے بچے کے پوتڑے اکٹھے کر رہی تھی۔ ہمارے اندر پہنچنے سے پہلے ہی اس نے گز بھر کا گھونگھٹ نکال لیا تھا۔ پوتڑے اکٹھے کر کے وہ چھپاک سے باہر نکل گئی۔ اس کے نکلتے ہی دو تین اور ادھیڑ عمر سانسی اندر آ گئے۔ مکھیا کی طرح ان کے حلیے بھی عجیب و غریب تھے۔ رنگ دار لباس، آنکھوں میں سرمہ، بال تیل میں چپڑے ہوئے۔ ایک شخص کے کان میں چاندی کے بڑے بڑے چھلے تھے۔ یہ سترام جاہ کا چھوٹا بھائی ہیرا تھا۔ ان سب کی سوالیہ نظریں میری طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ آج صبح قصبے سے ایک لڑکی اغوا ہوئی ہے اور مجھے شبہ ہے کہ اسے اس بستی میں لایا گیا ہے۔
سانسیوں نے یہ الزام بڑے اطمینان اور سکون سے سنا۔ سترام جاہ نے حقے کے چند طویل کش لیے اور گھنی مونچھوں کے نیچے سے دھواں نکال کر بولا۔ ”مائی باپ! ڈیرہ آپ کے سامنے ہے۔ ہم سب آپ کے چاکر ہیں۔ آپ حکم دیں، ہم کپڑے جھاڑ کر نالے کے کنڈے پر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ آپ تسلی سے ٹپریوں کی تلاشی لے لیں۔ اگر ہم میں سے کوئی جرم دار ہو تو بے شک یہیں پھانسی گاڑ کر پھانسی دے دیں، یا اس پستول سے گولی مار کر لاش نالے میں پھینک دیں۔“
میں نے کہا۔ ”سترام! کیا تم روہی کے دوسرے ڈیروں کے بارے میں بھی یہی بات کہہ سکتے ہو۔ ہو سکتا ہے لڑکی کسی دوسری بستی میں رکھی گئی ہو۔“
سترام کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ اس نے کھنگورا مار کر گلا صاف کیا اور بولا۔ ”مائی باپ! آپ کو جس ڈیرے پر شک ہے وہاں چلے چلتے ہیں۔ آپ کے سامنے ہی انصاف ہو جائے گا۔“
میں کافی دیر سترام جاہ سے گفتگو کرتا رہا۔ اس دوران جھونپڑے سے باہر کافی لوگ اکٹھے ہو گئے تھے۔ ان میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے۔ مجھے اپنا مخبر انت سنگھ نظر آیا۔ کم بخت پھٹا پرانا کمبل لیے جدی پشتی سانسی نظر آ رہا تھا۔ سر پر استرا پھرا ہوا، آنکھوں میں گیڈ، جسم پر میل کچیل، اس نے کتے کا ایک نومولود بچہ اٹھا رکھا تھا، میری اور اس کی نگاہ ایک لمحے کے لیے ملی لیکن چہروں پر شناسائی ظاہر نہیں ہوئی۔ بلال شاہ کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ پتہ

نہیں کہیں لسی ڈکار کر سویا ہوا تھا۔ ان دنوں وہ بڑی قربانی دے رہا تھا۔ اس کی کئی عیاشیاں چھوٹی ہوئی تھیں لیکن لسی تو وہ کسی صورت نہیں چھوڑ سکتا تھا چاہے بکری یا بھیڑ کا دودھ ہی کیوں نہ ہو...... مجھے یقین تھا کہ وہ دسمبر کی سخت سردی میں ''قطب شمالی'' پہنچ جاتا تو وہاں بھی ادھ رڑکا ضرور پیتا، چاہے اس کے بعد دوسرا سانس لینا نصیب نہ ہوتا...... یقیناً اس ڈیرے میں بھی اس نے لسی پانی کا کوئی نہ کوئی انتظام کر رکھا تھا۔

ہم دونوں رات قریباً نو بجے روہی نالے سے واپس تھانے لوٹے، یہاں میرا سب انسپکٹر عزیزی فرزند علی صبح سے مصروف تھا۔ اس نے بتایا کہ اردگرد کے دیہات میں کہیں کوئی لڑکی اغوا نہیں ہوئی اور نہ ہی کوئی رپورٹ درج کرائی گئی ہے۔ فیشن ایبل جوتی یا جھمکے کے بارے میں بھی کہیں سے کچھ پتہ نہیں چلا۔ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کون سانسی عورت تھی جو ایسی قیمتی جوتی پہنے قصبے کے باہر گھوم رہی تھی۔ کیا اسے معلوم نہیں تھا کہ قصبے کے ساتھ ذخیرہ کے اندر ''چنگڑ'' عام گھومتے رہتے ہیں اور اکا دکا سانسی دن کے وقت بھی ادھر کا رخ نہیں کرتے (سانسیوں اور چنگڑوں میں گہری دشمنی تھی اور ایک سال پہلے اسی مقام پر دو سانسی، چنگڑوں کے ہاتھ سے قتل ہو چکے تھے)

اگلا روز بھی بغیر کسی اہم خبر کے گزر گیا...... میری توقع کے عین مطابق رات کو بلال شاہ میرے گھر آن پہنچا۔ وہ اکثر رات گئے آیا کرتا تھا۔ منہ سر کمبل میں لپٹا ہوتا تھا۔ کبھی کبھی انت سنگھ بھی اس کے ساتھ ہوتا تھا۔ تاہم اس رات وہ اکیلا تھا۔ بلال شاہ کا حلیہ بڑا دلچسپ تھا۔ اس نے ٹنڈ کرا رکھی تھی۔ چھوٹی چھوٹی داڑھی بھی رکھ لی تھی، لباس پھٹا پرانا تھا اور سانسیوں کی طرح گلے میں منکے وغیرہ ڈال رکھے تھے۔ چند رسمی باتوں کے بعد اس نے پوچھا کہ میں کل ڈیرے پر کیوں آیا تھا...... بلال شاہ سے کیا چھپانا تھا۔ میں نے شروع سے آخر تک ساری بات اسے بتا دی۔ وہ غور سے سنتا رہا۔ میں اس کے چہرے پر اتار چڑھاؤ محسوس کر رہا تھا۔ کہنے لگا۔

''خاں صاحب! مجھے اغوا وغیرہ کے چکر کا تو پتہ نہیں لیکن کل سے ڈیرے پر کوئی گڑبڑ ہے ضرور...... رات آٹھ نو بجے چنگڑوں کے ڈیرے سے ایک بندہ گھوڑے پر آیا تھا۔ وہ سیدھا کھیا سترام کی پڑی (جھونپڑے) میں چلا گیا۔ وہ بندہ مجھے مشکوک لگ رہا تھا۔ لڑکی والے واقعے کا تو مجھے پتہ ہی نہیں تھا۔ مجھے خیال آیا کہ ہو سکتا ہے قبرستان والا معاملہ ہو۔ میں ٹوہ لینے سترام کے جھونپڑے میں چلا گیا۔ پیٹ درد کا بہانہ بنایا۔ کھیا سترام جھاڑ پھونک بھی کرتا تھا ہے۔ ایک دفعہ پہلے بھی میں اسی بہانے اس کے جھونپڑے میں گھسا تھا۔ میں اندر گیا تو سترام چنگڑوں کے بندے سے باتیں کر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر غرایا ''کیوں منہ اٹھائے چلا آیا ہے۔''

میں نے کہا ''کھیا! میں مر رہا ہوں، کلیجے پر چھریاں چل رہی ہیں۔''

وہ بولا ''اچھا چل باہر بیٹھ میں ابھی دیکھتا ہوں تجھے۔''

''بس جی! میں ہائے ہائے کرتا باہر آیا اور جھونپڑے کے بالکل پاس ہی لیٹ گیا۔ اندر سے باتوں کی مدھم آواز آ رہی تھی۔ چنگڑوں کا بندہ کہہ رہا تھا۔ ''کھیا! میں پیغام لے کر آیا ہوں۔ مجھ سے گرم سرد ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ تو صاف سیدھا معاملہ ہے۔ ایک ہاتھ دو، دوسرے ہاتھ لو، نہ کوئی جھگڑا نہ رولا۔''

کھیا سترام نے کہا ''لیکن کیا ثبوت ہے کہ لڑکی تمہارے پاس ہی ہے۔''

چنگڑ کی آواز آئی۔ ''وہ ثبوت بھی ساتھ لایا ہوں۔ یہ دیکھ لو اس کی اوڑھنی!''

کچھ دیر جھونپڑے میں خاموشی رہی پھر سردار نے کہا۔ ''ہو سکتا ہے تم نے اسے جان سے مار ڈالا ہو اور اب ہمیں چکر دینے کے لیے یہاں آ گئے ہو۔''

چنگڑ بولا۔ ''تم کسی بندے کو بھیج کر پتہ کروا لو۔''

تھوڑی دیر اسی طرح کی باتیں ہوتی رہیں پھر چنگڑوں کا بندہ گھوڑے پر بیٹھ کر واپس چلا گیا۔ آج صبح سویرے سترام کا چھوٹا بھائی ہیرا اور اس کے دو سالے چنگڑوں کے ڈیرے پر گئے۔ ان کی واپسی شام سے تھوڑی دیر پہلے ہوئی ہے۔ اس وقت سے سردار کے جھونپڑے میں کوئی کھچڑی پک رہی ہے۔ چار پانچ سرکردہ بندے بیٹھے ہوئے ہیں اور کسی کو اندر جانے کی اجازت نہیں ہے۔''

بلال شاہ ساری روئیداد سنا کر خاموش ہو گیا۔ بلال شاہ کی باتوں سے اس واقعے کی اہمیت اور بڑھ گئی تھی۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ پرسوں رات کوئی نہ کوئی واردات ہوئی ہے اور اس واردات کا تعلق روہی نالے کے خانہ بدوشوں سے ہے۔ سانسیوں پر تو مجھے پہلے ہی شک تھا۔ اب چنگڑ قبیلے کے بارے میں بھی شبہ پیدا ہو رہا تھا۔ ان کے پاس ایک لڑکی تھی اور وہ لڑکی کا سودا کرنے سانسیوں کے پاس آئے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ لڑکی سانسی ہے جو کسی وجہ سے چنگڑوں کے چنگل میں جا پھنسی ہے اور اب چنگڑ اس کی قیمت وصول کرنا چاہ رہے ہیں، لیکن یہ صرف میرا خیال تھا۔ کوئی اور بات بھی ہو سکتی تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ ابھی اور اسی وقت چنگڑ قبیلے کے ڈیرے پر چھاپہ مارا جائے۔ روہی نالے کے خانہ بدوشوں میں چنگڑ آبادی کے لحاظ سے دوسرے نمبر پر تھے۔ نالے کے پرانے پُل کے قریب چنگڑوں کا بڑا ڈیرہ تھا۔ اس ڈیرے میں ساٹھ ستر جھونپڑے تھے۔ چنگڑ اپنے سردار کو ''مے ہر'' بھی کہتے تھے۔ اس بستی کا سردار دلاور نامی ایک شخص تھا۔ دو تین بار تھانے میں اس سے ملاقات ہو چکی تھی۔

میں نے کہا۔ ”بلال شاہ! کیا خیال ہے اسی وقت چنگڑوں پر چڑھائی نہ کی جائے۔ ہو سکتا ہے وہ لڑکی اس وقت ان کے ڈیرے پر ہو۔“

بلال شاہ نے کہا۔ ”آپ بہتر سمجھتے ہیں خاں صاحب! ویسے میرا خیال ہے کہ لڑکی اب وہاں ہوگی نہیں۔“

”کیوں؟“ میں نے پوچھا۔

”آپ نے مکھیا سترام کے ڈیرے پر جا کر غلطی کی ہے۔ سارے خانہ بدوشوں نے کان کھڑے کر لیے ہیں۔ چنگڑوں نے سوچا ہوگا کہ سترام کے ڈیرے پر پولیس آئی ہے تو کل ان کے ڈیرے پر بھی آ جائے گی۔ جہاں تک میری موٹی عقل کام کرتی ہے، انہوں نے لڑکی کو ”اگاں پشاں“ (آگے پیچھے) کر دیا ہوگا۔“

میں نے کہا۔ ”بات تو تیری ٹھیک ہے بلال شاہ لیکن ٹرائی کرنے میں کیا حرج ہے۔“

بلال شاہ نے اپنی یخ بستہ ٹنڈ پر ہاتھ پھیرا۔ ”ہاں جی! ٹرائی کرنے میں تو کوئی حرج نہیں۔ ضرور کریں ٹرائی۔ آپ کی ٹرائیوں نے ہی تو ہمیں گھر سے بے گھر کر رکھا ہے۔ دو مہینے ہو گئے ہیں کتوں کی طرح رہتے ہوئے۔ مجھے تو اب شبہ ہونے لگا ہے شاید واقعی میں کسی سانسی کی اولاد ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”کہیں بلیاں وغیرہ تو نہیں کھانے لگے ہو۔“

بلال شاہ نے برا سا منہ بنایا۔ ”بلیاں بھی کھانے لگیں گے...... پرسوں کھوتی کا دودھ تو پی ہی لیا ہے۔“

”کھوتی کا دودھ؟“ میں نے حیرانی سے پوچھا۔

”جی ہاں! حوالدار انت سنگھ کی آنکھ خراب تھی۔ مکھیا سترام نے اس کے لیے کھوتی کا دودھ تجویز کیا۔ بدقسمتی میری کہ میں بھی پاس ہی کھڑا تھا۔ کہنے لگا تم بھی پیو، بڑی صحت بخش چیز ہے۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ سانسی ہونے کا بھرم تو رکھنا تھا۔ دو تین گھونٹ بھر لیے۔“ بلال شاہ کا منہ ٹوٹے پیالے جیسا ہو رہا تھا۔ مجھے واقعی اس پر ترس آیا میں نے کہا۔

”بلال شاہ! بس پیارے! ایک دو ہفتے کی بات ہے۔ پھر ان گدھوں کتوں سے تیری جان چھوٹ جائے گی۔“

بلال شاہ کو کچھ ضروری ہدایات دے کر میں نے واپس بھیج دیا اور اسی وقت چنگڑوں کے ڈیرے پر جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ وردی پہن کر سیدھا تھانے پہنچا۔ وہاں سے حوالدار کرم دین اور تین کانسٹیبلوں کو ساتھ لیا اور نکل کھڑا ہوا۔ میں اور کرم دین گھوڑیوں پر سوار تھے جبکہ رائفل بردار

کانسٹیبل گھوڑوں پر تھے۔ حوالدار کے پاس بھی پکی رائفل تھی جبکہ میں 38 بور کے ریوالور سے مسلح تھا۔ رات تاریک اور ہوا بڑی سرد تھی۔ ہم نے گرم چادریں اوڑھ رکھی تھیں لیکن سردی کے سامنے وہ ململ کے دوپٹے جیسی تھیں۔ عملہ چپ چاپ تھا۔ اتنی سردی میں رات گئے جب عملے کو چھاپے کے لیے اٹھایا جائے تو وہ دل ہی دل میں اپنے انچارج کو کوستا رہتا ہے۔ میں خود بھی جب اے ایس آئی تھا تو تصور ہی تصور میں کئی بار اپنے ایک انسپکٹر کو قتل کر چکا تھا۔ بلکہ ایک بار تو واقعی اس سے تو تو میں میں ہو گئی تھی۔ میرا عملہ اتنا دلیر تو نہیں تھا کہ تو تو میں میں کرتا لیکن دل ہی دل میں ضرور کڑھ رہا تھا۔ سخت سردی اور دشوار راستے پر آٹھ میل کا سفر کر کے ہم رات کوئی دو بجے چنگڑ بستی کے قریب پہنچے۔ چنگڑوں کے کتے فاصلے پر ہونے کے باوجود زور شور سے بھونک رہے تھے۔ میں نے دو ہوائی فائر کیے تو بستی سے باہر تین لالٹینیں چمکنے لگیں۔

”کون ہے بھئی؟“ ایک رعب دار آواز آئی۔

”تیرے باپ آئے ہیں بے پورسے۔“ حوالدار نے غصے میں پکار کر کہا۔

ایک لالٹین جلدی سے واپس چلی گئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد سردار آنکھیں ملتا ہوا ڈیرے سے باہر آ گیا۔ سردار کا نام دلاور تھا۔ وہ خود کو مسلمان کہتا تھا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ وہ لوگ ٹوکریاں اور چھاج وغیرہ بنا کر گزارہ کرتے ہیں۔ چوری چکاری اور دوسرے جرائم سے ان کا دور کا بھی واسطہ نہیں لیکن میں یہ بات ماننے کو ہرگز تیار نہیں تھا۔ چور چوری سے جائے لیکن ہیرا پھیری سے نہیں جاتا۔ دلاور، سترام کی طرح نت نئی عورتوں سے اپنا بستر تو گرم نہیں کرتا تھا لیکن نشے کی اسے پرانی لت تھی۔

چنگڑوں کے پڑاؤ میں داخل ہوتے ہی میں نے سب سے پہلے دلاور کے جھونپڑے کا رخ کیا۔ اس جھونپڑے کے آس پاس دلاور کے قریبی رشتے داروں کے جھونپڑے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر لڑکی اس پڑاؤ میں ہے تو وہ انہی جھونپڑوں میں ہوگی۔ میں نے اپنے کانسٹیبلوں کو جھونپڑوں سے باہر ہی چوکس کھڑا کر دیا اور خود حوالدار کے ساتھ دلاور کے جھونپڑے میں گھس گیا۔ عام جھونپڑوں کی طرح اس جھونپڑے میں بھی ایک گدھی اور دو بکریاں بندھی ہوئی تھیں۔ اس کے علاوہ وہ سب کاٹھ کباڑ موجود تھا جو خانہ بدوشوں کے جھونپڑوں میں ہوتا ہے۔ جھونپڑے میں تاڑی کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ تاڑی اس نشہ آور رس کو کہتے ہیں جو تاڑ کے کھجور نما پودے سے حاصل کیا جاتا ہے۔

جھونپڑے میں ایک ہی جہازی سائز کی چارپائی تھی۔ اس چارپائی پر دو بچے گہری نیند سو رہے تھے۔ تاہم بچوں والی اٹھ کر کسی دوسرے جھونپڑے میں جا چکی تھی۔ دلاور سمجھ چکا تھا کہ

میں جھونپڑے کی تلاشی لینا چاہتا ہوں۔ وہ ہاتھ سینے پر باندھے ایک طرف خاموش کھڑا ہو گیا۔ اس کے انداز سے لاپرواہی اور بیزاری ظاہر ہوتی تھی۔ دلاور کی عمر یہی کوئی تیس برس رہی ہو گی۔ وہ اصولی طور پر ابھی بستی کا سردار نہیں بنا تھا لیکن اس کا باپ خاصا بوڑھا ہو چکا تھا اور زیادہ وقت اپنے جھونپڑے میں سویا رہتا تھا اس لیے دلاور کو ہی سردار سمجھا جاتا تھا۔ میں نے لالٹین اور ٹارچ کی مدد سے اچھی طرح جھونپڑے کی تلاشی لی۔ تاڑی کی ایک بوتل اور دو تولے افیم کے سوا یہاں سے کوئی قابلِ اعتراض شے برآمد نہیں ہوئی۔ میں ساتھ والے جھونپڑے میں پہنچا۔ یہ دلاور کے والد کا تھا۔ وہ مدقوق بوڑھا بے خبر سو رہا تھا۔ قریب ہی ایک جائے نماز اور تسبیح پڑی تھی۔ میں نے بوڑھے کو جگائے بغیر اس جھونپڑے کی اشیاء کو بھی الٹ پلٹ کر دیکھا۔ اس کے بعد تیسرے جھونپڑے کی باری آئی۔ اس جھونپڑے میں داخل ہوتے ہی مجھے کچھ عجیب سا لگا۔ یہاں دو چارپائیاں تھیں اور ایک چارپائی پر نیا بستر نظر آ رہا تھا۔ خانہ بدوشوں کے بستر عموماً خستہ حال ہوتے ہیں۔ نیا بستر ان لوگوں کے پاس ایک آدھ ہی ہوتا ہے اور اسے کسی خاص موقع پر بچھایا جاتا ہے۔ میں نے دلاور سے پوچھا۔ ''یہ کس کا جھونپڑا ہے؟''

وہ بولا۔ ''......میرے تاؤ کا۔''

میں نے کہا۔ ''تیرا تاؤ تو چھڑا چھانڈ ہے۔ یہ جھونپڑے میں دوسرا بستر کس کا نظر آ رہا ہے؟''

''وہ ایک مہمان آیا تھا تاؤ کا......شکر گڑھ سے......آج دوپہر ہی واپس گیا ہے۔''

دلاور کے جواب سے میری تسلی نہیں ہوئی۔ میں نے حوالدار کے ساتھ مل کر اچھی طرح جھونپڑے کی تلاشی لی۔ ایک چوکی کے نیچے سے رسی کے دو دو فٹ کے دو ٹکڑے ملے۔ ان ٹکڑوں کو دیکھ کر مجھے شک ہوا کہ یہ کسی کے ہاتھ پاؤں باندھنے میں استعمال ہوئے ہیں۔ اس دوران حوالدار کی نگاہ جھونپڑے کے دروازے پر پڑی۔ یہ نیم پختہ جھونپڑا تھا اور اس کا دروازہ ٹین اور لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ دروازے میں ایک قفل جھول رہا تھا۔ حوالدار نے میرا دھیان اس قفل کی طرف دلایا۔ میرا شبہ اور مضبوط ہو گیا۔ جھونپڑوں پر شاذونادر ہی قفل وغیرہ لگائے جاتے ہیں۔ ان خانہ بدوشوں کے سب سے بڑے محافظ کتے ہوتے ہیں اور ان کی موجودگی میں وہ ہر فکر سے آزاد ہو کر سوتے ہیں۔ اس جھونپڑے پر قفل کی موجودگی سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں کوئی نہایت اہم شے رکھی گئی تھی۔

یہ شے......ایک مغویہ لڑکی بھی ہو سکتی تھی......میں نے حوالدار سے کہا کہ وہ کانسٹیبلوں کو چوکنا کر دے۔ کوئی شخص ڈیرے سے باہر نہ جانے پائے۔ حوالدار باہر چلا گیا تو میں نے مزید اس کی مدد سے جھونپڑے کا جائزہ لینا شروع کیا۔ دفعتاً میری نگاہ ایک کونے میں گئی۔ یہاں

فرش کی مٹی کچھ اکھڑی اکھڑی نظر آتی تھی۔ میں نے ٹارچ کی روشنی میں بغور دیکھا۔ یہاں کوئی چیز دبائی گئی تھی۔ ان خانہ بدوشوں کی عادتوں سے اب مجھے کافی واقفیت ہو چکی تھی۔ چھاپہ مار پارٹی کو دیکھ کر یہ لوگ ناجائز ریوالور، چاقو، افیون وغیرہ اسی طرح جھونپڑے کے کچے فرش میں دبا دیتے تھے۔ میں نے نیچے بیٹھ کر یہ تازہ مٹی ہٹائی تو ریوالور یا چاقو کی بجائے ایک مڑا تڑا لفافہ نکل آیا۔ میں نے مٹی جھاڑ کر لفافے کو ٹارچ کی روشنی میں دیکھا، اس پر لاہور کا پتہ لکھا تھا اور کوئی دو ماہ پہلے کی مہر لگی ہوئی تھی۔ لفافہ کھولا تو اندر سے کاپی سائز کے دو ورق برآمد ہوئے۔ قلم یا ہولڈر سے ورق کے دونوں طرف لکھا گیا تھا۔ لکھنے والے کا نام دیوندر پروانہ تھا۔ اس نے لاہور میں رہنے والی اپنی ایک محبوبہ ونملا کے نام ایک بڑا دردبھرا عشقیہ خط لکھا تھا (ونملا کا اصل نام کچھ اور تھا، یہاں میں فرضی نام لکھ رہا ہوں) دیوندر پروانہ نامی اس عاشق نے اپنی محبوبہ دلنواز کو بڑے بڑے شاندار خطاب دیے تھے۔ میری زندگی، میری جانِ جگر، میرے سپنوں کی شہزادی، میری روح کی مالک......اس نے اپنے خط میں بڑی تفصیل سے اپنے بےقرار شب و روز کی کہانی سنائی تھی اور خون کے آنسو بہا بہا کر محبوبہ سے ایک نگاہِ کرم کی التجا کی تھی۔ بہت زبردست قسم کا عاشق لگتا تھا وہ۔ اس کا خط پڑھ کر بےاختیار مجھے ہنسی آنے لگی۔ بڑی ڈھیٹ اور ذلیل طبیعت پائی تھی کم بخت نے۔ ایک جگہ لکھا تھا، پیاری! میں تیرے چرنوں میں کتا بن کر لوٹنا چاہتا ہوں۔ کاش تیرے قدموں کی خاک مجھے مل جائے اور میں اس کا سرمہ بنا کر آنکھوں میں ڈال لوں۔ پھر ایک جگہ اعلان کیا تھا۔ قسم ہے بھگوان کی، تُو ایک بار اپنی زبان سے کہہ میں اپنے ہاتھ سے اپنے سینے میں چاقو نہ گھونپ لوں تو انسان کا بچہ ہی نہیں۔ آخر میں اپنے خون سے ایک شعر لکھا ہوا تھا، جس کا سلیس مطلب یہ تھا۔ میں جانتا ہوں تُو میرے نصیب میں نہیں لیکن موت تو میرے اختیار میں ہے۔ بھگوان کی کرپا سے میں بہت جلد اس اختیار کو استعمال کروں گا اور سورگ باسی ہو کر اپنا نام مجنوں، رانجھے اور پنوں وغیرہ کے ساتھ درج کرا جاؤں گا۔

میں نے خط پڑھ کر جیب میں رکھ لیا۔ اس دوران حوالدار دو اور جھونپڑوں کی تلاشی بھی لے چکا تھا۔ میں نے دلاور اور ڈیرے کے سرکردہ چنگڑوں کو ایک جگہ اکٹھا کیا۔ پھر ان کے سامنے ایک مختصر سی تقریر کی۔ ایسی تقریر مجھے ہر جرم کے موقع پر ان خانہ بدوشوں کے سامنے کرنا پڑتی تھی۔ اس تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ وہ بندے کے پتر بن کر اور شرافت کا دامن تھام کر جرم کا اقرار کر لیں اور مجرم کو میرے حوالے کر دیں۔ ورنہ تھانے میں سب کی چھترول ہو گی اور انہیں کئی ماہ تک حاضریاں بھرنا پڑیں گی۔ توقع کے مطابق میری اس تقریر کا چنگڑوں پر کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ میرے تمام سوالوں کے جواب میں انہوں نے صرف ایک ہی بات کہی کہ

انہیں لڑکی کا کچھ پتہ نہیں اور نہ ہی یہاں کوئی لڑکی آئی ہے۔ صرف ایک مہمان آیا تھا شکر گڑھ سے جو کل دوپہر اللہ بیلی ہو گیا...... یہ بڑے پکے پیٹھے لوگ تھے۔ قانون کو دھوکا دینے کے سارے گُر جانتے تھے۔ باقی رہی مار پیٹ تو یہ ان کے لیے حلوہ پوری تھی۔ جب چاہو کھلا دو اور جتنی چاہے کھلا دو۔ مجھے ان سے نبٹتے ہوئے پورے دو سال ہو چکے تھے۔ میں جانتا تھا ان تلوں سے تیل نکالنے کے لیے کافی محنت کرنا پڑے گی۔ دوسرے لفظوں میں اپنا تیل بھی نکالنا ہوگا۔ حوالدار سے مشورہ کرنے کے بعد میں نے ان میں سے چار بندے گرفتار کیے۔ انہیں ہتھکڑیاں لگا کر گدھا گاڑی پر لادا...... اور ساتھ لے کر تھانے روانہ ہو گیا۔

☆======☆======☆

میں تھانے میں بیٹھا تھا اور خط کے بارے سوچ سوچ کر حیران ہو رہا تھا۔ یہ خط اس قصبے کے ایک شخص نے لکھا تھا اور لاہور کی کسی ایسی لڑکی کے لیے لکھا تھا جو چھاؤنی جیسے کھاتے پیتے رہائشی علاقے میں رہتی تھی۔ اب یہ خط چنگڑوں کے ڈیرے پر پایا گیا تھا جس جھونپڑے سے یہ خط ملا تھا وہ میری نظر میں مشکوک تھا۔ عین ممکن تھا کہ اغوا ہونے والی لڑکی کو اُسی جھونپڑے میں رکھا گیا ہو...... کیا اس خط اور اغوا ہونے والی لڑکی میں کوئی تعلق ہے؟ یہ سوال بار بار ذہن میں کسی ٹیس کی طرح ابھر رہا تھا۔ گاہے گاہے ایک فیشن ایبل جوتی بھی تصور میں آ جاتی تھی۔ یہ جوتی اس سارے معاملے میں کہاں سے آ ٹپکی تھی۔ کیا اس جوتی اور لاہور کی فیشن ایبل لڑکی میں کوئی تعلق تھا؟ ان تمام سوالات سے چھٹکارا پانے کا ایک ہی راستہ تھا۔ میں جلد سے جلد "مستری احاطے" کی گلی میں پہنچوں اور وہاں دیوندر نامی اس عاشق کی گردن دبوچ لوں جس نے یہ خط تحریر کیا ہے۔

جونہی قصبے کے مرغوں نے اذانیں بلند کیں اور رات کے اندھیرے میں روشنی کی جاگ لگی۔ میں نے سپاہی بدر دین کو اس کے گھر سے بلا لیا۔ سپاہی بدر دین مستری احاطے ہی میں رہتا تھا۔ یقیناً اسے دیوندر وغیرہ کے بارے میں معلوم تھا۔ بدر دین کوئی آدھ گھنٹے کے بعد وردی کے بٹن بند کرتا اندر داخل ہوا اور کھٹاک سے سیلوٹ کر کے اسٹول پر بیٹھ گیا۔

"جی صاحب!" وہ فرمانبرداری سے بولا۔

میں نے پوچھا۔ "یہ دیوندر پروانہ صاحب کون ہیں بھئی؟"

دیوندر پروانہ کا نام سن کر بدر دین پہلے حیران ہوا پھر اس کے ہونٹوں پر مدھم مسکراہٹ کھل گئی کہنے لگا۔ "یہ صبح سویرے جناب آپ نے کس بندے کا نام لے لیا ہے۔"

"کیوں ایسی کیا خاص بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ مسکراہٹ دبا کر بولا۔ "اس میں ایک نہیں کئی خاص باتیں ہیں جی! ہڈحرامی میں نمبر ایک، بیوقوفی میں نمبر ایک اور گپ بازی میں چیمپئن، کچھ تھوڑا سا دماغ ہلا ہوا ہے جی اس کا۔ داتا نگری کی ایک مشہور ایکٹرس ہے "ونمالا" اُس کا بڑا زبردست عاشق ہے۔ کئی پھیرے لگا چکا ہے لاہور کے۔ اللہ معافی دے جی! پتہ نہیں کس کی بددعا لگی ہوئی ہے۔ سائیکل پر جاتا تھا اور سائیکل پر آتا تھا۔ اس کے تو ٹَکّے فیل ہو جاتے تھے سائیکل چلا چلا کر وہ تو مولا نے کرم کیا ایک دن لاہور میں ریجنٹ سینما کے سامنے سے کوئی اس کی سائیکل اٹھا کر لے گیا۔" بدر دین منہ دبا کر ہنسنے لگا۔ میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"مجھے پوری بات بتاؤ یہ ونمالا ہے کون؟ کبھی دیکھا ہے تم نے اسے؟"

بدر دین بولا۔ "بس میں نے ٹاکیوں (فلموں) میں دیکھا ہے اور ٹاکی والیاں آپ کو پتہ ہی ہے بڑی شے ہوتی ہیں۔ سیدھی دل پر لگتی ہیں جا کے۔ بس لگ گئی دیوندر کے دل پر۔ پہلے تو اسے خط لکھتا رہا، پھر ایک دو چکر خود لاہور کے لگا کر آیا۔ کہتا تھا میری اس سے ملاقات ہو گئی ہے۔ عنقریب میں کریانے کی دکان بیچ کر لاہور چلا جاؤں گا اور ونمالا کی گاڑی چلایا کروں گا۔ دکان تو سچ مچ بک گئی لیکن وہ ونمالا کا ڈرائیور نہ بن سکا۔ دو تین مہینے لاہور میں ھکے کھا کر واپس آ گیا۔ آج کل پھر دکان میں نئے سرے سے مال ڈال رہا ہے۔ بڑا پکا عاشق ہے جی ونمالا کا۔ آپ اس کی دکان پر جا کر دیکھیں، کوئی ایک سو تصویریں تو لگی ہوں گی ونمالا کی۔ اور تو اور کم بخت نے سینے پر بھی "ونمالا...... ونمالا" لکھوایا ہوا ہے۔ پورا سینہ بھرا ہوا ہے۔ کہتا ہے ایک دن لاہور مال روڈ پر میں قمیض اتار کر ونمالا کی گاڑی کے سامنے لیٹ گیا تھا۔ ساری ٹریفک جام ہو گئی تھی اور سخت گرمی میں ٹریفک کھولتے کھولتے ایک کانسٹیبل بے ہوش ہو گیا تھا۔ پتہ نہیں کیا کیا بکتا رہتا ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا واقعی وہ لیٹ گیا تھا گاڑی کے آگے؟"

"نہیں جی...... مجھے بتایا ہے اس کے دوست رلّی نے، کہتا ہے اس نے گاڑی کے سامنے لیٹنے کی کوشش کی تھی لیکن اس وقت گاڑی میں ونمالا تھی ہی نہیں۔ اس کا باپ تھا اور دو تین مشٹنڈے بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ باہر نکلے اور انہوں نے ایک کانسٹیبل کے ساتھ مل کر پروانے کی خوب دھنائی کی۔"

"اور بے ہوش کون ہوا تھا؟"

"وہ خود ہوا تھا، اور کس نے ہونا تھا؟" بدر دین پھر ہنسنے لگا۔

میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "اب کہاں ہے دیوندر؟"

''نہیں ہے جی؟'' بدر دین نے کہا۔ ''آج کل اس کے بارے ایک نئی بات نکلی ہوئی ہے۔''

''وہ کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''اس نے کہیں اپنے دوست رلمی سے کہا ہے کہ ایکٹرس ونمالا خود اس سے ملنے اس کی دکان میں آئی تھی اور ساری رات اس کے ساتھ رہی ہے۔ دماغ چل گیا ہے کھوتے کا افیون کھا کر لیٹا ہوگا۔ کہیں جاگتے میں خواب دیکھ لیا ہے۔''

میرے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ یہ بات جتنی بچگانہ اور ناقابل اعتبار نظر آ رہی تھی اتنی تھی نہیں۔ میرے دل نے پکار کر گواہی دی کہ چند روز پہلے اس قصبے میں کوئی انہونی ہو چکی ہے۔ کوئی ایسا واقعہ ہوا ہے جو بے حد افسانوی ہونے کے باوجود عین حقیقت ہے...... بالکل حقیقت۔ میں نے اپنے دلی جذبات چھپانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''دیوندر نے یہ بات کب کہی تھی؟''

''میں نے تو کل ہی سنی ہے جی! اس نے پتہ نہیں کب کی تھی؟''

میں نے سگریٹ کا ایک گہرا کش لیتے ہوئے کہا۔ ''بدر دین! حوالدار کے ساتھ اسی وقت جاؤ اور دیوندر کو یہاں تھانے لے آؤ۔'' پھر میں نے کرم دین کو آواز دی اور اسے بدر کے ساتھ روانہ کر دیا...... میرے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ جس بات کو بدر دین نے سراسر مذاق سمجھا تھا اور قصبے کے لوگ بھی کوئی اہمیت نہیں دے رہے تھے وہ بات...... مذاق نہیں تھی۔ کوئی بڑی گہری بات تھی یہ...... دیوندر قریباً آدھ گھنٹے بعد تھانے میں حاضر ہو گیا۔ میری توقع کے برعکس وہ معمولی شکل وصورت کا ایک سانولا سا نوجوان تھا۔ عمر پچیس سال سے کم نہیں رہی ہوگی۔ پیشانی سے بال اڑے ہوئے تھے۔ جسم بھی اونٹ کی طرح بے ڈھنگا سا تھا۔ میں نے علیحدگی میں اس سے پوچھ گچھ شروع کی۔ وہ اطمینان سے میرے سوالوں کے جواب دینے لگا۔

میں نے پوچھا۔ ''تمہارا پورا نام؟''

''دیوندر پال...... جناب!'' اس نے انکساری سے کہا۔ ''مستری احاطے میں کریانے کی دکان کرتا ہوں۔''

''کتنا پڑھے ہوئے ہو؟''

''جی مڈل کر کے سکول سے اٹھ گیا تھا لیکن پڑھائی کا شوق تھا۔ دکان پر بیٹھ کر ہی میٹرک کیا ہے میں نے۔''

''کچھ شعر وشاعری بھی کرتے ہو؟''

''شاعر تو بڑے لوگ ہوتے ہیں جی! میں تو بس الٹے سیدھے لفظ جوڑتا ہوں۔ خود مجھے بھی پسند نہیں آتے۔ اکثر لکھ کر پھاڑ دیتا ہوں۔''

''یہ ونمالا کا کیا چکر ہے؟'' میں نے اچانک پوچھا۔

اس کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا لیکن گھبراہٹ طاری نہیں ہوئی۔ شاید اسے پہلے سے اندازہ ہو گیا تھا کہ میں ونمالا کے بارے میں سوال کروں گا۔ پہلے تو اس نے انجان بننے کی کوشش کی لیکن جب میں نے اسے اکسایا اور یہ بھی ظاہر کر دیا کہ میں یہ سب کچھ اپنی دلچسپی کے لیے جاننا چاہتا ہوں تو اس کی جھجک دور ہو گئی۔ اس نے اقرار کیا کہ وہ ونمالا کے عشق میں گرفتار رہا ہے اور پھر یہ دھماکہ خیز انکشاف بھی کر دیا کہ ونمالا چند روز پہلے اس سے دکان میں ملنے آئی تھی اور رات بھر اس کے ساتھ رہی تھی۔ یہ واقعہ جتنا دلچسپ تھا اتنا ہی حیران کن بھی تھا۔ اگر میرے پاس پہلے سے کچھ ثبوت نہ ہوتے تو شاید میں دیوندر کے بیان کو دیوانے کی بڑ قرار دیتا اور کسی صورت اس فلمی سین پر یقین نہ کرتا۔ دیوندر نے اپنے انداز میں جو کچھ بتایا اس کا مفہوم کچھ یوں ہے۔

یہ پچھلے بدھ کی بات ہے۔ دیوندر اپنی دکان کا دروازہ اندر سے بند کیے سو رہا تھا۔ سودا سلف کے درمیان ہی تھوڑی سی جگہ بنا کر اس نے چارپائی بچھا رکھی تھی۔ سردی کا زور توڑنے کے لیے ایک چھوٹی سی انگیٹھی بھی چارپائی کے نیچے رکھی ہوئی تھی۔ رات کوئی دس بجے کا وقت تھا جب دروازے پر مدھم دستک سنائی دی۔ دیوندر نے اندر سے پوچھا کون ہے۔ باہر سے بڑی میٹھی نسوانی آواز آئی کہ میں ہوں دروازہ کھولو۔ دیوندر نے جلدی سے لالٹین کی لو اونچی کی اور کانپتے ہاتھوں سے دروازہ کھول دیا۔ سامنے اس کے سپنوں کی رانی کھڑی تھی...... ونمالا...... اس نے وہی لباس پہن رکھا تھا جو اس نے اپنی پہلی فلم میں پہنا تھا۔ اس فلم میں ونمالا کا کردار ایک خانہ بدوش لڑکی کا تھا جسے ایک چوہدری چوری کے جھوٹے الزام میں پکڑ کر اپنی حویلی میں بند کر لیتا ہے لیکن وہ ہوشیاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے نہ صرف خود وہاں سے بھاگ نکلتی ہے بلکہ چوہدری کی بہن کو بھی بھائی کی جبس بے جا سے نکال لاتی ہے۔ یہی فلم تھی جو تیر کی طرح دیوندر کے دل پر لگی تھی اور وہ لاہور امرتسر وغیرہ جا کر کئی مرتبہ یہ فلم دیکھ چکا تھا۔ ونمالا کو اپنے محبوب ترین روپ میں سامنے دیکھ کر ''دیوندر صاحب'' نے یہی سمجھا کہ وہ ابھی تک نیند کے جھولے میں بیٹھے عشق کی لوریاں سن رہے ہیں...... یعنی یہ حقیقت نہیں کوئی سہانا خواب ہے۔ یہ سب کچھ اس کے تصور میں بھی نہیں آ سکتا تھا۔ کہاں لاکھوں دلوں کی دھڑکن ایک فلمی ایکٹرس...... بنگلوں میں رہنے والی اور کاروں میں گھومنے والی اور کہاں جالندھر کے اس پسماندہ قصبے میں نمک تیل بیچنے والا

نامراد عاشق جس میں عقل تھی اور نہ شکل، جو ونمالا کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے پہروں سٹوڈیو کے دروازے پر کھڑا رہتا تھا اور چوکیداروں کے دھکے کھاتا تھا۔ اس نے ونمالا کو سینکڑوں ہی خط لکھے تھے ان میں سے کسی ایک خط کا جواب بھی نہیں آیا تھا...... اور آج آیا تھا تو ایسے کہ اس کی آنکھیں پھٹی رہ گئی تھیں۔ جواب دینے والی خود اس کے سامنے آن حاضر ہوئی تھی اور ایسی چکا چوند کے ساتھ کہ وہ کوشش کے باوجود آنکھیں کھول نہیں پا رہا تھا۔ دیوندر کے مطابق وہ رات...... یعنی اس رات کے چند گھنٹے اس کی زندگی کے بہترین لمحات تھے اور وہ لمحات گزارنے کے بعد اب اسے دنیا میں کسی اور شے کی حسرت ہی نہیں رہ گئی۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ وہ جیون بھر کے لیے سیراب ہو گیا ہے...... اور اب کھڑے کھڑے موت آ جائے تو بڑی مبارک بات ہے......

ونمالا صبح قریباً چار بجے اس کے پاس سے گئی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ ایک سہیلی اسے لینے کے لیے آئی ہوئی ہے اور گاڑی میں بیٹھی اس کا انتظار کر رہی ہے۔ وہ چلی گئی تھی اور دیوندر حسن کے جادو میں جکڑا ہوا، حیرتوں کے نشے میں مدہوش دوپہر تک بے خبر پڑا رہا تھا۔ پھر جاگا تھا اور کسی کو بتائے بغیر سیدھا امرتسر پہنچ گیا تھا۔ یہاں ایک مندر پر اس نے منت مانی ہوئی تھی کہ اگر اس کی دلی مراد پوری ہوئی تو وہ ایک ماہ تک ہر شوکروار کو پچاس روپے کا پرشاد چڑھائے گا۔ پرشاد چڑھانے کے بعد وہ آٹھ پہر مندر کے احاطے میں ہی پڑا رہا تھا اور پھر ہکا بکا سا قصبے میں واپس آ گیا تھا...... اس کی واپسی کل رات گئے ہوئی تھی۔

دیوندر کی پوری روئیداد سننے کے بعد میں نے پوچھا۔ ''تمہارا اپنا خیال کیا ہے تمہارے پاس آنے والی لڑکی ونمالا ہی تھی اور اگر ونمالا تھی تو کیوں آئی تھی تمہارے پاس......''

دیوندر نے کہا۔ ''وہ ونمالا ہی تھی حضور! مجھے اتنا ہی یقین ہے جتنا یہ کہ آپ ہمارے افسر اور حاکم ہیں اور آپ کا شبھ نام نواز خاں ہے...... جہاں تک دوسرے سوال کی بات ہے...... میں تو جی اسے چمتکار (کرشمہ) ہی کہہ سکتا ہوں۔ کہاں میں اور کہاں وہ ونمالا دیوی۔ مجھ جیسے سینکڑوں ہزاروں اس کے قدموں کے نیچے دل رکھتے ہیں اس کے روگ میں آہیں بھرتے رہتے ہیں اور رو پیٹ کر چپ ہو رہتے ہیں۔ میرا انجام اس سے علیحدہ بھلا کیا ہونا تھا۔ میری تو خود بدھی میں نہیں آتا کہ یہ سب کیسے ہوا اور کس کارن ہوا۔''

میں نے اس کالے کلوٹے خوش نصیب عاشق کو دیکھا...... بدھ کی رات جس کی پانچوں گھی میں اور سر کڑاہی میں چلا گیا تھا اللہ کی قدرت کو یاد کرنے کے علاوہ میں اور کیا کر سکتا تھا۔ قریب ہی لکڑی کی الماری رکھی تھی۔ میں نے الماری کھول کر اس میں سے فیشن ایبل جوتی نکال لی۔

''اس جوتی کو پہچانتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

دیوندر کے چہرے پر دو تین رنگ نمودار ہوئے۔ وہ کچھ دیر غور سے دیکھتا رہا۔ جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر بولا۔ ''یہ آپ کو کہاں سے ملی؟''

میں نے کہا۔ ''اس کو چھوڑو۔ میرے سوال کا جواب دو۔''

وہ بولا۔ ''جناب...... مم...... میرا خیال ہے یہ جوتی...... ونمالا دیوی کے پاؤں میں تھی۔''

میں نے الماری کی دراز سے جھمکا نکالا۔ ''اسے بھی پہچانتے ہو۔''

جھمکا دیکھ کر دیوندر کی آنکھوں میں بے اختیار چمک سی آ گئی۔ وہ جیسے تصور میں ان خوابناک گھڑیوں کو یاد کر رہا تھا جب اوپر والے نے چھپّر پھاڑ کر اس پر حسن اور جوانی کی بارش کر دی تھی۔ ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا۔ ''جج...... جی ہاں...... یہ جھمکا بھی ونمالا دیوی کا ہے...... میں اچھی طرح پہچانتا ہوں۔''

میں نے جیب سے خط نکال کر اس کے سامنے رکھا۔ ''کیا اس محبت نامے کو بھی پہچانتے ہو؟''

وہ اسے بھی فوراً پہچان گیا۔ اب بات بہت حد تک واضح ہو چکی تھی۔ بدھ کے روز اس قصبے میں ایک حیران کن واقعہ رونما ہوا تھا۔ فلمی دنیا کی ایک مشہور فنکارہ دل لگی کے لیے یا کسی اور سبب سے خانہ بدوش عورت کے بھیس میں یہاں پہنچی تھی اور اس نے کریانہ فروش دیوندر پال کی دکان میں چند گھنٹے گزارے تھے...... بعد کے واقعات کا مجھے ابھی ٹھیک طرح علم نہیں تھا۔ تاہم کڑیوں سے کڑیاں جڑ رہی تھیں اور ایک دھندلی سی تصویر سامنے آ رہی تھی۔ ونمالا نے جو کام کھیل سمجھ کر کیا تھا وہ اس کے لیے مصیبت بن گیا تھا۔ وہ یہاں ایک سانسی خانہ بدوش کے روپ میں پہنچی تھی۔ اس نے جو لباس پہن رکھا تھا وہ صرف سانسی عورتیں ہی پہنتی ہیں۔ ونمالا کو معلوم نہیں تھا کہ وہ جس قصبے میں سانسی بن کر آئی ہے وہاں چنگڑ ہرل ہرل کرتے پھرتے ہیں اور سانسیوں کی چنگڑوں سے گہری دشمنی ہے۔ موقعہ کی زمینی شہادتوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ اغوا ہونے سے پہلے ونمالا کافی دیر مستری احاطے کے آس پاس گھومتی رہی ہے۔ شاید وہ اس گاڑی کے انتظار میں تھی جو اسے لینے کے لیے آ رہی تھی۔ اس دوران وہ چنگڑ گھڑ سواروں کی نظر میں آ گئی اور وہ اسے اٹھا کر اپنے ڈیرے پر لے گئے۔

میں نے دیوندر سے پوچھا۔ ''کیا تمہیں معلوم ہے کہ ونمالا اغوا ہو گئی ہے؟''

دیوندر کے سر پر جیسے بم پھٹ گیا۔ وہ آنکھیں پھاڑ کر میری طرف دیکھنے لگا۔ ''کیا کہہ رہے ہیں آپ؟''

''میں کوئی فارسی نہیں بول رہا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''ونمالا کو اغوا کر لیا گیا ہے اور اس سلسلے میں تم بھی مشتبہ ٹھہر سکتے ہو۔''

وہ لرز کر بولا۔ ”جناب...... حضور مجھ پر تو رحم فرمائیں، میں نے بتایا ہے میں تو پرسوں سے امرتسر میں تھا۔ کل رات گئے واپس آیا ہوں، ابھی قصبے میں کسی سے بات بھی نہیں ہوئی تھی میری۔“

میں نے دیوندر کو تھوڑا سا ڈرایا دھمکایا، یہاں تک کہ وہ میرے ڈھب پر آ گیا۔ وہ ونمالا کا دیوانہ عاشق تھا اور ونمالا کے بارے شاید اس کی ماں سے بھی زیادہ جانتا تھا۔ وہ کہاں رہتی ہے کیا کرتی ہے، کیا کھاتی پیتی ہے۔ اس کے رشتے داروں میں سے کون زندہ ہے؟ کون مر گیا ہے اور کون مرنے والا ہے، دیوندر کو سب معلوم تھا...... میں نے اس سے اپنے کام کی باتیں معلوم کر لیں۔ ان باتوں سے پتہ چلا کہ ونمالا اب تک آٹھ دس پنجابی اردو فلموں میں کام کر چکی ہے اور کافی مشہور ہو رہی ہے۔ اس کا باپ ہر وقت اس کے ساتھ رہتا ہے۔ بڑا کھڑ کے دھڑ کے والا آدمی ہے، لیکن بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ وہ ونمالا کا سگا باپ نہیں وہ اس کا کوئی دور کا رشتے دار ہے لیکن ونمالا اسے باپ ہی کہتی ہے۔ ونمالا صرف فلموں میں اداکاری کرتی ہے، باقی سارے معاملات وہی سنبھالتا ہے۔ میں نے دیوندر سے مختلف ایڈریس وغیرہ بھی معلوم کر لیے پھر اسے ہر طرح رازداری کا پابند کر کے واپس جانے کی اجازت دے دی۔ وہ اب کافی ڈرا ہوا تھا۔ اجازت ملتے ہی ایسے بھاگا جیسے ابھی میں اسے ونمالا کے اغوا میں پھانسی پر لٹکا دوں گا۔

☆======☆======☆

اگلے روز میں نے اپنے سب انسپکٹر فرزند علی کو تمام ضروری باتیں سمجھا کر لاہور بھیج دیا۔ میں نے اسے ہدایت کی تھی کہ وہ مقامی تھانیدار سے ملے اور نہایت رازداری کے ساتھ اس معاملے کی ٹوہ لگائے...... یاد رہے کہ اس سے پہلے میں پچھلے چار پانچ روز کے تمام اخبارات دیکھ چکا تھا۔ کہیں بھی ونمالا کے اغوا یا گمشدگی کی خبر موجود نہیں تھی۔ یہ خاصی حیرانی کی بات تھی شاید ونمالا کے وارث جان بوجھ کر یہ خبر چھپا رہے تھے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ ویسے ہی اس واقعہ سے لاعلم ہوں۔

میرا سب انسپکٹر تیسرے روز واپس آیا۔ اس نے وہی کچھ بتایا جو اخبارات سے ظاہر ہو رہا تھا۔ ونمالا کے اغوا یا گمشدگی کی کوئی اطلاع نہیں تھی۔ سب انسپکٹر کی ملاقات ونمالا کے باپ سے بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ صرف اتنا پتہ چلا کہ ونمالا لاہور میں نہیں ہے شاید نتھیا گلی یا ڈلہوزی میں برف باری دیکھنے گئی ہوئی ہے۔ ونمالا کا باپ رگوناتھ بھی اب اس کے پیچھے چلا گیا ہے۔ سب انسپکٹر نے عقلمندی سے کام لیتے ہوئے دو ایسے افراد سے بھی ملاقات کر لی تھی جو اشوکا تھیٹر میں ڈرامے وغیرہ سٹیج کرتے تھے۔ ونمالا ان کے ایک ڈرامے میں بھی کام کر رہی تھی۔ یہ دونوں افراد جو سگے بھائی تھے سخت سٹپٹائے ہوئے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ونمالا ایک نہایت

غیر ذمہ دار اداکارہ ہے۔ شہرت کے سبب دن بہ دن اس کا دماغ خراب ہو رہا ہے۔ وہ انہیں بتائے بغیر ڈرامہ چھوڑ کر چلی گئی ہے۔

لاہور میں حالات کا اشارہ بہت واضح تھا۔ واقعات کی زنجیر میں ایک اور کڑی بالکل درست بیٹھ رہی تھی...... فلمی اداکارہ ونمالا ایک عجیب کھیل کھیلتے ہوئے خطرناک صورتِ حال میں پھنس چکی تھی۔

اب یہ بہت ضروری تھا کہ گرفتار شدہ چنگڑوں کی زبان کھلوائی جائے جیسے بھی ہو انہیں یہ بتانے پر مجبور کیا جائے کہ ونمالا اس وقت کہاں ہے۔ جیسے کہ میں بتا چکا ہوں یہ بڑی موٹی چمڑی کے لوگ تھے۔ مار تو ان کے لیے حلوہ پوری تھی۔ میں نے قریبی چوکی سے ایک سپیشل ”باورچی“ بلوایا۔ اس ”باورچی“ کو ہم چھترول ماسٹر کہتے تھے۔ ”حلوہ پوری“ میں ایسے مصالحے ڈالتا تھا کہ وہ حلق سے اترنی مشکل ہو جاتی تھی لیکن ابھی اس باورچی نے لاک اپ میں پہنچ کر پٹاخ پٹاخ ”پوریاں“ لگانا شروع ہی کی تھیں کہ مجھے اس کا ہاتھ روکنا پڑا۔ دراصل ایک اہم اطلاع آ گئی تھی۔ میرے گھریلو ملازم نے تھانے میں آ کر بتایا کہ بلال شاہ گھر آیا بیٹھا ہے اور میرا انتظار کر رہا ہے۔

میں گرفتار شدہ چنگڑوں کی مار پٹائی رکوا کر گھر پہنچا تو بلال شاہ کو منتظر پایا وہ شیر کی طرح بے چینی سے کمرے میں ٹہل رہا تھا ظاہر تھا کوئی اہم اطلاع ہے جو اسے بیٹھنے بھی نہیں دے رہی۔ بغیر کسی تمہید کے ہم اصل موضوع پر آ گئے۔ بلال شاہ نے سنسنی خیز لہجے میں کہا۔

”خان صاحب! رات ستر ام جاہ نے ایک لڑکی ”چراغاں“ چنگڑوں کے حوالے کی ہے۔ چراغاں کو ستر ام کا چھوٹا بھائی ہیرا کہیں سے اٹھا کر لایا تھا اور اسے اپنے گھر میں ڈالا ہوا تھا۔ مجھے رات ہی معلوم ہوا ہے کہ چراغاں دراصل چنگڑی تھی اور اسے ہیرے نے زبردستی اپنے پاس رکھا ہوا تھا۔“

میں نے کہا۔ ”تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ کیا اس معاملے کا تعلق جوتی جھمکے والے چکر سے ہے؟“

بلال شاہ بولا۔ ”میں کچھ کہہ نہیں سکتا جی! لیکن اس روز بند جھونپڑے میں ستر ام اور چنگڑوں کے بندے میں جو بات ہوئی تھی اس میں چنگڑ نے کہا تھا کہ ایک ہاتھ لو، دوسرے ہاتھ دو۔ کوئی جھگڑا نہ کوئی رولا...... ہو سکتا ہے سانسیوں نے چراغاں دے کر ان سے وہ لڑکی واپس لے لی ہو جسے چنگڑوں نے مستری احاطے سے اٹھایا ہے۔“

میرے ذہن میں کھلبلی سی مچ گئی۔ اگر واقعی ایسا ہوا تھا تو یہ معاملہ اور بھی سنگین ہو گیا تھا۔

ونمالا سانسی نہیں تھی اور یہ بات سانسی بھی اچھی طرح جان گئے ہوں گے۔ اس کے باوجود وہ خاموش رہے تھے اور چنگڑوں کی بے خبری سے فائدہ اٹھا کر اسے چنگڑوں سے حاصل کر لیا تھا۔ بدلے میں چنگڑوں کو ایک لٹی پٹی عورت دے دی گئی تھی۔ بڑی گہری چال تھی یہ۔

میں نے بلال شاہ سے پوچھا۔ ''ہیرے نے چراغاں سے بیاہ کر رکھا تھا؟''

''نہیں جی!'' وہ اعتماد سے بولا۔ ''ویسے ہی رہ رہا تھا اس کے ساتھ۔ ایسے معاملہ میں کوئی شرم حیا نہیں کرتے یہ روہی نالے والے۔ عورت کو ڈھور ڈنگر سمجھتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''اس بات کا تو مجھے بھی پتہ ہے لیکن کیا چراغاں کے وارث اسے دوبارہ قبول کر لیں گے خوشی سے؟''

''کیوں نہیں کریں گے جناب! جیسے کوئی اپنی گمشدہ بھینس واپس لے لیتا ہے ایسے یہ لوگ عورت بھی لے لیتے ہیں۔ بھینس والا یہ نہیں سوچتا کہ کوئی اس کا دودھ پیتا رہا ہے۔ اس طرح یہ روہی والے بھی نہیں سوچتے کہ کوئی مرد اس عورت کے ساتھ سوتا رہا ہے...... بس ان لوگوں کا رہن سہن ہی ایسا ہے۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ چراغاں کے بدلے میں جو عورت سانسیوں کو ملے گی وہ پاک صاف ہی واپس آ گئی ہو گی۔ بالکل نہیں جناب......''

بلال شاہ کی باتوں کو رد کرنا بہت مشکل تھا۔ وہ روہی نالے کے خانہ بدوشوں کو بہت اچھی طرح جانتا تھا...... میں نے کہا۔ ''بلال شاہ! ایک بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے اس معاملے میں۔ یہ معاملہ اب اتنا سیدھا نہیں رہا جتنا تم سمجھ رہے ہو۔''

''کیا مطلب؟'' بلال شاہ نے آنکھیں میری آنکھوں میں گاڑیں۔

میں نے کہا۔ ''اگر تمہاری اطلاع درست ہے یعنی سانسیوں نے چراغاں کے بدلے میں ''بدھ کو اغوا ہونے والی لڑکی'' چنگڑوں سے لی ہے تو پھر وہ زبردست دھوکا دے گئے ہیں۔''

''میں اب بھی کچھ نہیں سمجھا۔'' بلال شاہ بولا۔

''بات یہ ہے پیارے! کہ سانسیوں کی کوئی لڑکی سرے سے اغوا ہی نہیں ہوئی۔''

''تو پھر وہ جھمکے والی کون تھی؟''

''وہ ایک معمولی خانہ بدوش نہیں...... فلموں اور ڈراموں کی بہت بڑی اداکارہ ہے۔ مجھے تو یہ چنگڑ اندھے نظر آتے ہیں۔ یہ بھی نہ جان سکے کہ جسے اٹھا کر لائے ہیں وہ خانہ بدوش ہے یا خانہ بدوش بنی ہوئی ہے۔''

بلال شاہ کے چہرے پر اب حیرت کی بارش ہو رہی تھی۔ غالباً اسے میری بات پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں نے اسے ونمالا کے ساتھ دیوندر کے عشق کی ساری کہانی سنائی...... اور آخر

میں اسے بتایا کہ دیوندر، ونمالا کی جوتی اور اس کا جھمکا پہچان چکا ہے۔ بلال شاہ یہ سب کچھ حیرت میں ڈوب کر سنتا رہا۔ اس نے گاہے گاہے مجھ سے سوالات بھی کیے۔ اس کے چہرے پر الجھن نظر آ رہی تھی۔ بولا۔

''اگر یہ بات مان لی جائے کہ اس رات چنگڑوں نے ونمالا کو سانسی سمجھ کر اغوا کیا تو ونمالا نے ان کی غلط فہمی دور نہ کی ہو گی۔ یقیناً اس نے بتایا ہو گا کہ وہ خانہ بدوش نہیں شہر کی ایک پڑھی لکھی لڑکی ہے اور نہ بھی بتایا ہو گا تو اس کے حلیے اور بات چیت سے ظاہر ہو گیا ہو گا پھر چنگڑوں نے اسے سانسی کیسے سمجھے رکھا اور سانسیوں سے کیسے دھوکا کھا لیا؟''

میں نے کہا۔ ''تمہارا سوال اہم ہے لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ونمالا نے جان بوجھ کر اپنی اصلیت چھپا لی ہو۔''

''وہ کیوں اپنی اصلیت چھپاتی۔ اپنا آپ بتا کر چنگڑوں پر رعب کیوں نہ ڈالتی؟'' بلال شاہ نے کھٹاک سے سوال کیا۔

''ایسا کرنے کی ایک سے زیادہ وجوہ ہو سکتی ہیں......'' میں نے جواب دیا۔ ''بہرحال اب تم فوراً ڈیرے پر واپس جاؤ۔ تمہاری وہاں شدید ضرورت ہے۔ جیسے ہی کوئی نئی اطلاع ملے مجھ سے رابطہ کرو۔''

بلال شاہ اب خود بھی صورتِ حال کی نزاکت کو سمجھ رہا تھا۔ اس نے زیادہ نخرے نہیں دکھائے اور ایک کپ چائے کا پی کر رخصت ہو گیا۔

میں فوراً تھانے پہنچا اور اپنے سب انسپکٹر کو مشورے کے لیے بلا لیا۔ یہ بات میں پہلے سے جانتا تھا کہ سانسی، چنگڑوں سے زیادہ ہوشیار اور خرانٹ ہیں۔ ونمالا والے واقعے سے بھی اس بات کی تصدیق ہوئی تھی۔ انہوں نے معمولی شکل وصورت کی ایک لڑکی دے کر چنگڑوں سے ونمالا جیسی لڑکی حاصل کر لی تھی۔ بلکہ اب تو مجھے ایک اور بھی شک ہو رہا تھا۔ ہو سکتا تھا وہ ونمالا کو پہچان گئے ہوں۔ ایک مشہور ایکٹرس کو قبضے میں کر کے وہ کئی ایک فائدے حاصل کر سکتے تھے۔ سب انسپکٹر فرزند علی نے بھی میرے اس خیال کی تائید کی۔ اس نے کہا۔

''نواز صاحب! میرا خیال ہے کہ سترام جاہ وغیرہ نے ونمالا کو پہچان لیا ہے۔ وہ دیدہ دلیر مجرم ہیں۔ ہو سکتا ہے ونمالا کے وارثوں کو بلیک میل کرنے کا پروگرام بنا لیں، ایسی صورت میں ونمالا ان کے لیے سونے کا انڈہ دینے والی مرغی بن سکتی ہے۔''

اب ہمارے سامنے دو راستے تھے۔ ایک تو یہ کہ براہ راست کارروائی کی جائے۔ سترام اور دلاور دونوں کو پکڑ لیا جائے اور جیسے بھی ہو ان سے لڑکی برآمد کرائی جائے۔ دوسری صورت

یہ تھی کہ خاموشی سے ونمالا کا کھوج لگایا جائے اور چھاپا اس وقت مارا جائے جب پورا یقین ہو جائے کہ مغویہ برآمد ہو جائے گی۔ سب انسپکٹر فرزند علی فوری کارروائی کے حق میں تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ سانسی خطرناک لوگ ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں پہنچ کر مغویہ کسی بھی سخت مشکل میں گرفتار ہو سکتی ہے۔ اس کے برآمد ہونے میں جتنی دیر لگے گی مسئلہ اتنا ہی پیچیدہ ہو جائے گا۔

اگر ونمالا کوئی شریف یا کباڑ لڑکی ہوتی تو میں فرزند علی کی بات ماننے میں ایک لمحے کی دیر بھی نہ کرتا لیکن مجھے معلوم تھا وہ کس قماش کی عورت ہے۔ سانسیوں کے قبضے میں اس کی عزت کو کوئی خطرہ نہیں تھا۔ کیونکہ اس کی کوئی عزت تھی ہی نہیں اپنے جسم کو تو اس نے خود کھلونا بنایا ہوا تھا۔ اب تک وہ نہ جانے کس کس گھاٹ کا پانی پی چکی تھی۔ اسے برآمد کرانا تو میری ذمہ داری تھی لیکن فوری برآمد کرانے کے چکر میں معاملہ بگاڑ لینا عقل مندی نہیں تھی۔ سانسی وہاں بہت بڑی تعداد میں تھے اور ان میں ایک سے ایک بڑھ کر قاتل اور قانون شکن تھا۔ کسی بندے کو مار کر مدعا غائب کر دینا یا اسے آزاد علاقے میں بیچ آنا ان کے لیے کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ وہ اوپر سے جتنے عاجز اور مسکین نظر آتے تھے اندر سے اتنے ہی خونخوار تھے۔ ونمالا کا ان کے قبضے میں چلے جانا ونمالا کے ساتھ ساتھ ہماری بھی بدقسمتی تھی۔ اس ''بدقسمتی'' کا اثر کم کرنے کے لیے ضروری تھا کہ جلد بازی کا مظاہرہ نہ کیا جائے۔

دو روز بعد مجھے ایک پیشی پر لاہور جانا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ خود جا کر ونمالا کے گھر والوں سے ملوں۔ یہ بات عین ممکن تھی کہ سانسی ونمالا کو حاصل کرنے کے بعد اس کے وارثوں سے رابطہ قائم کریں اور ونمالا کے بدلے میں کسی بڑی رقم کا مطالبہ کر دیں۔ لاہور پہنچ کر میں نے پہلے اپنی تاریخ بھگتائی پھر چھاؤنی کے اس علاقے میں پہنچ گیا جہاں ونمالا کی رہائش گاہ تھی۔ میں وہاں سادہ کپڑوں میں پہنچا۔ شام کا وقت تھا۔ خوبصورت گیٹ والی کشادہ کوٹھی کے سامنے ایک گن مین کھڑا تھا۔ میں نے اسے اپنا کارڈ دکھایا اور کہا کہ میں ونمالا کے والدین سے ملنا چاہتا ہوں۔ گن مین نے ایک نوکر کو اندر بھیجا۔ تھوڑی ہی دیر بعد چالیس برس عمر کا ایک شخص اپنی مٹکے جیسی توند ہلاتا ہوا باہر آ گیا۔ اس کی تیز نگاہیں میری آنکھوں میں پیوست تھیں۔

''جی فرماؤ۔'' اس نے خالص لاہوری لہجے میں کہا۔

میں نے ایک بار پھر اپنا تعارف کرایا اور اس سے کہا کہ میں ونمالا کے بارے میں کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ میزبان نے بڑے اطمینان سے میری بات سنی اور مجھے لے کر کوٹھی کے لان میں آ گیا۔ یہاں گھاس پر خوبصورت کرسیاں بچھی تھیں اور میز پر ایک دو فلمی رسالے رکھے تھے۔ میں اندازہ لگا چکا تھا کہ توند والا گورا چٹا شخص ونمالا کا سرپرست رگوناتھ

ہے۔ رگوناتھ نے دو گھوڑا بوسکی کی قمیض کی جیب میں سے ایک قیمتی سگریٹ نکال کر سلگایا اور بولا۔ ''فرماؤ جناب کیا گل کرنی ہے؟'' وہ ایک بہت پُرسکون شخص دکھائی دیتا تھا۔ ایسے لوگوں کے دل کا حال چہرے سے پڑھنا بے حد مشکل ہوتا ہے۔

میں نے کہا۔ ''میں آپ کی بیٹی ونمالا دیوی کے بارے پوچھنا چاہتا ہوں۔ کیا ان سے میری ملاقات ہو سکتی ہے؟''

وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ ''ونمالا اس وقت ایبٹ آباد میں ہے لیکن آپ نے ابھی بتایا ہے کہ آپ جالندھر کے تھانے میں ہیں۔ آپ کا ونمالا سے یا ہم سے کیا تعلق واسطہ ہے؟''

میں نے پہلوان کے تیکھے لہجے کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ سمجھ دار بندے نظر آتے ہیں۔ کوئی تعلق واسطہ ہے اسی لیے پوچھ رہا ہوں ناں......''

''کیسا تعلق واسطہ؟'' پہلوان سنبھل کر بیٹھ گیا۔

میں نے کہا۔ ''کیا آپ مجھ پر بھروسہ کرتے ہوئے یہ بتانا پسند کریں گے کہ ونمالا اس وقت کہاں ہے؟''

اس نے بھرپور اعتماد سے میری آنکھوں میں دیکھا اور بولا۔ ''وہ ایبٹ آباد کے قریب ایک پہاڑی مقام پر ہے۔ وہ کچھ دن سکون سے گزارنا چاہتی تھی۔ اس لیے ہم نے کسی کو اس کے بارے نہیں بتایا۔ ایبٹ آباد کا بھی بس آپ کو ہی بتا رہا ہوں۔''

''کیا آپ کو یقین ہے۔ میرا مطلب ہے، آخری بار آپ کی ونمالا دیوی سے کب ملاقات ہوئی؟''

وہ بولا۔ ''کمال کی باتیں کرتے ہیں جی آپ بھی...... بادشاہو! میں خود دو دن رہ کے آیا ہوں ایبٹ آباد میں اور فون تو دھی رانی کا روزانہ آتا ہے۔ ابھی دوپہر کو آیا ہوا تھا۔''

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''پھر تو بات ہی ختم ہو گئی جناب! شاید ہمیں ہی دھوکا ہوا ہے۔''

''لیکن گل کیا ہے جی! تھوڑا بہت ہمیں بھی پتہ چلنا چاہیے۔''

میں نے بات گول کرتے ہوئے کہا۔ ''بس جی ہمیں کچھ شک شبہ ہوا تھا۔ پچھلے ہفتے جالندھر کے قصبے ''جے پور'' سے ایک لڑکی اغوا ہوئی ہے۔ ہمیں ایک گواہی ملی تھی کہ مغویہ کی شکل فلموں کی مشہور اداکارہ ونمالا دیوی سے ملتی ہے۔'' میں بات کرتے کرتے رگوناتھ کے چہرے کا بھی بغور جائزہ لے رہا تھا۔ اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا یا تو یہ شخص زبردست اداکار ہے یا واقعی ہم کسی دھوکے میں ہیں درحقیقت ابھی تک اس بات کا

کوئی ٹھوس ثبوت موجود نہیں تھا کہ "مستری احاطے" سے اغوا ہونے والی لڑکی واقعی ونمالا ہے۔ صرف ایک دیوندر پروانہ کا بیان تھا کہ موقع سے ملنے والی جوتی ونمالا کی ہے اور وہ اس رات اس سے ملنے کریانے کی دکان میں آئی تھی۔ دیوندر پروانہ کوئی معتبر گواہ نہیں تھا۔ ساون کے اندھے کو ہر طرف ہرا ہی ہرا نظر آتا ہے۔ ممکن ہے ونمالا سے ملتی جلتی کسی لڑکی کو پروانے نے ونمالا سمجھ لیا ہو، یا پھر کوئی لڑکی سرے سے اس کی دکان میں آئی ہی نہ ہو لیکن پھر فوراً میرا دھیان اس خط کی طرف چلا گیا جو چنگڑوں کے ڈیرے سے ملا تھا اور جس پر چھاؤنی کا ایڈریس لکھا ہوا تھا۔ میں قریباً آدھ گھنٹہ رگوناتھ کے پاس بیٹھا۔ اس دوران دوسرے اہل خانہ سے بھی ملاقات ہوئی۔ ان میں ونمالا کی خوبصورت ماں کے علاوہ چند قریبی رشتے دار بھی تھے۔ وہ سب کہیں جانے کے لیے تیار ہو رہے تھے اور کافی جلدی میں تھے۔ میں نے رگوناتھ سے رخصت ہونا مناسب سمجھا اور اجازت لے کر باہر آ گیا۔ دو گلیاں چھوڑ کر میں نے اپنی موٹر سائیکل ایک درخت تلے کھڑی کر رکھی تھی۔ موٹر سائیکل لے کر میں ہیڈ کوارٹر کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہاں موٹر سائیکل جمع کرانے کے بعد مجھے واپس جالندھر روانہ ہو جانا تھا۔ ابھی میں ونمالا کے گھر سے تین چار فرلانگ ہی دور آیا تھا کہ ایک کھٹارہ کار تیزی سے آئی اور موٹر سائیکل کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ عینک والے ایک دبلے پتلے شخص نے گاڑی کے اندر سے اشارہ کر کے مجھے رکنے کے لیے کہا۔ میں نے موٹر سائیکل روک دی۔ اس نے بھی کار روک دی اور کھڑکی سے سر نکال کر بولا۔

"بھائی صاحب! میں آپ سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔ کیا مجھے چند منٹ دیں گے۔"

میں اس شخص کو ونمالا کی کوٹھی میں دیکھ چکا تھا۔ رگوناتھ نے اس کا نام کرن کمار بتایا تھا اور کہا تھا کہ یہ ونمالا کے چچا ہیں۔ کرن کمار کے کہنے پر میں نے موٹر سائیکل ایک طرف لاک کر دی اور اس کی کھٹارہ گاڑی میں آ بیٹھا۔ وہ گاڑی کو تھوڑا سا آگے ایک گلی میں لے گیا اور بچوں کے ایک پارک کے سامنے روک دی۔ ہمارا تعارف تو ہو ہی چکا تھا۔ وہ چھوٹی سی تمہید باندھنے کے بعد اصل موضوع پر آ گیا۔ کہنے لگا۔

"نواز صاحب! آپ مجھے عام پولیس والوں سے مختلف نظر آئے ہیں۔ اسی لیے آپ کے پیچھے آیا ہوں ایک اہم معاملے میں آپ کو ہمراز بنانے کی جرأت کر رہا ہوں۔ میں آپ سے اپنی بھتیجی ونمالا کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

"جی کہیے۔" میں ہمہ تن متوجہ ہو گیا۔

کرن کمار بولا۔ "رگوناتھ کو آپ سے جھوٹ بولنا پڑا ہے۔ ورنہ حقیقت وہی ہے جو آپ نے بتائی ہے۔ ونمالا اغوا ہو چکی ہے اور اس وقت خانہ بدوشوں کے قبضے میں ہے۔"

یہ ایک سنسنی خیز انکشاف تھا۔ میں نے کرن کمار سے پوچھا۔ "آپ کو یہ بات کب معلوم ہوئی؟"

"پچھلے اتوار کو۔" کرن کمار نے جواب دیا۔ "وہ بدھ کو گم ہوئی تھی اور اسی روز ہمیں اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آ چکا ہے لیکن ہم اس خبر کو عام نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اسٹوڈیو میں اور اسٹوڈیو سے باہر ونمالا کے کئی حاسد اور بدخواہ موجود ہیں۔ ہمیں ڈر تھا اور اب بھی ہے کہ وہ اسکینڈل بنائیں گے اور بات کو کہیں سے کہیں پہنچا دیں گے۔ لہٰذا ہم نے بہانہ تراشا کہ ونمالا کچھ دنوں کے لیے آرام کرنے چلی گئی ہے اور اس کی ہدایت ہے کہ کسی کو اس کے بارے نہ بتایا جائے۔ دوسری طرف ہم بے پناہ پریشانی کے عالم میں اسے تلاش کر رہے تھے...... آخر اتوار کے روز ونمالا کی سہیلی آشا نے یہ انکشاف کیا کہ ونمالا بدھ کے روز چندی گڑھ کی آؤٹ ڈور شوٹنگ سے واپس آتے ہوئے جالندھر میں رک گئی تھی۔ انہوں نے جالندھر کے گولڈن سٹار ہوٹل میں قیام کیا اور یہیں پر ونمالا سے وہ سنگین غلطی ہو گئی جس کے لیے اب اسے اور ہم سب کو پچھتانا پڑ رہا ہے۔ نواز صاحب! میں نے آپ پر اعتماد کیا ہے، اس لیے اب کچھ بھی آپ سے چھپانا نہیں چاہتا۔ کیونکہ بندے پر اعتماد کیا جاتا ہے یا بالکل نہیں کیا جاتا...... حقیقت یہ ہے کہ ونمالا ایک بے حد غیر ذمہ دار لڑکی ہے۔ لا ابالی پن بہت ہے۔ موڈی ایسی ہے کہ کئی بار بغیر کسی وجہ کے شوٹنگ پیک کرا دیتی ہے اور فلم ساز "ہاں ہاں" کرتے رہ جاتے ہیں۔ اس کی سہیلی آشا نے جو کچھ بتایا ہے اس سے پتہ چلا ہے کہ جالندھر میں بھی اس نے ایک ایسی ہی حرکت کی۔ آپ کے قصبے "جے پور" میں اس کا کوئی پرستار دیوندر نامی رہتا ہے۔ پتہ نہیں کون گھسیارا ہے وہ ترنگ میں آ کر اس سے ملنے نکل کھڑی ہوئی۔ اس کے پاس شوٹنگ کے بہت سے لباس تھے جن میں ایک سانسی لڑکی کا لباس بھی تھا۔ اس نے یہ لباس پہن لیا۔ (لباس کے ساتھ جوتی نہیں تھی لہٰذا اسے اپنی ماڈرن جوتی ہی پہننا پڑی) پھر اس نے ڈرائیور کو ہوٹل میں ہی چھوڑا اور گاڑی لے کر جے پور پہنچ گئی۔ آشا بھی اس کے ساتھ تھی۔ ایک جگہ گاڑی سے اتر گئی اور آشا سے کہنے لگی کہ وہ صبح چار بجے اسی جگہ آ کر اسے لے جائے...... آشا اس کے مزاج کو سمجھتی تھی۔ اسے معلوم تھا اب روکنے ٹوکنے سے کچھ نہیں ہو گا۔ اسے جو کرنا ہے کر کے رہے گی۔ وہ ہوٹل واپس چلی گئی اور مقررہ وقت پر دوبارہ قصبے کی طرف روانہ ہوئی لیکن راستے میں گاڑی کا ٹائر پنکچر ہو گیا اور اسے موقع پر پہنچتے پہنچتے

آدھ پون گھنٹے کی تاخیر ہوگئی۔ ونمالا وہاں کہیں نہیں تھی۔ آشا کچھ دیر انتظار کرتی رہی پھر اندھیرا چھٹنے سے پہلے پہلے قصبے سے واپس آگئی۔ وہ سخت پریشان تھی۔

ہوٹل پہنچ کر آشا نے ونمالا کے ڈرائیور کو تمام صورت حال بتائی۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ دونوں فی الحال ونمالا کے بارے میں خاموش رہیں گے...... لیکن پھر جب چار روز گزرنے کے باوجود ونمالا کا کوئی کھوج کھرا نہیں ملا تو آشا نے سب کچھ ہمیں بتا دیا۔"

میں نے کہا۔ "کرن کمار صاحب! ابھی آپ نے بتایا ہے کہ ونمالا خانہ بدوشوں کے پاس ہے آپ کو یہ بات کیسے معلوم ہوئی۔"

"ہمیں کل ایک خط ملا ہے جی!" کرن کمار نے ایک اور انکشاف کیا۔ "یہ خط کسی سترام جاہ نامی شخص کی طرف سے ہے۔ اس نے خود کو سانسی قبیلے کا مکھیا بتایا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ ونمالا کچھ خطرناک لوگوں کے ہاتھ میں ہے اور وہ اسے لے کر چندی گڑھ کے ذخیروں (جنگل) کی طرف چلے گئے ہیں۔ سترام جاہ نے ہمارا ہمدرد بن کر لکھا ہے کہ وہ ہمارا اور اغوا کرنے والوں کا معاملہ کرا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ مخلصانہ مشورہ بھی دیا ہے کہ اگر ہم نے پولیس کو بیچ میں لانے کی کوشش کی تو لڑکی کا کچھ بھی ہاتھ نہیں آئے گا۔ لہٰذا ہم یہ معاملہ تھانے کچہری سے باہر ہی طے کرلیں۔"

میں نے دل ہی دل میں سترام جاہ کو گالی دی۔ اس کی دیدہ دلیریاں حد سے بڑھتی جا رہی تھیں۔ صاف ظاہر تھا کہ لڑکی سترام جاہ کے پاس ہی ہے لیکن اسے کسی محفوظ مقام پر رکھا گیا ہے اور اب وارثوں سے سودے بازی کی جا رہی ہے۔ میں نے کرن کمار سے پوچھا۔

"پھر آپ لوگوں نے کیا جواب دیا ہے؟"

وہ بولا۔ "جواب ہم کیا دیتے۔ ہم خود وہاں گئے جالندھر میں سترام جاہ کے ڈیرے پر...... میں رگوناتھ اور ایک فلساز "بھائی جی" تھے۔ سترام جاہ نے کہا کہ اس کی حیثیت تو "معاملہ کرانے والے" کی ہے۔ نہ اسے یہ معلوم ہے کہ مغویہ کہاں ہے اور نہ یہ پتہ ہے کہ اغوا کرنے والے کب اور کہاں اس سے رابطہ قائم کریں گے۔ ہمارے پوچھنے پر سترام جاہ نے بتایا کہ ونمالا پہلے چنگڑ قبیلے کے پاس تھی۔ ہیرا نامی ایک شخص نے اپنی عورت دے کر ان سے ونمالا حاصل کرلی اور اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ اسے لے کر دریا کے کنارے ذخیرے میں جا چھپا ہے۔ سترام نے کہا کہ اب ہیرے کا کوئی پتہ ٹھکانہ نہیں۔ اس نے خط لکھنے کو کہا تھا میں نے لکھ دیا ہے، جو آپ کا جواب ہے وہ مجھے بتا دیں۔ جب وہ مجھ سے رابطہ قائم کرے گا میں اسے آپ کا جواب بتا دوں گا۔"

میں کرن کمار کی زبانی سترام جاہ کی "دلیریوں" کا سن کر حیران ہو رہا تھا۔ ساری دنیا

جانتی تھی کہ ہیرا، سترام کا سگا بھائی ہے، اور وہی کام کرتا ہے جس میں سترام کی مرضی شامل ہوتی ہے لیکن سترام مغویہ کے وارثوں کو بتا رہا تھا کہ ہیرا پتہ نہیں کون ہے اور کہاں رہتا ہے۔

میں نے کرن کمار سے پوچھا۔ "آپ لوگ ستر ام کے پاس کب گئے تھے؟"

کرن کمار نے بتایا کہ یہ تین روز پہلے کا واقعہ ہے اور اس کے بعد سے وہ مسلسل انتظار کر رہے ہیں لیکن ستر ام جاہ کی طرف سے کوئی رابطہ قائم نہیں کیا گیا۔

میں نے پوچھا۔ "ستر ام جاہ کا بھیجا ہوا خط کہاں ہے؟"

کرن کمار بولا۔ "وہ رگوناتھ کے پاس ہے لیکن...... میں نہیں چاہتا کہ آپ اس سلسلے میں رگوناتھ سے کوئی بھی بات کریں۔ وہ پولیس کو بیچ میں لانے کا سخت مخالف ہے۔ میرا اپنا بھی یہی خیال تھا لیکن معلوم نہیں کیوں آپ سے مل کر مجھے محسوس ہوا کہ آپ ہماری مدد کر سکتے ہیں۔ میری منت ہے کہ فی الحال یہ بات آپ میرے اور اپنے درمیان رکھیں۔"

میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے کرن کمار صاحب! جیسے آپ کی مرضی۔ میں اب واپس جالندھر جا رہا ہوں۔ باقی آپ کو میری طرف سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں خود بھی اس معاملے میں کسی طرح کی جلد بازی کرنا نہیں چاہتا۔ اس سے نہ صرف آپ کی بدنامی ہوگی بلکہ لڑکی کی جان بھی جا سکتی ہے۔"

کرن کمار جلدی جلدی اقرار میں سر ہلانے لگا۔ "بالکل ٹھیک۔ آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔"

میں دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ شریف اور غیر شریف شخص میں یہی فرق ہوتا ہے۔ ونمالا کسی عزت مند کی بیٹی ہوتی تو وہ ایک ایک پل عذاب کی طرح کاٹتا۔ اس کی آرزو ہوتی کہ اس کی بیٹی بے آبرو ہونے سے پہلے مرجائے یا لٹیروں کے چنگل سے نکل آئے لیکن یہاں راوی چین لکھ رہا تھا۔ انہیں صرف ونمالا کی جان کی پرواہ تھی۔ "عزت" کا کوئی فکر فاقہ نہیں تھا۔

میں نے کرن کمار سے رخصت ہوتے ہوئے کہا۔ "اچھا جی! اب اجازت دیں۔ ونمالا کے سلسلے میں مزید بات کرنے کے لیے اگر آپ کل یا پرسوں جالندھر تشریف لے آئیں تو یہ مناسب رہے گا۔"

کرن کمار بولا۔ "آپ نے میرے منہ کی بات چھینی ہے۔ میں پرسوں ضرور آپ کے پاس حاضر ہوں گا اور اگر اس دوران ستر ام جاہ کی طرف سے کوئی نیا پیغام آیا تو اس کے بارے بھی آپ کو بتا دوں گا۔"

☆=====☆=====☆

مجھے بلال شاہ کا شدت سے انتظار تھا لیکن کھوتی کا دودھ پی کر وہ شاید زیادہ ہی بھلکڑ ہو گیا تھا۔ چار پانچ روز تک اس نے کوئی خبر نہیں دی اور جب آیا تو مایوسی کی خبر لے کر آیا۔ کوشش کے باوجود وہ ونمالا کے بارے کچھ معلوم نہ کر سکا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ونمالا کم از کم سترام والے ڈیرے پر موجود نہیں۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے روہی کے ساتھ ساتھ سانسیوں کے تین چار ڈیرے تھے۔ ممکن تھا اسے کسی اور ڈیرے پر رکھا گیا ہو اور یہ بھی امکان تھا کہ وہ کسی دوسری محفوظ جگہ پہنچا دی گئی ہو۔ میں نے بلال شاہ سے ''درخواست'' کی کہ وہ سونا تھوڑا سا کم کر دے۔ آنکھیں کھلی رکھے اور ونمالا کے بارے جیسے ہی کوئی اطلاع ملے، میرے پاس چلا آئے۔

وہ جل کر بولا۔ ''اطلاع ملے گی تو تب ہے ناں۔ میں نے خود تو اطلاع نہیں بن جانا۔ ابلے ہوئے شلجم کھا کھا کر پہلے ہی سر پولا ہو گیا ہے میرا۔ اوپر سے چار میل کھیتوں میں پیدل چل کر یہاں آنا پڑتا ہے۔ یقین کریں یہاں تک آتے آتے آدھی جان رہ جاتی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''بھئی! یہ بات تو میں بھی مانتا ہوں۔ بڑی ہمت ہے تمہاری ان ٹانگوں کی ہر وقت اتنا بھاری بوجھ اٹھائے پھرتی ہیں۔ پچیس تیس سیر کی تو تمہاری توند ہی ہو گی۔''

''پچیس تیس سے بھی زیادہ ہو گی!'' وہ روانی میں کہہ گیا۔ پھر اس نے گھور کر مجھے دیکھا اور کڑوے لہجے میں بولا۔ ''بس آپ کو میری توند کی ہی پڑی رہتی ہے یہ نہیں دیکھتے اس توند میں کچھ ہے بھی یا نہیں۔ قسم لے لیں مجھ سے جو پچھلے تین ہفتوں سے میں نے تڑکے والا سالن کھایا ہو......''

میں نے اسی وقت نوجوان سنتری کو ہدایت کی کہ وہ دو گرما گرم چرغے لے آئے۔ اپنی عمر کے اور بلال شاہ کے سائز کے، ساتھ تندوری نان اور اَدھ رڑکے کا جگ بھی ہو۔ یہ آرڈر سن کر بلال شاہ کی باچھیں کھلیں اور کھلتی چلی گئیں۔

بلال شاہ کو تو کھلا پلا کر میں نے واپس سانسیوں کے ڈیرے بھیج دیا اور خود ونمالا کے چچا کرن کمار کا انتظار کرنے لگا۔ مجھے لاہور سے آئے چار روز ہو چکے تھے لیکن وہ ابھی تک نہیں آیا تھا کل تو سارا دن بارش ہوتی رہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ شاید آج آ جائے۔ وہ اس روز سہ پہر کو جے پور پہنچا۔ میں اسے لے کر سیدھا گھر آ گیا۔ وہ آج کچھ پریشان سا تھا۔ میں نے اسے چائے وغیرہ پلائی۔ وہ مجھے اپنے بارے میں بتانے لگا۔ عرصہ پانچ سال سے وہ کراچی میں رہ رہا تھا۔ وہاں کسی میمن کی فرم میں ملازمت کرتا تھا۔ بس کبھی کبھار یتیم بھتیجی سے ملنے لاہور آتا تھا۔ بھتیجی ونمالا کی ماں یعنی کرن کمار کی بھاوج رشتے میں اس کی خالہ بھی تھیں۔ بھاوج اور بھتیجی دونوں رگوناتھ پر بے حد اعتماد کرتی تھیں اور بعض لوگوں کو تو یہی پتہ تھا کہ

رگوناتھ ونمالا کا باپ ہے۔ کرن کمار جب بھی لاہور آیا ایک دو روز کے لیے آیا۔ اس مختصر وقت میں کسی شخص کے بارے میں کوئی واضح رائے قائم نہیں کی جا سکتی کرن کمار کا یہی خیال تھا کہ رگوناتھ ایک مخلص شخص ہے۔ وہ ونمالا جیسی غیر ذمہ دار لڑکی کو قدم قدم پر رہنمائی فراہم کر رہا ہے اور اپنا سہارا دے کر اسے ترقی کے زینے چڑھا رہا ہے لیکن اب لاہور میں چند دن رہنے کے بعد اسے یہ احساس ہو رہا تھا کہ رگوناتھ اتنا مخلص شخص نہیں جتنا نظر آتا ہے۔ اس کا میل جول قابل رشک لوگوں سے نہیں تھا اور وہ خود بھی کچھ بد عادتوں کا شکار تھا۔ یہی وجوہات تھیں جن کی بنا پر کرن کمار نے مجھ سے رابطہ قائم کیا تھا اور میری مدد چاہی تھی۔

میں اور کرن کمار کافی دیر سر جوڑ کر بیٹھے رہے۔ میں نے کرن کمار کو خانہ بدوشوں کے بارے میں ہر اونچ نیچ سمجھائی اور اسے بتایا کہ ونمالا کو ان لوگوں سے برآمد کرنے کے لیے ہمیں کیا کرنا ہو گا۔ کرن کمار خود بھی یہی چاہتا تھا کہ یہ کام بے حد رازداری سے ہو۔ اس نے بتایا کہ فلموں کی ایک ایکٹرس ونمالا کی رقیب نمبر ایک ہے۔ اس نے ونمالا سے علیحدہ ہی اپنا ایک دھڑا بنا رکھا ہے اور یہ دھڑا ونمالا کو نیچا دکھانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ اب ونمالا نے خود ہی اپنی بیوقوفی سے ان لوگوں کو ایک سنہری موقع فراہم کر دیا ہے۔ یہ موقع ان لوگوں کے ہاتھ لگ گیا تو وہ زبردست تماشا بنا دیں گے۔

میں نے کرن کمار کو بتایا کہ میرے ایک دو مخبر خانہ بدوشوں کے ڈیرے میں موجود ہیں۔ جونہی انہوں نے کوئی کھوج لگایا اور ہمیں ونمالا کا ٹھکانہ معلوم ہوا ہم اس کو مکھن کے بال کی طرح وہاں سے نکال لیں گے۔ کرن کمار نے کہا۔ ''میں نے بھی کراچی جانے کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔ میں یہیں بھابی کے پاس رہوں گا۔ ایک دو روز تک سترام کا کوئی پیغام نہ آیا۔ تو ہم پھر اس کے ڈیرے پر جائیں گے۔''

میں نے کہا۔ ''میں آپ لوگوں کی طرف سے کسی اچھی خبر کا منتظر رہوں گا۔''

''اور میں آپ کی طرف سے کسی اچھی خبر کا انتظار کروں گا۔'' کرن کمار نے کہا۔

......لیکن پھر یوں ہوا کہ نہ میں کرن کمار کو کوئی اچھی خبر دے سکا اور نہ وہ کوئی اہم اطلاع پہنچا سکا۔ پورے آٹھ روز گزر گئے۔ ونمالا کا کہیں سراغ نہیں ملا۔ سترام جاہ کے ڈیرے کی طرف سے تو میں بے فکر تھا وہاں بلال شاہ موجود تھا۔ ونمالا ڈیرے پر لائی جاتی تو بلال شاہ کی عقابی نگاہوں سے چھپی نہ رہتی۔ باقی تین ڈیروں کے بارے میں مجھے فکر تھی اور وہاں میں نے دو مخبروں کو مسلسل حرکت میں رکھا ہوا تھا۔ ان میں سے ایک تو وہی حوالدار انت سنگھ تھا جو اس سے پہلے سترام جاہ کے ڈیرے پر موجود تھا جبکہ دوسرا سانسیوں کے اندر سے ہی تھا۔ یہ

ایک چرسی تھا جو بھرے ہوئے سگریٹ کے لالچ میں ڈیروں کی باتیں ہمیں بتا جاتا تھا۔ آٹھ دنوں میں ان دونوں مخبروں نے مجھ سے کم از کم چھ دفعہ ملاقات کی لیکن وہ کوئی کام کی بات نہیں بتا سکے۔ نویں روز مجھے ایک قتل کے کیس کے سلسلے میں سرگودھا جانا پڑ گیا۔ یہاں دو پارٹیوں میں اراضی کا ایک لمبا تنازعہ چلا ہوا تھا۔ قاتل بھاگ کر ''ٹبی رکھ سرکار'' میں روپوش ہو چکا تھا۔ علاقے کے لوگ سرتاپا احتجاج بنے ہوئے تھے۔ مجھے اس معاملے سے نبٹتے نبٹتے قریباً ڈیڑھ ہفتہ لگ گیا۔ واپس جالندھر پہنچ کر میں نے سب انسپکٹر سے سب سے پہلے ونمالا کیس کے بارے پوچھا۔ وہ مایوسی کے ساتھ نفی میں سر ہلانے لگا۔ اس نے بتایا کہ ابھی تک کوئی کھوج نہیں ملا۔ اس نے ونمالا کے چچا کرن کمار کے بارے بھی بتایا۔ کہنے لگا۔

''کرن کمار! ہفتے کے روز یہاں آیا تھا۔ بہت پریشان دکھائی دیتا تھا۔ کہتا تھا ونمالا کی ماں پر غشی کے دورے پڑ رہے ہیں...... وہ اور رگوناتھ سترام جاہ کے پاس بھی گئے تھے۔ سترام جاہ نے انہیں کوئی حوصلہ افزاء جواب نہیں دیا۔ اس نے کہا ہے کہ اغوا کرنے والوں نے اس سے دوبارہ رابطہ نہیں کیا۔''

یہ باتیں سن کر میرا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اب سترام جاہ اور اس کے مشٹنڈے بھائی کو زیادہ ڈھیل نہیں دوں گا۔ انہوں نے بھی جو سانپ نکالنا ہے نکال لیں...... لیکن پھر اسی رات حالات نے ایک بالکل نئی کروٹ لی۔ میری ملاقات بلال شاہ سے ہوئی اور اس ملاقات میں وہ گفتگو ہوئی جس کا میں نے تصور نہیں کیا تھا...... بلال شاہ کے کردار کا یہ رخ میرے لیے بالکل نیا تھا۔ یقیناً آپ کے لیے بھی نیا ہوگا......

بلال شاہ رات قریباً گیارہ بجے میرے گھر پہنچا۔ وہ حسب معمول کمبل میں لپٹا ہوا تھا۔ اس کا ستا ہوا چہرہ دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ وہ آج بھی کوئی کام کی خبر نہیں لایا۔ بہرحال وہ کافی دور سے پیدل چل کر آیا تھا اور بقول اس کے ابلے شلجم کھا کھا کر اس کا سر پولا ہو چکا تھا۔ میں نے ملازم کو آواز دی اور وہ فٹافٹ بلال شاہ کے لیے گرم دودھ کا کنگ سائز گلاس لے آیا۔ بالائی والا دودھ دیکھ کر بلال شاہ کی آنکھوں میں مسرت انگیز چمک آ جایا کرتی تھی لیکن آج یہ آنکھیں بجھی ہی رہیں۔ وہ سخت دل گرفتہ نظر آ رہا تھا۔

کیا بات ہے بلال شاہ خیر تو ہے؟''

''خیر ہی ہے جناب!'' وہ بے دلی سے مسکرا دیا۔

میں نے کہا۔ ''تو پھر دودھ پیو، یہاں دودھ پلائی کا کوئی چکر نہیں ہے۔''

اس نے گلاس اٹھا کر منہ سے لگایا اور ایک دو گھونٹ لے کر نیچے رکھ دیا۔ بولا۔ ''خاں

صاحب! آج پہلی بار آپ کا منگوایا ہوا دودھ مجھے کڑوا لگا ہے...... لگتا ہے حلق سے لے کر سینے تک سب کڑوا ہے۔''

''کیا بات ہے؟'' میں نے حیران ہو کر کہا۔ ''آج بڑی داناؤں والی باتیں کر رہے ہو۔''

اس نے ایک لمبا کھنگورا مار کر گلا صاف کیا اور بولا۔ ''خاں صاحب! آج میرے سر پر ایک بڑا بوجھ ہے۔ لگتا ہے کوئی بڑی گٹھڑی اٹھا رکھی ہے میں نے دراصل......'' وہ کچھ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔

''ہاں...... ہاں...... کہو'' میں نے اسے حوصلہ دیا۔

وہ بولا۔ ''خاں صاحب! دراصل میں نے آپ سے ایک جھوٹ بولا ہے اور ایسا زندگی میں پہلی بار ہوا ہے۔''

''کیسا جھوٹ؟'' میں نے پوچھا۔

بلال شاہ بولا۔ ''ونمالا سترام جاہ کے ڈیرے پر ہے میں اس کے بارے جانتا بھی تھا پھر بھی آپ سے چھپائے رکھا۔''

مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ بلال شاہ اور مجھے دھوکے میں رکھے، یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ پچھلے ایک ماہ سے ہم ونمالا کی تلاش میں ہلکان ہو رہے تھے اور اب بلال شاہ کہہ رہا تھا کہ اسے ونمالا کے بارے میں سب معلوم ہے۔ ''کیا تم نے اسے خود دیکھا ہے؟'' میں نے بے یقینی سے کہا۔

''نہ صرف دیکھا ہے بلکہ میں اسے کھانا پہنچا کر بھی آتا رہا ہوں......''

میرا دماغ چکرا رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''بلال شاہ! مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ تم نے مجھ سے یہ اہم خبر چھپائی ہے۔ اگر چھپائی ہے تو میں سمجھتا ہوں ضرور اس کی کوئی بڑی وجہ ہوگی۔''

وہ افسردگی سے بولا۔ ''یہی تو دکھ ہے جی۔ ایسی کوئی بڑی وجہ بھی نہیں تھی بس...... بس سمجھیں کہ عقل پر پردہ سا پڑ گیا تھا۔ سچ ہے خاں صاحب! خوبصورت عورت بڑی شے ہوتی ہے۔ بڑوں بڑوں کے مان توڑ دیتی ہے۔ اب میری طرف دیکھ لیں۔ میرے جیسا ''عورت بیزار'' بندہ بھی چند دنوں کے لیے جھلا ہو گیا تھا۔ اب یہ جھل ہی ہے ناں کہ میں نے سب کچھ جانتے بوجھتے اس کی بات مان لی اور آپ سے اصلیت چھپانے پر تیار ہو گیا۔'' بلال شاہ اپنے آپ سے سخت ناراض نظر آ رہا تھا۔ اس ناراضگی نے اس کے چہرے کو گہری سنجیدگی میں ڈھانپ رکھا تھا۔

میں نے کہا۔ ''بلال شاہ! تمہاری بات میرے پلے نہیں پڑ رہی۔ مجھے شروع سے بتاؤ

کیا واقعہ ہے۔ ونمالا کہاں ہے اور تم کہاں ملے تھے اس سے؟‘‘

بلال شاہ نے ایک نظر کمرے کے بند دروازے کی طرف دیکھا اور گہری سانس لے کر بولا۔ ’’سانسیوں اور چنگڑوں نے جب دونوں لڑکیوں کو ادل بدل کیا تو مجھے کچھ پتہ نہیں تھا کہ ونمالا کہاں ہے لیکن تیسرے چوتھے روز مجھے معلوم ہو گیا۔ سترام جاہ نے مجھے سائیکل پر شہر بھیجا اور وہاں سے ہوٹل کا پکا پکایا کھانا منگوایا۔ پھر اس نے مجھے ایک دوسرے سانسی کے ساتھ پرانے پُل کی طرف بھیج دیا۔ آپ کو پتہ ہوگا پرانے پُل کے قریب نیچے کی طرف جہاں بھٹوں والے مٹی نکالتے ہیں ایک خستہ حال مقبرہ سا ہے۔ اس مقبرے کے پیچھے پکے احاطے میں ایک سرنگ ہے۔ سو ڈیڑھ سو فٹ لمبی یہ سرنگ اب بند ہو چکی ہے اور جو تھوڑا سا حصہ باقی ہے۔ اس میں کوئی جھانکنے کی جرأت بھی نہیں کرتا۔ ونمالا اس وقت چار سانسی پہریداروں کے ساتھ اسی سرنگ میں موجود ہے۔‘‘ میں پوری توجہ سے بلال شاہ کی بات سن رہا تھا۔ اس نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ’’ہم رات کے وقت کھانا لے کر اس سرنگ میں پہنچے۔ وہاں لالٹین جل رہی تھی اور ایک خوبصورت لڑکی سانسیوں والے لباس میں ایک مصلے پر بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھ پاؤں ڈوری سے بندھے ہوئے تھے اور بال بکھرے ہوئے تھے۔ سترام جاہ کا چھوٹا بھائی ہیرا بھی وہیں موجود تھا لڑکی اس کی طرف سہمی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ ہیرے نے مجھ سے کہا کہ میں لڑکی کے ہاتھ کھول دوں۔ میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ ہیرے نے لڑکی کو گالی دے کر کہا کہ اب وہ کھانا کھالے۔ یہ اس کا شہری کھانا ہے...... یہ ونمالا سے میری پہلی ملاقات تھی۔ میں جلد از جلد آپ تک پہنچ کر اطلاع دینا چاہتا تھا لیکن اس رات تیز بارش شروع ہو گئی اور مجھے پہریدار سانسیوں کے ساتھ مقبرے میں ہی رکنا پڑا۔ صبح منہ اندھیرے میری آنکھ کھل گئی۔ ونمالا سسکیوں سے رو رہی تھی۔ میں اس کے قریب جا بیٹھا۔ دو سانسی باہر پہریدار تھے جبکہ دو بھنگ کی پتیاں چبا کر گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔ میں ونمالا سے باتیں کرنے لگا۔ وہ سانسیوں کو بلیوں اور کتوں کا گوشت کھاتے دیکھ چکی تھی اور ان سے بے حد خوفزدہ تھی۔ کہنے لگی ’’تم مجھے دوسرے سانسیوں سے مختلف نظر آتے ہو۔ میرے پاس رہو مجھے ان لوگوں سے بہت ڈر لگتا ہے۔‘‘ میں اس سے کافی دیر باتیں کرتا رہا میں نے اسے بتا دیا کہ میرا تعلق پولیس سے ہے اور ہم بہت جلد اسے یہاں سے نکال لے جائیں گے۔

میری یہ بات سن کر وہ حوصلہ پکڑنے کے بجائے اور بھی دہشت زدہ ہو گئی۔ میرے سامنے ہاتھ جوڑنے لگی۔ کہنے لگی ’’اگر تم میری بھلائی چاہتے ہو تو اس بات کو اپنے تک ہی رکھو۔ میں نہیں چاہتی یہ معاملہ پولیس میں جائے۔ اس میں نہ صرف میری جان کو خطرہ ہے بلکہ بدنامی

بھی بہت ہوگی۔‘‘ پھر اس نے مجھے بتایا کہ ان لوگوں نے لاہور میں اس کے وارثوں کو پیغام بھیجا ہے اور اسے پوری امید ہے کہ وہ تاوان کی رقم دے کر اسے چھڑا لیں گے۔ میں جتنی دیر ونمالا کے پاس بیٹھا رہا وہ میری منتیں کرتی رہی کہ میں اپنے کسی افسر کو اطلاع نہ دوں ورنہ وہ لاہور میں بلکہ پورے ملک میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہے گی۔‘‘ بلال شاہ نے ذرا توقف کے بعد کہا۔ ’’اس کے بعد بھی میں ہر دوسرے روز ہوٹل کا کھانا لے کر وہاں جاتا رہا۔ جب بھی ونمالا کی نظر سے میری نظر ملتی اس کی آنکھوں میں ایک ہی منت ہوتی۔ میں اپنے وعدے پر قائم رہوں اور پولیس میں اطلاع نہ دوں...... وہ اتنی خوبصورت ہے خاں صاحب! کہ بس کیا بتاؤں۔ پھر وہ جس عاجزی سے مجھے دیکھتی تھی یقین کریں میرا دل قابو میں نہیں رہتا تھا۔ میں نے آپ سے کبھی جھوٹ نہیں بولا خاں صاحب! آج بھی نہیں بولوں گا۔ بس میری مت سی ماری گئی تھی۔ پسرور میں ہمارے سکول ماسٹر امام دین صاحب ٹھیک ہی کہا کرتے تھے۔ خوبصورت عورت کے آنسوؤں میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ پہاڑ جیسا بندہ بھی اس دو قطرے ’’پانی‘‘ میں ککھ کی طرح بہہ جاتا ہے۔‘‘

میں حیرت سے بلال شاہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ جو بچوں کی ٹیم پیدا کرنے کے بعد عورت کے نام سے بدکتا تھا اور دوسروں کو بھی ’’بدکاتا‘‘ تھا نرم گرم باتیں کر رہا تھا۔ بلال شاہ نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ’’اللہ معافی دے...... میری نیت میں کوئی فتور نہیں تھا۔ بس ایک...... کیا کہنا چاہیے...... ایک...... ترس سا آنے لگا تھا اس پر میں نہیں چاہتا تھا کہ جو وعدہ میں نے اس سے کیا ہے وہ توڑ دوں اور اس وجہ سے وہ کسی مصیبت میں پڑ کر ساری حیاتی مجھے بددعائیں دیتی رہے۔ میں نے کہا، ٹھیک ہے اگر تمہارے والی وارث تمہیں یہاں سے نکال سکتے ہیں تو ان کا انتظار کر لو۔ وہ بولی ’’زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ میرا خیال ہے آج کل میں میرے والد ان بدمعاشوں سے معاملہ طے کر لیں گے۔‘‘ بس جی! وہ انتظار کرنے لگی اور اب تک انتظار کر رہی ہے۔ پورے پچیس دن ہو گئے ہیں مجھ سے تو اس کی حالت دیکھی نہیں جاتی جی! سوکھ کر کانٹا ہو گئی ہے۔ دیوار سے ٹیک لگائے ہر وقت سرنگ کے دروازے کی طرف دیکھتی رہتی ہے۔ میں جب اندر جاتا ہوں بے اختیار کھڑی ہو جاتی ہے کہ شاید میں اس کے لیے کوئی اچھی خبر لایا ہوں۔ پرسوں ہیرے نے اسے بری طرح ڈرایا دھمکایا ہے۔ یہ واقعہ میرے سامنے ہوا تھا۔ ہیرے نے اسے بالوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا اور بولا۔ ’’تیرے باپ کو تیری جان کی نہیں اپنے پیسوں کی فکر ہے۔ وہ اپنے پیسے بچانا چاہتا ہے۔ بس اب تیار ہو جا ہمارا دل خوش کرنے کے لیے بھی...... اور مرنے کے لیے بھی۔‘‘

پرسوں ونمالا نے باپ کے نام ایک اور خط لکھ کر بھیجا ہے اور اس سے کہا ہے کہ وہ پیسوں کی پرواہ نہ کرے اس کی جان بچائے۔ پچاس ہزار روپیہ پھر بھی کمایا جائے گا لیکن اسے اغوا کرنے والے اسے زیادہ مہلت نہیں دیں گے...... اس خط کا انجام بھی پہلے خطوں سے مختلف نہیں ہوا تھا۔ بلکہ اس خط کا تو رگوناتھ کی طرف سے کوئی جواب بھی نہیں آیا۔ اب ہیرا وغیرہ بالکل مایوس ہو چکے ہیں اور وہ اپنی ساری مایوسی ونمالا پر اتاریں گے...... مجھے یقین ہے وہ اس کا برا حشر کریں گے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جان سے ہی مار ڈالیں۔ وہ کل سے بلک بلک کر رو رہی ہے۔ آج میں دوپہر کو کھانا لے کر وہاں پہنچا تو پچھلے دو روز کا کھانا بھی اسی طرح پڑا تھا۔ وہ گٹھڑی بنی بیٹھی تھی۔ قریب ہی تاجا اور موتی کلہاڑیوں سے مسلح پہرہ دے رہے تھے۔ میں نے سرگوشی میں کہا ''ابھی اور انتظار کرو گی...... یا اجازت ہے مجھے۔'' وہ پھوٹ کر رو پڑی اور گھٹی گھٹی ہچکیوں کے درمیان بولی۔ ''مجھے بچاؤ...... مجھے بچاؤ...... میں مرنا نہیں چاہتی۔''

☆======☆======☆

رات تاریک اور سردی جان لیوا تھی۔ ہماری جیپ کچے پکے راستے پر ہچکولے کھاتی کافی رفتار سے روہی نالے کی طرف جا رہی تھی۔ جیپ میں میرے ساتھ بلال شاہ اور سب انسپکٹر فرزند علی کے علاوہ دو ہیڈ کانسٹیبل اور دو رائفل مین بھی تھے۔ ڈرائیونگ میں خود کر رہا تھا۔

ہم کچے میں تین میل کا طویل چکر کاٹ کر شمال کی جانب سے پرانے پُل کے پاس پہنچے۔ اس طرح ہمیں خانہ بدوشوں کی بستیوں کے پاس سے نہیں گزرنا پڑا۔ پرانے پُل اور مقبرے سے ایک فرلانگ دور ہی ہم نے جیپ گھنے درختوں میں روک دی اور ٹارچیں سنبھال کر پیدل ہی پل کی طرف روانہ ہوئے۔ یہاں نالے کے ساتھ ساتھ اینٹیں تھاپنے والوں نے مٹی کھود کر بڑے بڑے گڑھے بنا رکھے تھے۔ ان گڑھوں کے پاس ہی وہ تاریک خستہ حال مقبرہ کسی آسیب کی طرح سر اٹھائے کھڑا تھا۔ مقبرے کی چاروں طرف جھاڑیاں تھیں اور بھنگ کے پودے تھے۔ بڑی اجاڑ سی جگہ تھی۔ میں بلال شاہ سے مقبرے اور سرنگ کا نقشہ معلوم کر چکا تھا۔ بلال شاہ کا کہنا تھا کہ دو پہریدار سرنگ کے اندر ہوں گے اور ایک یا دو باہر۔ پہریداروں کے پاس دو پستول ہیں ایک باہر ہوگا اور دوسرا سرنگ کے اندر۔ باقی دونوں افراد کلہاڑیوں سے مسلح ہوں گے۔ سرنگ کا دروازہ مضبوط لکڑی کا تھا اور اندر سے بند رکھا جاتا تھا۔

ہم بے حد احتیاط سے چلتے اس مقام پر پہنچ گئے جہاں سے مقبرے کا عقبی احاطہ دکھائی دیتا تھا سرنگ کا دروازہ اسی احاطے میں تھا۔ ایک برآمدے میں بلال شاہ نے مجھے مدھم روشنی دکھائی اور بولا۔ ''یہاں پرالی بچھی ہوئی ہے۔ باہر والے پہریدار یہاں بیٹھتے ہیں۔ میرا خیال ہے اس وقت بھی وہ لالٹین کی روشنی میں تاش کھیل رہے ہوں گے۔'' میں نے اپنا ریوالور چیک کیا اور سیفٹی کیچ ہٹا کر دوبارہ ہولسٹر میں رکھ لیا۔ ہیڈ کانسٹیبل عمر دراز بھی پوری طرح تیار تھا۔ پروگرام کے مطابق اسے میرے ساتھ آگے جانا تھا۔ میں نے باقی عملے کو ایک بار پھر ضروری باتیں سمجھائیں۔ اگر میں اور عمر دراز دونوں پہریداروں کو بغیر کسی ''شور شرابے'' کے قابو کرنے میں کامیاب ہو جاتے تو سب انسپکٹر اور رائفل مین کو اپنی جگہ موجود رہنا تھا۔ دوسری صورت میں انہیں بھاگ کر سرنگ کے دروازے پر پہنچ جانا تھا اور اگر دروازہ کھلتا اور کوئی اندر سے برآمد ہوتا تو اس کی ''مزاج پرسی'' کرنا تھی۔

میں اور عمر دراز جھک کر چلتے ہوئے ڈھلوان اترے۔ بھنگ کے پودوں میں سے گزر کر احاطے میں پہنچے تو لالٹین کے قریب بیٹھے ہوئے دو ہیولے صاف نظر آنے لگے۔ ایک شخص کے کندھے کی کلہاڑی بھی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ ان دونوں سے بچ کر سرنگ کے دروازے تک پہنچنا ناممکن تھا۔ ہم دونوں اوندھے لیٹ گئے اور گہری تاریکی میں دیوار کے ساتھ ساتھ بے آواز رینگتے ہوئے پہریداروں کے قریب پہنچ گئے۔ یہ بڑے سنسنی خیز لمحات تھے۔ ہم دونوں کی ہی نہیں ونمالا کی زندگی بھی داؤ پر لگی ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا۔ ہمارے سانسوں کی آواز بھی پھنکار بن کر خاموشی میں گونج رہی ہے......

اب پستول بردار پہریدار سے میرا فاصلہ صرف تین گز تھا۔ اُس کے کندھے پر ہولسٹر مجھے صاف نظر آ رہا تھا۔ بلال شاہ کے اندازے کے عین مطابق دونوں پہریدار تاش کھیلنے میں مصروف تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ریوڑیاں بھی کھا رہے تھے۔ خاموشی میں کڑکڑ کی آواز دور تک گونج رہی تھی۔ وہ اس بات سے قطعی بے خبر تھے کہ ''قانون کا ہاتھ'' ان کے اس قدر قریب پہنچ چکا ہے...... اچانک میں اپنی جگہ سے اٹھا اور دو قدم بھاگ کر پستول بردار شخص پر جا پڑا۔ میرا بایاں ہاتھ سیدھا اس کے پستول پر آیا تھا۔ پستول باہر کھینچنے میں مجھے ذرا سی بھی دقت نہیں ہوئی۔ مکھن کے بال کی طرح پستول میرے ہاتھ میں آ گیا۔ پستول بردار اوندھے منہ میرے نیچے گرا اور لالٹین اس کے سر کی ٹکر سے لڑھک کر دور جا گری۔ میرا دوسرا ہاتھ مدمقابل کے منہ پر آیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ ہوشیار ہو کر چیخ بلند کرتا۔ میں نے بے رحمی سے اس کا سر دیوار سے ٹکرا دیا۔ اس کے بند منہ سے گھٹی گھٹی آواز نکلی اور میری گرفت میں اس نے ہاتھ

پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیئے۔ دوسری طرف ہیڈ کانسٹیبل عمر دراز نے بھی اپنے شکار پر بڑی کامیابی سے قابو پایا تھا۔ عمر دراز خاصا زور آور تھا اندھیرے میں اچانک برآمد ہو کر اس نے اپنے مدمقابل کی گردن دبوچ لی تھی اور دوسرے ہاتھ سے اس کا منہ ڈھانپ لیا تھا۔ میں نے دیکھا دبلا پتلا پہریدار عمر دراز کی گرفت میں چڑیا کی طرح پھڑ پھڑا رہا ہے۔ میرا مدمقابل سر پر آنے والی شدید چوٹ سے بے ہوش ہو چکا تھا۔ لہٰذا میں نے اسے اللہ کے سپرد کر کے اس کے پستول کی نال دوسرے پہریدار کی پیشانی سے لگا دی۔ میرا مقصد اسے خاموش رکھنا تھا لیکن لالٹین کے لڑھکنے سے جو آواز پیدا ہوئی تھی اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس بات کو سمجھتے ہوئے سب انسپکٹر فرزند علی اور سکھ رائفل مین بھاگ کر سرنگ کے دروازے پر پہنچ گئے۔ ان کے وہاں پہنچتے ہی دروازہ جھٹکے سے کھلا ایک بھاری بھرکم آواز آئی۔

''اوئے...... کیا ہوا ہے نا جے؟'' یہ ستار ام جاہ کا بھائی ہیرا تھا۔

سکھ سپاہی نے رائفل کا بٹ گھما کر اس کی گردن پر مارا۔ بڑی شاندار ضرب تھی۔ ہیرا لڑکھڑا کر دور جا گرا۔ اس کے پاس پستول تھا۔ لہٰذا سب انسپکٹر نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر چھلانگ لگائی اور اسے چھاپ لیا۔ عین اس وقت میری نگاہ سرنگ کے ادھ کھلے دروازے سے اندر گئی۔ سرنگ کے اندر روشنی تھی۔ اس روشنی میں ایک سایہ سا دروازے کے پاس آیا اور پھر غلیظ گالیاں بکتا ہوا واپس اندر بھاگا۔ میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجی۔ چھٹی حس نے پکار کر کہا ''ونمالا کی جان خطرے میں ہے۔'' میں نے سانسی کا پستول عمر دراز کو تھمایا اور خود اپنا ریوالور نکال کر سرنگ کی طرف بھاگا۔ سرنگ میں قریباً بیس قدم آگے آٹھ دس زینے تھے۔ زینے اترتے ہی مجھے بائیں جانب بہت سا کاٹھ کباڑ نظر آیا۔ دروازے سے بھاگنے والا سایہ اسی کاٹھ کباڑ کے پیچھے روپوش ہوا تھا۔ میں نے بھاگتے بھاگتے دو ہوائی فائر کیے اور چیخ کر کہا ''خبردار'' میرے یہ ہوائی فائر ونمالا کی زندگی بچا گئے۔ چوتھا سانسی جو ونمالا کو قتل کرنے کے لیے اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ ایک لمحے کے لیے ٹھٹکا اور اس دوران میری تیسری گولی نے اس کے سینے پر بوسہ دے دیا...... یہ موت کا بوسہ تھا۔ وہ اپنی چمکدار پھل والی کلہاڑی سمیت پشت کے بل ونمالا کے پاس گرا۔ ونمالا چیخ کر دیوار کے ساتھ جا لگی۔ اس کی پھٹی ہوئی نظریں کبھی مجھے دیکھتی تھیں اور کبھی سانسی کے سینے پر ابلتے ہوئے خون کو۔ وہ بہت کمزور ہو چکی تھی رنگ زرد تھا اور بال بکھرے ہوئے۔ اس خستہ حلیے کے باوجود اس کے اندر سے خوبصورتی جھانک رہی تھی۔ وہ زیادہ دیر سانسی کو اپنے سامنے مرتے ہوئے نہ دیکھ سکی۔ اس نے ایک طویل آہ کھینچی اور لہرا کر فرش پر گری۔ وہ بے ہوش ہو چکی تھی میں نے اس کا سر پختہ فرش پر

ٹکرانے سے پہلے ہی ہاتھوں پر روک لیا۔

☆======☆======☆

ستار ام جاہ کا برادرِ حقیقی ہیرا گرفتار ہوا۔ یوں جوتی اور جھمکے سے شروع ہونے والی کہانی جیل کے رخ پر چل پڑی۔ مرنے والا سانسی بھی ستار ام جاہ کا ایک قریبی عزیز تھا۔ ستار ام جاہ خود روپوش ہو گیا۔ اس کم بخت نے بروقت خطرہ تاڑ لیا تھا اور ڈیرہ چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ بعد میں اس نے اپنی ضمانت کروالی...... دلچسپ اور حیران کن بات یہ تھی کہ ونمالا کے برآمد ہوتے ہی اس کا سرپرست اعلیٰ رگوناتھ منظر سے غائب ہو گیا۔ کوشش کے باوجود اس کا کچھ پتہ نہیں چلا (اسے قریباً دو ماہ بعد کراچی کے ایک تھرڈ کلاس ہوٹل سے گرفتار کیا گیا۔ وہ بیرون ملک فرار ہونے کی کوشش میں تھا) درحقیقت یہ شخص ونمالا کی آستین کا سانپ تھا۔ ونمالا اس پر بے پناہ اعتماد کرتی تھی اور اس کی موجودگی میں ونمالا نے خود کو بے فکر اور آزاد کر رکھا تھا۔ ونمالا کی والدہ بھی رگوناتھ پر مکمل بھروسہ کرتی تھیں۔ آمدن اور لین دین کا سارا حساب رگوناتھ کے پاس تھا۔ اس نے مختلف بینکوں میں دو تین اکاؤنٹ کھلوا رکھے تھے۔ ونمالا کا قریباً اسّی ہزار روپیہ ان اکاؤنٹس میں جمع تھا۔ یہ 1946ء کے لگ بھگ بہت بڑی رقم تھی لیکن ونمالا بے خبر تھی کہ اس رقم کا بہت بڑا حصہ رگوناتھ اپنے اللوں تللوں میں اڑا چکا ہے۔ اس کے علاوہ نہایت خاموشی کے ساتھ وہ پچاس ساٹھ ہزار کی پراپرٹی بھی ہضم کر چکا تھا۔ دیکھا جاتا تو خود کو مالدار سمجھنے والی ونمالا کے پاس ایک رہائشی مکان اور دس پندرہ ہزار روپے بینک بیلنس کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا۔ اس صورتِ حال میں رگوناتھ تاوان کی ادائیگی کہاں سے کرتا۔ اس نے یہی بہتر سمجھا کہ اس معاملے کو سلجھانے کی بجائے بگاڑ دے۔ اغوا کرنے والوں کو اس طرح زچ کرے کہ وہ بھڑک کر ونمالا کا قصہ ہی تمام کر دیں۔ یوں اس کے سارے کرتوتوں پر پردہ پڑ جاتا اور وہ بینک بیلنس کی بچی کھچی رقم لے کر تسلی سے کھاتا رہتا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے کرن کمار اور ونمالا کی ماں کو تمام حالات سے بے خبر رکھا اور سانسیوں کے پیغامات وصول کر کر کے پھاڑتا رہا۔ یہاں تک کہ ونمالا موت کے دہانے پر پہنچ گئی۔

ونمالا کو اپنی بھول کی بڑی کڑی سزا ملی تھی۔ وہ واقعی ایک سیلانی لڑکی تھی۔ لوگوں کو حیران کر کے اسے مزہ آتا تھا۔ یہی مزہ لینے کے لیے وہ سانسی لڑکی کا روپ دھار کر اپنے ایک ایسے پرستار کے پاس پہنچ گئی جو تصور بھی نہ کر سکتا تھا کہ فلمی اسکرین پر چمکنے والی شہزادی ایک روز اس کی بانہوں میں آ سکتی ہے...... اپنے پرستار کو ''حیران'' کرنے کے بعد وہ خود ایک بہت بڑی حیرانی کا شکار ہو گئی۔ ایک دم اس پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ چنگڑ خانہ بدوشوں نے

اسے اغوا کرلیا۔ ونمالا نے سوچا اگر اغوا کرنے والوں پر اس کی اصلیت ظاہر ہوگئی تو ہر طرف بدنامی کے جھنڈے لگ جائیں گے۔ اخباروں میں سرخیاں جم جائیں گی۔ لہٰذا وہ خاموش رہی اور خود کو ایک معمولی عورت ہی ظاہر کرتی رہی۔ اچھی اداکارہ تو وہ تھی ہی۔ اس نے اپنی بول چال سے خود کو سانسی ثابت کر دیا۔ اس کے لباس میں اپنے پرستار دیوندر پروانہ کا لکھا ہوا ایک خط بھی تھا۔ راز فاش ہونے کے خوف سے اس نے یہ خط جھونپڑے کے کچے فرش میں دبا دیا۔ جہاں سے بعد ازاں وہ میرے ہاتھ لگ گیا۔ چنگڑوں کے ڈیرے پر اسے بدسلوکی کا شکار بھی ہونا پڑا لیکن وہ ہر ''ستم'' خاموشی سے سہہ گئی۔ چند روز بعد چنگڑوں نے اپنی عورت کے بدلے اسے سانسیوں کے سپرد کر دیا۔ سانسیوں میں سے ایک خرانٹ شخص ونمالا کو بطور ایکٹرس پہچان چکا تھا اور اس نے سترام جاہ وغیرہ کو سمجھا دیا تھا کہ یہ کوئی معمولی مغویہ نہیں۔ سونے کی پوٹلی ہے۔ سترام جاہ وغیرہ اس ''سونے کی پوٹلی'' کو مقبرے کی اجاڑ سرنگ میں لے گئے اور اس کے وارثوں سے نامہ و پیام شروع کر دیا۔ بعد کے واقعات آپ جانتے ہی ہیں۔

ونمالا یہ خبر چھپانی چاہتی تھی، لیکن یہ پھیل کر رہی۔ ہر جگہ اس کے اغوا کے چرچے ہوئے بیان کرنے والوں نے بڑھا چڑھا کر اس قصے کو سنایا اور سننے والوں نے خصوصی دلچسپی سے سنا۔ بات تھی بھی دلچسپی کی۔ ایک امیر کبیر نامور لڑکی نے اپنی راہ چلتے چلتے خواہ مخواہ ''پنگا'' لیا تھا اور لوفروں، چورا چکوں میں جا پھنسی تھی...... ویسے وہ تھی واقعی خوبصورت، بلال شاہ اکثر اس کا نام لے کر آہ بھرا کرتا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ وہ اکثر اس کی فلم دیکھنے جاتا ہے پھر ایک روز تو میں سچ مچ حیران ہوگیا۔ سب انسپکٹر فرزند علی کی زبانی مجھے پتہ چلا کہ لاہور سے ایک بندہ بلال شاہ کا پتہ پوچھتے پوچھتے آیا تھا۔ بلال شاہ کو فلم ایکٹرس ونمالا دیوی نے لاہور بلایا ہے۔ وہ اس سے ملنا چاہتی ہے اور اس کی مہربانیوں کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہے۔ بلال شاہ نے اس بندے کو کہلا بھیجا ہے کہ وہ نہیں آ سکتا...... اس واقعے کے بعد بھی ونمالا کے چند پیغامات بلال شاہ کے لیے آئے لیکن ایسے معاملوں میں بلال شاہ بڑا انا آدمی تھا۔ وہ ایسا گرا پڑا نہیں تھا کہ شکریہ ''ادا کروانے'' کے لیے بھاگا بھاگا لاہور چلا آیا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اتنی ہی ''مشکور'' ہے تو خود یہاں آ جائے۔ ونمالا ایک بار جے پور آنے کا مزہ چکھ چکی تھی۔ لہٰذا وہ جے پور نہیں آئی۔ نہ ہی کبھی بلال شاہ اس سے ملنے گیا۔ بے شمار دوسرے واقعات کی طرح یہ واقعہ بھی ماضی کی گرد میں دب گیا لیکن میں جانتا تھا اور آج بھی جانتا ہوں کہ بلال شاہ کے دل میں ونمالا کے لیے ایک خاص جگہ پیدا ہوگئی تھی اور وہ اکثر اسے یاد کیا کرتا تھا۔

☆======☆======☆

پیار، پاپ اور پیٹ

وہ اُداس نوجوان کہیں دور سے بھاگ کر آیا تھا مگر حالات اُسے پھر اُسی آگ میں لے گئے جو اُس کی زندگی کو آتش کدہ بنا چکی تھی۔

میں صبح تھانے پہنچا ہی تھا کہ ایک سائل آ گیا۔ تھانے کے احاطے میں ایک سفید کار آ کر رکی۔ اس میں سے ایک ادھیڑ عمر لحیم شحیم شخص برآمد ہوا وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ دو آدمی تھے۔ ان میں سے ایک غالباً گاڑی کا ڈرائیور تھا۔ لحیم شحیم شخص نے اپنا تعارف کراتے ہوئے اپنا نام انوپ ٹینڈن بتایا۔ وہ ایک تاجر تھا شہر کے ایک معروف علاقے میں اس کی ریڈی میڈ کپڑوں کی بہت بڑی دکان تھی۔ وہ باہر سے بھی بچوں کے ریڈی میڈ کپڑے منگواتا تھا۔ شمالی امرتسر کے فیشن ایبل رہائشی علاقے میں اس کی کوٹھی تھی۔ اس نے بتایا کہ صبح سویرے اس کے بیٹے کی نئی موٹر سائیکل چوری ہو گئی ہے۔

اس کا بیٹا بھی ساتھ ہی تھا۔ وہ چوبیس پچیس سال کا ایک خوبرو جوان تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ ورزش کے شوق میں صبح سویرے اٹھ جاتا ہے آج اٹھ کر باہر جانے لگا تو گیراج میں موٹر سائیکل موجود نہیں تھی۔ اس نے گھر والوں سے پوچھا۔ کسی کو کچھ پتہ نہیں تھا۔ پڑوسیوں میں سے ایک شخص نے بتایا کہ اس نے صبح پانچ بجے کے قریب موٹر سائیکل اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی تھی۔ پانچ بجے ہمارا ہاکر اخبار پھینک کر جاتا ہے۔ وہ عام طور پر اخبار باہر سے ہی پھینک جاتا تھا۔ ان دنوں بارشیں ہو رہی ہیں اور اخبار اکثر بھیگ جاتا تھا۔ اس لیے پتا جی نے دادی جان سے کہا کہ وہ صبح پوجا کے لیے اٹھتی ہیں تو دروازہ اندر سے کھول دیا کریں تاکہ ہاکر اخبار اندر آ کر برآمدے میں رکھ سکے۔ اب روزانہ ایسا ہی ہوتا تھا۔ دادی ماں دروازہ کھول دیتی ہیں اور وہ لڑکا اخبار برآمدے میں رکھ جاتا تھا۔

آج بھی اخبار پڑا ہوا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ پانچ بجے کے قریب ہی یار محمد نامی لڑکا اندر آیا ہے۔ میری بہن شمی کا کہنا ہے کہ چند روز پہلے بھی وہ لڑکا موٹر سائیکل پر جھکا ہوا کچھ کر رہا تھا اسے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ شمی نے پوچھا کیا بات ہے۔ کہنے لگا، جی پٹرول گر رہا تھا

بند کیا ہے۔ شمی نے سونگھ کر دیکھا۔ پٹرول کی بو نہیں آ رہی تھی۔ اس نے اخبار لے لیا اور لڑکے کے جانے کے بعد دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ اس دن اس نے مجھ سے کہا بھی تھا کہ بھائی جان موٹر سائیکل نئی ہے اندر رکھا کریں مگر میں نے توجہ نہیں دی۔

میں نے انوپ ٹینڈن کے بیان پر کچی رپورٹ لکھ لی اور دو سپاہیوں کو بھیجا کہ وہ ڈان نیوز ایجنسی والوں سے یار محمد نامی ہاکر کا پتہ کریں۔ میری توقع کے برخلاف دونوں سپاہی صرف آدھ گھنٹے بعد یار محمد کو لے کر تھانے پہنچ گئے۔ وہ ایک اٹھارہ انیس سالہ لڑکا تھا۔ پتلون قمیص پہن رکھی تھی۔ آنکھوں میں ذہانت کی چمک تھی مگر چہرہ بیماروں جیسا تھا۔ شاید تھانے بلائے جانے کے خوف سے بیمار لگ رہا تھا۔ اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور جھکی جھکی نظروں کے ساتھ میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔ یا تو وہ چور تھا یا بہت ڈرا ہوا تھا۔ میں نے اس کا نام پتہ پوچھا۔ اس نے دہلی کے قریب کسی جام پور قصبے کا نام بتایا۔ مزید تفصیل بتاتے ہوئے اس نے کہا کہ وہ یہاں امرتسر میں اپنے ایک دور کے رشتے دار کے ہاں رہتا ہے۔ صبح کالج جاتا ہے شام کو ٹیوشن پڑھتا ہے اور صبح سویرے اخبار بیچتا ہے۔

میں نے کہا۔ ''یار محمد! صبح جو موٹر سائیکل تم نے انوپ صاحب کی کوٹھی سے اٹھائی ہے وہ کہاں ہے؟''

اس کا رنگ مٹی کی طرح زرد نظر آنے لگا۔ ہکلا کر بولا۔ ''انسپکٹر صاحب! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں یہ سراسر الزام ہے۔''

میں نے کہا۔ ''تم کوئی نئی بات نہیں کر رہے ہو۔ ہر چور کو یہ فقرہ ازبر ہوتا ہے۔''

یار محمد واویلا کرنے لگا کہ وہ غریب آدمی ہے۔ محنت مزدوری سے روٹی کماتا ہے۔ اس کی سات پشتوں میں سے کوئی چور نہیں تھا وغیرہ وغیرہ۔

اتنے میں نیوز ایجنسی کا مالک اور وہ رشتے دار بھی آ گیا جس کے پاس یار محمد رہتا تھا۔ میں نے ان سے کہا کہ لڑکے کی خیریت چاہتے ہو تو مسروقہ مال برآمد کروا دو ورنہ سب کو رگڑا لگے گا...... میرے ڈرانے دھمکانے کے باوجود کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ یار محمد نے اعتراف کیا کہ وہ پانچ بجے کے قریب کوٹھی میں اخبار رکھنے داخل ہوا تھا مگر اس نے موٹر سائیکل کی طرف آنکھ بھی نہیں اٹھائی۔ اس نے کہا کہ موٹر سائیکل اس وقت تک موجود تھی۔

یار محمد کے بارے میں جو چیز مجھے زیادہ شک میں مبتلا کر رہی تھی وہ یہ تھی کہ وہ اخبار سائیکل پر لے کر آتا تھا مگر پچھلے چار پانچ روز سے وہ پیدل آ رہا تھا۔ سوچا جا سکتا تھا کہ ایسا اس نے چوری کے منصوبے کے پیش نظر کیا ہے۔ جبکہ یار محمد اور اس کے رشتے دار کا کہنا تھا

کہ سائیکل چند روز سے خراب پڑی ہے۔ میں اس واقعے کو زیادہ طول نہیں دینا چاہتا۔ ورنہ اصل کہانی کے لیے صفحات کم بچیں گے۔ قصہ مختصر میں نے حوالدار حشمت سے کہا کہ وہ یار محمد کو لے جا کر تھوڑی سی ''یاری'' نبھائے۔ حشمت نے حوالات میں لے جا کر دس پندرہ منٹ میں اس کے سارے کس بل نکال دیے۔ وہ اسے دوبارہ میرے سامنے لایا تو یار محمد بری طرح لرز رہا تھا اور زار و قطار رو رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''ہاں بھئی! کچھ بتاتے ہو یا ابھی اور گلاب جامن کھانے ہیں۔'' مار پیٹ کو حوالدار حشمت گلاب جامن کہا کرتا تھا۔ یار محمد نے کہا۔

''انسپکٹر صاحب! میں آپ سے اکیلے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔''

میں نے محسوس کیا کہ وہ انوپ کمار اور اس کے بیٹے سے کچھ چھپانا چاہتا ہے۔ میں نے حوالدار سے کہا وہ ملزم کو حوالات میں لے جائے میں ابھی تھوڑی دیر میں اس سے بات کروں گا۔ ملزم چلا گیا تو میں نے بیانات لینے کے بعد دونوں پارٹیوں کو واپس بھیج دیا۔

☆======☆======☆

کوئی ایک گھنٹے بعد میں حوالات میں ملزم سے سوال جواب کر رہا تھا۔ آس پاس کوئی نہیں تھا۔ ہم دونوں لکڑی کے اسٹولوں پر بیٹھے تھے۔ بلب کی روشنی میں مَیں پہلی بار غور سے یار محمد کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بے پناہ مردانہ کشش تھی۔ ڈیل ڈول بھی اچھا تھا۔ اگر اس کا تعلق کسی کھاتے پیتے گھرانے سے ہوتا۔ جسم پر اچھا لباس اور چہرے پر صحت مندی کی چمک ہوتی تو راہ چلتی عورتیں اس پر جان دیتیں۔ یار محمد کہہ رہا تھا۔

''انسپکٹر صاحب! میں غریب اور لاوارث ہوں۔ سچی بات بھی کروں گا تو جھوٹ ہی لگے گی۔ مگر میری جو بے عزتی ہو چکی ہے اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی۔ اس لیے میں اب کچھ نہیں چھپاؤں گا۔ انوپ صاحب کی لڑکی شمی مجھے برائی پر اکساتی تھی۔ یہ چکر پچھلے تین چار مہینے سے چل رہا ہے۔ میں صبح پانچ بجے کے قریب اخبار پھینکنے جاتا تھا۔ شمی اس وقت پائجامہ بوشرٹ پہنے اپنے گھر کی گراؤنڈ میں ورزش کر رہی ہوتی تھی۔ کبھی کبھی اس کا بھائی بھی ساتھ ہوتا تھا مگر اکثر وہ اکیلی ملتی تھی۔ مجھے اس وقت جلدی ہوتی تھی مگر وہ دیوار کی دوسری جانب سے خواہ مخواہ کوئی بات چھیڑ دیتی تھی۔ پھر اس نے مجھے پھول دینے شروع کر دیے۔ کبھی کوئی شرارت کر دیتی اور دیر تک ہنستی رہتی۔ میں اس سے جتنا دامن بچانے کی کوشش کرتا تھا وہ اتنا ہی سر چڑھتی جا رہی تھی۔ اس کی ساری حرکتیں بچگانہ تھیں۔ مجھے ڈر تھا کہ کسی دن کوئی مصیبت کھڑی نہ ہو جائے...... آخر وہی ہوا ہے جس کا ڈر تھا۔''

میں نے کہا۔ ''میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا کیا تم کہنا چاہتے ہو کہ تمہیں پھنسایا جا رہا

ہے۔''

وہ بولا۔ ''بالکل جناب...... مجھے نہیں معلوم موٹر سائیکل چوری ہوئی ہے یا نہیں لیکن شمی نے جو الزام لگایا ہے کہ چند دن پہلے میں موٹر سائیکل سے چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا بالکل غلط ہے۔ ایسا کوئی واقعہ سرے سے ہوا ہی نہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مجھے ملزم ٹھہرانے میں شمی کا بھی ہاتھ ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس نے موٹر سائیکل اپنے کسی شناسا سے خود ہی غائب کرا دی ہو اور الزام میرے سر تھوپ دیا ہو۔''

میں نے پوچھا۔ ''لیکن ایسا ہوا کیوں؟ کیا پچھلے دنوں شمی سے کوئی خاص بات ہوئی تھی۔''

یار محمد کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ اس کی خوبصورت آنکھیں گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگیں۔ پھر اس نے حوصلہ جمع کیا اور بولا۔ ''جی ہاں! آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں کہنا نہیں چاہیے جی۔ کسی کی اولاد ہے، لیکن...... وہ بڑی لوفر لڑکی ہے۔ سات آٹھ دن کی بات ہے اتوار کا دن تھا۔ اتوار کے دن اس کا بھائی ورزش کے لیے نہیں نکلتا اس لیے وہ بڑی دلیر نظر آ رہی تھی۔ میں اندر اخبار رکھنے گیا تو پچھلے لان کی طرف سے آ گئی۔ کہنے لگی۔

''اخبار بیچتے ہو یا اخباروں میں تھوڑی بہت واقفیت بھی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''ہاں تھوڑی بہت ہے۔''

کہنے لگی۔ ''یہ ایک تصویر ہے میری سہیلی کی چھپوا دو۔''

میں نے دیکھا یہ ایک لڑکی کی بڑی بیہودہ تصویر تھی۔ اس نے شاید کسی انگریزی رسالے سے کاٹی تھی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ شرارت سے مسکرانے لگی۔ میں نے کہا۔

''آپ پڑھی لکھی ہیں آپ کو ایسا مذاق کرتے ہوئے شرم آنی چاہیے۔''

اس نے کہا۔ ''شرم تو ساری تم جیسے لڑکے لے گئے۔ ہم بیچاری لڑکیوں کے لیے کچھ بچا ہی نہیں۔''

میں اسے گھور کر واپس جانے لگا تو اس نے پیچھے سے قمیض پکڑ لی اور بولی۔ ''نخرے بڑے ہیں تمہارے۔ اتنی بڑی بڑی باتیں کرتے ہو اور اتنی چھوٹی سی تصویر نہیں چھپوا سکتے۔'' اس کی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔

میں نے کہا۔ ''ایسا کرو اپنے پتا جی کو دے دو، وہ بڑے آدمی ہیں کہیں نہ کہیں چھپوا دیں گے۔''

ایک دم اس کا رنگ بدل گیا۔ کچھ دیر مجھے گھورتی رہی پھر بولی۔ ''بڑی مرچیں لگ گئی

ہیں تمہیں۔ تمہاری کیسی لگتی کی تصویر تو نہیں۔''

میں نے کہا۔ ''میری ایسی کوئی لگتی ہو تو کھڑے کھڑے گولی مار دوں۔''

اس نے مجھے ''بیہودہ بدتمیز'' کہا اور پاؤں پٹختی ہوئی چلی گئی۔ میں نے سوچا کہ مہینہ پورا ہوتے ہی یہاں اخبار دینا چھوڑ دوں گا لیکن مہینہ پورا ہونے سے پہلے یہ معاملہ ہوگیا۔''

میں نے یار محمد کی ساری رُوداد غور سے سنی۔ کچھ سوالات بھی پوچھے۔ اچھی طرح سوچنے سمجھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اس کی باتوں میں جھوٹ کی آمیزش نہ ہونے کے برابر ہے۔ قصور یقیناً اسی لڑکی کا تھا۔ وہ کم عمر ہونے کے علاوہ جذباتی اور بے وقوف بھی تھی۔ ٹین ایجرز سے ایسی غلطیاں ہو ہی جاتی ہیں۔ قارئین کے ذہن میں سوال اٹھ سکتا ہے کہ کھاتے پیتے گھرانے کی ایک لڑکی نے ایک ہاکر سے ہی نظر کیوں لڑائی۔ اس ''کیوں'' کا کسی کے پاس کوئی جواب نہیں۔ جب سے دنیا بنی ہے اس کیوں کا معمہ حل نہیں ہو سکا اور شاید کبھی نہ ہو۔ ان آنکھوں کے معاملات باقی سارے جسم سے جدا ہوتے ہیں۔ یہ وہیں لڑتی ہیں جہاں انہیں نہیں لڑنا چاہیے اور وہی دیکھتی ہیں جو دیکھنا ان کے لیے منع ہوتا ہے۔ یہ شمی نامی لڑکی بھی جو چال چلن کی کچھ زیادہ اچھی نہیں لگتی تھی ہاکر یار محمد سے معاملہ بنا رہی تھی۔ یار محمد نے جس قدر بے رُخی دکھائی تھی وہ اتنا ہی بے چین ہوگئی تھی اور نہ صرف اپنے لیے بلکہ یار محمد کی عزت کے لیے بھی خطرہ بن گئی تھی۔ عین ممکن تھا کہ اس نے واقعی اپنے بھائی کی موٹر سائیکل کسی دوسرے شناسا کے ہاتھوں چوری کروا دی ہو اور اگر ایسا نہیں ہوا تھا تو بھی اس نے موقع سے پورا فائدہ اٹھایا تھا اور موٹر سائیکل چوری ہونے پر شبہات کا رخ یار محمد کی طرف موڑ دیا تھا۔ بے وقوف نے یہ بھی نہیں سوچا تھا کہ اس طرح بات اس کے اپنے اوپر بھی آ سکتی ہے۔

موقع واردات دیکھنے کے بہانے میں اسی روز انوپ کمار ٹینڈن کی کوٹھی پر پہنچا۔ کوٹھی تین چار کنال میں تھی۔ لان کافی وسیع تھا، اصل عمارت مین گیٹ سے کافی ہٹ کر تھی۔ میں نے اہل خانہ سے سوالات کیے۔ شمی بھی وہاں موجود تھی۔ وہ خاصی خوبصورت لڑکی تھی۔ شباب اس کے لباس سے پھوٹا پڑ رہا تھا۔ فرسٹ ایئر کی طالبہ تھی۔ وہ چہرے مہرے سے بہت چالاک نظر آتی تھی۔ اس پارے کی طرح مچلتی لڑکی کو دیکھ کر یار محمد کی پارسائی اور شرافت کی تعریف کرنے کو دل چاہتا تھا۔ لڑکی نے وہی بیان دیا جو اس سے پہلے اس کا باپ اور بھائی دے چکے تھے۔ ابھی میں کوٹھی ہی میں تھا کہ موٹر سائیکل کا معمہ حل ہوگیا۔ تھانے سے ایک اے ایس آئی موٹر سائیکل پر آیا اور اس نے بتایا کہ چوری شدہ موٹر سائیکل نہر کے پاس سے مل گیا ہے۔ ملزم بھی گرفتار ہوگیا تھا۔ یہ ایک پرانا وارداتیا تھا۔

☆======☆======☆

کہنے کو یہ کیس ختم ہوگیا لیکن حقیقت میں ہوا نہیں۔ تھانے واپس آ کر جب میں ملزم کو رہا کرنے کے لیے کاغذی کارروائی کر رہا تھا ایک چیز دیکھ کر بری طرح چونک گیا۔ میں نے یار محمد کو ایک جگہ دستخط کرنے کے لیے کہا۔ جب وہ دستخط کر رہا تھا میری نگاہ اس کی انگلی پر پڑی۔ اس کی انگلی میں ایک انگوٹھی تھی۔ یہ انگوٹھی اس سے پہلے بھی میں اچھی طرح دیکھ چکا تھا۔ انگوٹھی سونے کی تھی۔ تین اطراف پتیاں سی بنی ہوئی تھیں۔ درمیان میں ایک پھول تھا۔ اس میں چھوٹے چھوٹے دو سفید اور دو سرخ نگ تھے۔ اس انگوٹھی کا تعلق کسی سنگین واردات سے تھا؟ میں نے ذہن پر زور دیا اور اچانک سب کچھ یاد آگیا چند لمحوں کے لیے میں سناٹے میں رہ گیا۔ اب سے کوئی چار سال پہلے جب میں سہارنپور میں تھا ایک الہ آبادی سیٹھ سچدیو رائے کے گھر ڈکیتی کی واردات ہوئی تھی۔ ڈاکو اہل خانہ کو باندھ کر سارا سامان لوٹ لے گئے تھے۔ سچدیو رائے گولی لگنے سے زخمی ہوا تھا اور بعد ازاں ہسپتال میں چل بسا تھا۔ اس واردات میں قیمتی زیورات بچ گئے تھے کیونکہ یہ آہنی سیف کے ایک پوشیدہ خانے میں پڑے تھے۔ صرف وہی زیور گیا تھا جو سچدیو رائے کی پتنی واردات کے وقت پہنے ہوئے تھی۔ اس میں ''طلائی چوڑیاں، ایک انگوٹھی اور جھمکے'' تھے جو انگوٹھی گئی تھی وہ بالکل اسی ڈیزائن کی تھی۔ کیونکہ اس طرح کی ایک اور انگوٹھی سیف میں موجود تھی۔ جیسا کہ سب جانتے ہیں زیورات سیٹ کی صورت میں بنائے جاتے ہیں اور ہر سیٹ کا ایک خاص ڈیزائن ہوتا ہے۔ سچدیو کی پتنی نے ہمیں وہ انگوٹھی خاص طور پر دکھائی تھی اور بتایا کہ ڈاکو جو انگوٹھی لے گئے ہیں وہ اس ڈیزائن کی ہے۔ تفتیش کے لیے وہ انگوٹھی میں نے سچدیو رائے کی پتنی سے لے لی تھی۔ کئی ماہ یہ انگوٹھی میری الماری کے دراز میں پڑی رہی تھی اور میں نے بارہا اسے دیکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بھولی بسری یاد ذہن میں تازہ ہوگئی تھی۔ اس کیس میں مَیں نے بڑی محنت کی تھی۔ دو تین افراد گرفتار بھی کیے تھے لیکن بعد میں انہیں چھوڑنا پڑا تھا۔ کوئی اہم سراغ نہ ملنے کے بعد کیس داخل دفتر ہوگیا تھا۔

میں نے انگوٹھی کو بغور دیکھنے کے بعد یار محمد سے پوچھا۔ ''یہ انگوٹھی تم نے کیوں پہنی ہوئی ہے یہ تو عورتوں والی ہے۔''

وہ ایک دم ٹھٹک گیا اور غیر ارادی طور پر انگوٹھی چھپانے کی کوشش کی۔ میں نے سخت لہجے میں پوچھا۔ ''یہ انگوٹھی تمہاری ہے؟''

''جی ہاں...... جی نہیں۔'' اس نے ہکلا کر جواب دیا۔

"کیا مطلب...... تمہاری نہیں ہے؟"

"نہیں جی...... یہ مجھے...... ملی تھی۔"

"کس سے ملی تھی؟"

"کسی سے نہیں جی! راستے میں ملی تھی۔"

"کس راستے سے؟"

اس نے بتایا کہ ڈھائی تین ماہ پہلے وہ اسٹیشن سے اخبار کے دفتر کی طرف آ رہا تھا کہ باغ رامانند کے پاس ایک کانجی والے کی ریڑھی کے نیچے یہ انگوٹھی پڑی تھی۔ اس کی چمک دیکھ کر وہ ٹھٹک گیا۔ انگوٹھی اٹھا کر وہ گھر لے آیا۔ دھو کر دیکھا تو سونے کی نکلی۔

مجھے یار محمد کی بات پر صرف چالیس فیصد یقین آیا اور وہ بھی اس لیے کہ اس سے پہلے اس نے کوئی بات جھوٹ نہیں کہی تھی۔ میں نے اسے زیادہ کریدنا بھی مناسب نہیں سمجھا کیونکہ اگر چار سال پہلے کے اس جرم میں اس کا کوئی ہاتھ تھا تو وہ ہوشیار ہو سکتا تھا۔ بہتر تھا کہ یہ بات یہیں ختم کر دی جائے۔ میں نے کہا۔ "اس کا مطلب ہے یہ انگوٹھی تمہارے پاس غیر قانونی ہے۔"

وہ گھبرا گیا۔ اس کا ہاتھ انگوٹھی کی طرف بڑھا شاید وہ انگوٹھی اتارنے لگا تھا۔ میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔

"اب رہنے دو لیکن آئندہ احتیاط کرنا گمشدہ چیز ملنے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اسے اپنے پاس رکھ لیا جائے۔ میں یہ رعایت تمہیں صرف اس لیے دے رہا ہوں کہ تم نے اب تک سچ بولا ہے۔" وہ سرتاپا مشکور و ممنون نظر آنے لگا۔ میں نے کہا۔ "لیکن یہ زنانہ انگوٹھی ہے کوئی بھی تم سے پوچھ سکتا ہے کہ کہاں سے لی ہے۔ بہتر ہے کہ اسے ڈھلوا کر دوسری بنوا لو۔"

وہ سعادت مندی سے سر ہلانے لگا۔ میں نے اسے شہر سے باہر نہ جانے کا پابند کر کے واپس بھیج دیا۔

اسی روز میں نے سہارنپور ٹرنک کال بک کرائی اور متعلقہ تھانے میں اپنے دوست ایس ایچ او گرودیو سنگھ سے رابطہ قائم کر کے اسے تمام کہانی سنائی۔ اس نے کسی خاص دلچسپی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ بہرحال میں نے اسے کہا کہ وہ سورگ باسی سچدیو رائے کے اہل خانہ سے رابطہ قائم کرے اور ان سے پوچھے کہ کیا وہ دوسری انگوٹھی ان کے پاس موجود ہے......

تیسرے چوتھے روز ایس ایچ او گرودیو سنگھ کا ٹیلیفون آیا۔ اس نے بتایا کہ وہ سیٹھ کی پتنی سے خود جا کر ملا تھا۔ ان کے پاس وہ دوسری انگوٹھی ابھی تک موجود ہے۔ وہ ایک کانسٹیبل کے

ہاتھ وہ انگوٹھی روانہ کر رہا ہے...... اس خبر سے مجھے خوشی ہوئی۔ اسی روز شام کو گرودیو کا بھیجا ہوا کانسٹیبل بمعہ انگوٹھی پہنچ گیا۔ انگوٹھی دیکھتے ہی مجھے یقین ہو گیا کہ میرا اندازہ درست ہے۔ بہرحال اگلے روز میں نے یار محمد کو تھانے بلایا اور اس کے ہاتھ کی انگوٹھی دیکھ کر تصدیق کر لی کہ یہ دونوں ایک ہی ڈیزائن اور وزن کی انگوٹھیاں ہیں۔

اس تصدیق کے بعد ضروری ہو گیا کہ میں یار محمد کی نگرانی کرواؤں۔ اگر اس نے جھوٹ بولا تھا اور وہ انگوٹھی اسے راستے سے نہیں ملی تھی تو وہ اس چار سال پرانی واردات کے بارے بہت کچھ بتا سکتا تھا۔ یار محمد کی نگرانی کے لیے میں نے پرانے پاپی بلال شاہ کا انتخاب کیا۔ ان دنوں وہ کھا کھا کر بہت موٹا ہو رہا تھا۔ مزاج تو اس کا ویسے بھی ہر وقت آسمان پر رہتا تھا لیکن اس کی ایک خوبی تھی۔ میں صرف اسے یہ بتا دیا کرتا تھا کہ بلال شاہ فلاں کام کرنا ہے۔ کام کرنے کا راستہ اور ڈھنگ وہ خود ڈھونڈ لیا کرتا تھا۔ اسے دوسرے مخبروں کی طرح صبح و شام لیکچر نہیں دینے پڑتے تھے۔ اس دفعہ میں نے اسے بلا کر ساری بات سمجھا دی اور گائیڈڈ میزائل کی طرح یار محمد کے پیچھے لگا دیا۔

بلال شاہ نے چوتھے پانچویں روز مجھے پہلی رپورٹ دی۔ اس نے بتایا کہ اس نے چھاپے خانے میں واقفیت نکال کر ہاکری شروع کر دی ہے۔ روز صبح سویرے چھاپے خانے جاتا ہے دس روپے کے اخبار لاتا ہے۔ ان میں سے خود بخود کوئی بک جائے تو بک جائے ورنہ آدھے اخبار گھر میں رکھ لیتا ہے اور آدھے جا کر یار محمد کو بک اسٹال پر دے آتا ہے۔ اس طرح یار محمد سے میل جول کا بہانہ ملا ہوا ہے۔ میں سمجھ گیا کہ بلال شاہ دس روپے روزانہ کا بل مجھ پر ڈال رہا ہے مگر مجھے یہ بھی پتہ تھا کہ یہ بل جھوٹا نہیں ہے۔ اس سلسلے میں مجھے بلال شاہ پر اعتماد تھا۔ بلال شاہ نے یہ اہم اطلاع دی کہ یار محمد اور انوپ کی لڑکی شمی کا معاملہ ابھی ختم نہیں ہوا۔ بلکہ کہنا چاہیے کہ اور بھڑک گیا ہے۔

میں نے پوچھا۔ "وہ کیسے؟"

بلال شاہ نے بتایا۔ "سچی بات چھپی نہیں رہتی جی! یار محمد نے انوپ کے گھر اخبار دینا چھوڑ دیا ہے۔ اب تو وہ اس علاقے میں ہی نہیں جاتا، مگر دوسری پارٹی بڑی تیز نکلی ہے؟"

"دوسری پارٹی کون؟"

"وہی انوپ کی لڑکی جی! پرسوں کی بات ہے وہ یار محمد کے بک اسٹال پر جا پہنچی۔ بک سٹال پر یار محمد کا کوئی بزرگ رشتے دار بیٹھتا ہے۔ اس کے سامنے ہی وہ یار محمد کو کھینچ کر اپنے ساتھ لے گئی۔ ایک ہوٹل میں جا کر اس نے چائے وغیرہ منگوائی اور یار محمد کے سامنے رونے

لگی۔ کہنے لگی کہ اس سے بڑی زیادتی ہوئی ہے، وہ معافی مانگنا چاہتی ہے...... وہ کسی طرح یار محمد کی جان نہیں چھوڑ رہی تھی۔ یار محمد نے کہا اچھا بی بی! میں نے معاف کیا میرے خدا نے معاف کیا۔ بڑی مشکل سے وہ رسہ تڑا کر وہاں سے نکلا۔ مگر یہ بات چھپی نہ رہ سکی۔ شمی کے بھائی کے ایک دوست نے ان دونوں کو دیکھ لیا اور جا کر اس کے بھائی کو بتا دیا۔ بھائی آگ بگولا ہو گیا۔ وہ اسی وقت یار محمد کے بک سٹال پر پہنچا۔ اسے لے کر ایک پارک میں چلا گیا۔ وہاں ان دونوں میں خوب تُو تُو میں میں ہوئی۔ شمی کے بھائی نے یار محمد کو خطرناک نتائج کی دھمکیاں دیں اور کہا کہ اگر وہ خیریت چاہتا ہے تو شہر چھوڑ کر چلا جائے۔"

میں نے بلال شاہ سے کہا کہ اسے یہ ساری باتیں کیسے معلوم ہوئیں۔ وہ گردن اکڑا کر بولا۔ "ہزار بار کہا ہے مجھے ایویں شیویں شے نہ سمجھا کریں۔ بڑا تِکھا ہوں میں ورمے کی طرح گھس جاتا ہوں ہر طرح کی لکڑی میں۔ یار محمد اپنی پیدا کرنے والی پر اتنا بھروسہ نہیں کرے گا۔ جتنا آج کل مجھ پر کر رہا ہے۔"

میں نے کہا۔ "ہاں بھئی ماننا پڑتا ہے، مامتا تو بہت ہے تمہارے اندر کتے پر بھی ہاتھ پھیرو تو تمہاری گود میں آلیٹتا ہے۔" بلال شاہ اس تعریف پر خوش ہو گیا میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے، جو بھی کر رہے ہو پوری دلجمعی سے کرو۔ اپنے اس بچے سے یہ بھی پوچھو کہ انگوٹھی اس نے کہاں سے لی ہے اور کب سے اس کے پاس ہے۔"

بلال شاہ نے کہا۔ "پوچھا تو تھا لیکن وہ کنی کترا رہا ہے کافی خچرا ہے۔"

میں نے کہا۔ "کبھی کبھی تو شک ہوتا ہے کہ شاید موٹر سائیکل کی چوری میں بھی اس کا ہاتھ تھا۔"

بلال شاہ نے پوچھا۔ "چور کیا کہتا ہے؟"

میں نے بتایا کہ فی الحال تو کچھ نہیں کہتا، مگر ہو سکتا ہے آگے چل کر بتا دے۔ ویسے وہ بھی اس محلے میں رہتا ہے جہاں یار محمد کا بک سٹال ہے۔

بلال شاہ نے کہا۔ "خاں صاحب! مجھے تو نہیں لگتا کہ یار محمد ایسا کام کر سکتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "لگنے کو تو یہ بھی نہیں لگتا کہ تم گیارہ بچوں کے باپ ہو اور اب بھی ہاتھ چالاکی سے باز نہیں آتے...... تم اپنے اندازوں کو چھوڑو بس وہ کام کرو جو تمہیں کہا گیا ہے یعنی یار محمد کی نگرانی۔"

بلال شاہ نے پوری توجہ سے ذمے داری نبھانے کا وعدہ کیا اور واقعی اتنے خشوع خضوع سے نگرانی کی کہ تیسرے ہی روز یار محمد کو اغوا کرا دیا...... اس روز بلال شاہ ہانپا ہوا میرے پاس

پہنچا۔ اس نے بتایا کہ یار محمد کو کچھ لوگ اٹھا کر لے گئے ہیں۔ اس کا کچھ پتہ نہیں چل رہا۔ ابھی بلال شاہ اس واقعے کی تفصیلات ہی بتا رہا تھا کہ یار محمد کے وارث بھی پہنچ گئے۔ ایک تو وہی رشتے دار تھا جس کے گھر یار محمد رہتا تھا۔ اس کا نام معظم تھا۔ دوسرا معظم کا کوئی چچیرا پھوپھیرا بھائی تھا۔ اس کے علاوہ محلے کی اصلاح کمیٹی کا چیئرمین اور دو تین معززین تھے۔ معظم نے بتایا کہ ابھی کوئی ایک گھنٹہ پہلے مغرب کی اذان کے وقت ایک شخص نے دروازے پر دستک دی اور کہا کہ وہ یار محمد سے ملنا چاہتا ہے۔ یار محمد نے اس شخص سے مصافحہ کیا۔ دونوں کچھ دیر کھڑے باتیں کرتے رہے۔ پھر یار محمد نے کہا کہ وہ بازار تک جا رہا ہے ابھی واپس آ جاتا ہے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ اس کے ساتھ جائے۔ میں نے کہا۔ جو بات کرنی ہے بیٹھک میں بیٹھ کر لو۔ مگر وہ چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد بازار کے ایک دو آدمیوں نے آ کر اطلاع دی کہ یار محمد کو کچھ لوگ ٹیکسی میں ڈال کر لے گئے ہیں۔

معظم کے بیان کی تصدیق دوسرے افراد نے بھی کی۔ انہوں نے بتایا کہ ٹیکسی میں تین آدمی تھے اور ان میں سے کسی کو بھی پہلے اس محلے میں نہیں دیکھا گیا۔ ایک سبزی فروش نے بتایا کہ اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ یار محمد اپنی مرضی سے ان کے ساتھ گیا ہے۔ وہ سارا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ انہوں نے یار محمد کو دھکیل کر ٹیکسی میں پھینکا اور پلک جھپکتے میں گاڑی چلا کر بازار کے موڑ سے غائب ہو گئے...... اس اغوا کے سلسلے میں دھیان سید ھاشمی کے گھر والوں کی طرف جاتا تھا۔ چند روز پہلے بھی شمی کا بھائی اسی طرح یار محمد کو بک سٹال سے اپنے ساتھ لے گیا تھا اور دھمکیاں وغیرہ دی تھیں لیکن دوران تفتیش کسی بھی امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا کہ یار محمد سرے سے اغوا ہی نہ ہوا ہو۔ لوگوں کے ذہنوں میں پہلے سے کوئی خدشہ ہو تو وہ معمولی واقعے کو بھی "خطرناک" رنگ دے دیتے ہیں۔ ہو سکتا تھا وہ یونہی دوستوں کے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھ کر چلا گیا ہو۔

بہر حال اگلے چوبیس گھنٹوں میں ہمارے بہت سے اندازے غلط ثابت ہو گئے۔ یار محمد واقعی اغوا ہو چکا تھا۔ میں نے شمی کے باپ بھائی اور ایک دو عزیزوں سے پوچھ گچھ کی۔ شمی کا بھائی تو سات آٹھ گھنٹے تھانے میں بھی رہا لیکن ان ساری کوششوں کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ یہ لوگ یار محمد کے اغوا سے بالکل انکاری تھے۔ شمی کے بھائی کا کہنا تھا کہ اس نے چند روز پہلے یار محمد کو گراؤنڈ میں لے جا کر اس سے بات چیت کی تھی اور یہ بھی درست ہے کہ اسے وارننگ دی تھی لیکن اس کے بعد کوئی واقعہ ہی نہیں ہوا تو انہیں کیا مصیبت پڑی تھی اسے اغوا کرنے کی۔ میں نے بلال شاہ کو بلایا اور تنہائی میں اس سے بھی سوالات کیے۔ بلال شاہ نے کہا۔

"خان صاحب! میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے پچھلے دو تین دنوں میں کوئی نیا واقعہ نہیں ہوا۔ پھر شمی کے گھر والوں کو کیا ضرورت تھی ایسا قدم اٹھانے کی۔"

میں نے کہا۔ "تم یار محمد کے اتنا قریب رہے ہو۔ تمہارا کیا خیال ہے اس کے دل میں بھی شمی کا خیال تھا؟"

بلال شاہ بولا۔ "دل کے معاملے تو اللہ ہی جانتا ہے مگر میرا خیال ہے کہ یار محمد اور ٹائپ کا لڑکا ہے وہ شمی کے اس کھیل میں شریک نہیں تھا۔"

میں سخت پریشانی میں تھا۔ لڑکے کا غائب ہونا معمولی بات نہیں تھی اور اس سے بھی بڑی بات یہ تھی کہ اس کے ہاتھ میں وہ انگوٹھی تھی جو جلد یا بدیر مجھے اس چار سالہ پرانی واردات کا سراغ دے سکتی تھی۔ میں سوچنے لگا کیا ہی اچھا ہوتا میں اس معاملے کو زیادہ طول نہ دیتا۔ نگرانی کی بجائے یار محمد سے براہ راست پوچھ گچھ بھی کی جا سکتی تھی۔ ضرورت پڑتی تو حوالدار حشمت سے بھی مدد لی جا سکتی تھی۔ بہر حال اب لکیر پیٹنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا، جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔

مجھے ایک شک یہ بھی تھا کہ ہو سکتا ہے اس واردات کا تعلق یار محمد کے ماضی سے ہو۔ میں نے یار محمد کے رشتے دار معظم سے کرید کرید کر سوال کیے اور یار محمد کے بارے میں معلومات اکٹھی کرنے کی کوشش کی۔ یہ تو میں جان ہی چکا تھا کہ یار محمد کسی وجہ سے ناراض ہو کر اپنا گھر چھوڑ چکا ہے اور واپس جانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ نہ ہی اس کے والدین میں سے کوئی بھی اس کی خیر خبر پوچھنے آیا تھا۔ بس کبھی کبھار اس کے چھوٹے بھائی کا خط آتا تھا جس کا جواب وہ کبھی دیتا تھا اور کبھی نہیں۔ معظم مجھے یہ بھی بتا چکا تھا کہ جام پور میں یار محمد کا والد ولی محمد ایک کلرک ہے اور وہ لوگ مشکل سے سفید پوشی قائم رکھے ہوئے ہیں۔ اس سے زیادہ معظم کو کچھ معلوم نہیں تھا یا وہ بتانا نہیں چاہتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ولی محمد اور اس کے گھرانے سے ان کے تعلقات دیر ہوئی ختم ہو چکے ہیں لہٰذا ان کے بارے میں اسے زیادہ کچھ معلوم نہیں......

اب یار محمد کے اغوا ہونے کے بعد میں نے اس پر زور دے کر پوچھا تو اس نے بتایا کہ یار محمد کے گھر سے بھاگنے کی وجہ کوئی عورت تھی۔ وہ اس کے چکر میں پھنس گیا تھا۔ یہ چکر کافی لمبا ہو گیا۔ یار محمد پر ہر طرف سے لعنت ملامت ہوئی تو وہ گھر بار چھوڑ کر جام پور سے یہاں امرتسر چلا آیا...... معظم سے بات چیت کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے خود دہلی جانا چاہیے تاکہ ٹھیک ٹھیک حالات معلوم ہو سکیں...... میں نے تھانے میں اپنے ضروری کام نبٹائے سب

انسپکٹر کو چارج دیا اور دو تین دن میں جانے کی تیاری مکمل کر لی۔ سب انسپکٹر حیران تھا کہ میں اغوا کے ایک کیس کو اتنی اہمیت کیوں دے رہا ہوں۔ اس کا خیال تھا کہ کسی اے ایس آئی کو اس کام پر بھیج دینا چاہیے تھا۔ اسے اس انگوٹھی کے بارے میں معلوم نہیں تھا جو میں یار محمد کی انگلی میں دیکھ چکا تھا اور جس نے میری نیند حرام کی ہوئی تھی۔

میں امرتسر سے براستہ انبالہ، دہلی اور وہاں ایک رات ٹھہرنے کے بعد جام پور نامی اس قصبے میں پہنچ گیا۔ یار محمد اس قصبے کا رہنے والا تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ زیادہ تر عمارتیں قدیم طرز کی تھیں۔ ان نانک چندی عمارتوں کے آگے بوسیدہ چھجے تھے اور گلیاں تنگ و تاریک تھیں۔ قصبے کے گرد ایک ٹوٹی پھوٹی فصیل بھی تھی۔ میں سیدھا قصبے کے تھانے میں پہنچا اتفاقاً ایس ایچ او مسلمان تھا۔ وہ بڑی خوش اخلاقی سے ملا اور ہر طرح سے تعاون کا یقین دلایا۔ میں نے اس سے یار محمد کے باپ ولی محمد کے بارے میں پوچھا۔ اس نے بتایا کہ ولی محمد چھاتا گلی کا رہنے والا ہے اور وہ اس کے بارے میں اچھی طرح جانتا ہے۔ اس نے فوری طور پر ایک آدمی کو بھیجا اور وہ چھاتا گلی کے ایک مخبر کو لے آیا۔ اس مخبر کا نام صادق تھا۔ کافی ہوشیار شخص تھا۔ علاقے کے ہر شخص کے بارے میں اسے معلومات حاصل تھیں...... ہم کھانا وغیرہ کھا کر فارغ ہو چکے تھے۔ اطمینان سے بیٹھ گئے اور صادق ہمیں دل محمد اور اس کے گھرانے کے متعلق بتانے لگا۔

اس کی باتوں سے پتہ چلا کہ ولی محمد پٹوار خانے میں کلرک ہے۔ اسے نشے کی بہت پرانی لت ہے، ہر طرح کا نشہ کرتا ہے اور بیوی کو مارتا پیٹتا ہے۔ اپنے بڑے بیٹے یار محمد سے وہ پیار کرتا تھا لیکن یار محمد نے کبھی اسے اچھا نہیں سمجھا وہ چاہتا تھا کہ کھانے کمانے کے قابل ہو جائے تو ماں کو لے کر کہیں چلا جائے۔ وہ نویں جماعت میں پڑھتا تھا اور میٹرک پاس کرنے کے بعد دہلی کالج میں داخلہ لینے کا ارادہ رکھتا تھا۔ مگر اسی دوران اس کی زندگی میں ایک زبردست تبدیلی آئی۔ محلے کے ایک شخص عبدالستار کی شادی ہوئی۔ عبدالستار کی دلہن ثریا بہت خوبصورت تھی۔ عبدالستار کا چوبارہ ولی محمد کے چوبارے سے ملا ہوا ہے اور دونوں گھرانوں کا ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا ہے۔ یار محمد کی عمر اس وقت مشکل سے چودہ پندرہ سال تھی وہ آزادانہ عبدالستار کے گھر میں آتا جاتا تھا۔ ثریا سے اسے بہت لگاؤ ہو گیا۔ ثریا بھی اسے بچوں کی طرح لاڈ کرتی تھی۔ وہ ہر وقت ثریا کے گھر گھسا رہتا تھا۔ اس کے کام کاج کرتا تھا۔ ستار سے بھی اس کی گاڑھی چھنتی تھی۔ وقت گزرتا رہا۔ دھیرے دھیرے قصبے کی بڑی بوڑھیاں انگلیاں اٹھانے لگیں انہیں یار محمد کا اس طرح ثریا سے چمٹے رہنا پسند نہیں تھا۔ یار محمد کے گھر

والوں نے بھی اسے سمجھایا بجھایا لیکن جب وہ باز نہیں آیا تو اسے دہلی اس کے ماموں کے پاس بھیج دیا گیا۔ دوسری طرف ستار کو بھی سمجھایا گیا کہ وہ اپنی بیوی کو اتنی آزادی نہ دے۔ وہ ہر وقت چوبارے میں کھڑی اڑوس پڑوس والوں سے باتیں کرتی رہتی ہے اور اپنا آپ دکھانے کا شوق پورا کرتی ہے۔

یار محمد کے دہلی جانے سے یہ معاملہ رفع دفع ہو گیا...... یار محمد نے دہلی میں ہی رہ کر میٹرک کیا اور کالج میں داخلہ لے لیا مگر اس دوران اس کی ماں بیمار رہنے لگی اور اس کی دیکھ بھال کے لیے یار محمد دوبارہ قصبے میں آ گیا۔ چند ماہ بیمار رہنے کے بعد یار محمد کی والدہ فوت ہو گئی۔ اسے مرنا ہی تھا۔ اسے شوہر کی بے راہ روی کا غم کھا گیا تھا۔ وہ سوکھ کر کانٹا ہو چکی تھی اور اس کے تھوک میں خون آتا تھا۔ ماں کے مرنے کے بعد یار محمد بہت دل برداشتہ ہوا۔ اس نے پڑھائی بھی چھوڑ دی۔ اب وہ ایک بار پھر ثریا کے گھر میں گھسا رہتا تھا۔ قصبے میں پھر باتیں پھیلنے لگیں۔ سب کا خیال تھا کہ یار محمد اور ثریا کا ملنا جلنا ٹھیک نہیں۔ ویسے بھی عبدالستار کام کے سلسلے میں قصبے سے باہر رہنے لگا تھا۔ اس کی غیر موجودگی میں ثریا اور یار محمد کا اندر گھس کر بیٹھے رہنا کسی کو پسند نہیں تھا۔ ثریا کا ابھی تک کوئی بچہ بھی نہیں تھا۔ بڑی بوڑھیاں ثریا کو دیکھ کر ناک بھوں چڑھاتی تھیں اور نوجوان عورتیں چپکے چپکے مسکراتی تھیں۔ ثریا ان باتوں کی کچھ زیادہ فکر نہیں کرتی تھی۔ اگر کوئی ایسی بات کہہ بھی دیتا تھا وہ چپکے سے سن لیتی تھی۔ اسی دوران ثریا کا خاوند روزگار کے سلسلے میں کراچی چلا گیا اور ثریا کی باگیں اور ڈھیلی ہو گئیں۔ کہنے کو یار محمد اور ثریا کا تعلق دیور بھابی کے تعلق سے ملتا جلتا تھا مگر شک کی گنجائش تو ہر کسی کو نظر آتی تھی۔ آخر یہ میل ملاقات رنگ لایا۔ قصبے میں ایک میلہ تھا۔ میلے کے روز شام کو پتہ چلا کہ ثریا نے یار محمد کو تھپڑ مارا ہے اور یار محمد نے نیلا تھوتھا کھا کر خودکشی کی کوشش کی ہے۔ یہ واقعہ سب کو حیران کر گیا۔ جتنے منہ تھے اتنی باتیں سننے میں آئیں۔ بہرحال جو حقیقت تھی وہ بھی چھپی نہ رہ سکی۔ پتہ چلا کہ یار محمد نے ثریا سے دست درازی کی کوشش کی تھی۔ اس واقعے نے سوئے ہوئے فتنے کو جگا دیا۔ ثریا کے خاوند کو بھی پتہ چل گیا۔ وہ پہلے ہی لوگوں کی باتیں سن سن کر بھرا ہوا تھا۔ اس خبر نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ وہ کراچی سے واپس آیا اور یار محمد کو جان سے مارنے کے درپے ہو گیا۔ یار محمد کے گھر والوں نے اسے پھر دہلی بھیج دیا۔ بڑی مشکل سے اس نئے معاملے کو دبایا گیا...... کچھ روز بعد یار محمد کے گھر والوں نے اس کی منگنی کر دی اور یہ بھی طے کر دیا کہ اسی سال شادی کر دی جائے گی۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح عشق کا بھوت یار محمد کے سر سے اتر جائے گا مگر یہ اندازہ غلط تھا یار محمد پھر قصبے میں آ گیا اور ثریا کے گھر کے گرد منڈلانے لگا۔ اس دفعہ اس کے باپ نے

اسے بہت بری طرح مارا اور وہ کئی دن ہسپتال میں رہا۔ انہی دنوں یہ اُڑتی اُڑتی خبر بھی سنی گئی کہ عبدالستار کی بیوی نے اس سے علیحدگی مانگی ہے اور کہا ہے کہ وہ اس کے گھر رہنا نہیں چاہتی۔ یہی باتیں ہو رہی تھیں جب ایک روز یار محمد خاموشی سے غائب ہو گیا...... کئی ہفتے گزر گئے اس کا کچھ پتہ نہیں چلا۔ اس کی حرکات کی وجہ سے اس کی منگنی بھی ٹوٹ گئی تھی۔ ایک دن کسی نے بتایا کہ وہ امرتسر میں اپنے کسی ددھیالی رشتے دار کے ہاں رہنے لگا ہے۔

یہ تھی یار محمد کی اب تک کی کہانی جو مخبر صادق نے مجھے سنائی...... میں نے یہ سب کچھ سننے کے بعد صادق سے پہلا سوال یہ کیا کہ ستار اور اس کی بیوی اب کہاں ہیں؟ اس نے بتایا کہ وہ یہیں قصبے میں رہتے ہیں۔ میں نے پوچھا۔

''اور اس کا باپ؟''

وہ بولا۔ ''وہ بھی یہیں ہے۔ پچھلے دنوں اس کے گھر سے ناجائز شراب برآمد ہوئی تھی اور پولیس پکڑ کر لے گئی تھی۔ چھ مہینے جیل کاٹنے کے بعد کچھ ہی روز پہلے واپس آیا ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''صادق! تم اسی محلے میں رہتے ہو نا؟ میرا مطلب ہے چھاتہ گلی میں۔''

وہ بولا۔ ''جی ہاں! میں دو برجی دروازے میں رہتا ہوں دو برجی دروازہ اور چھاتا گلی ایک ہی محلے کے دو نام ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''اب ثریا اور ستار کے حالات کیسے ہیں؟''

اس نے جواب دیا۔ ''ٹھیک ٹھاک ہیں۔ سات آٹھ روز ہوئے ستار کراچی سے آیا ہوا ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''میاں بیوی میں کوئی تازہ جھگڑا تو نہیں ہوا؟''

وہ انکار میں سر ہلانے لگا۔ پھر کچھ سوچ کر بولا۔ ''لیکن...... جھگڑے سے آپ کا کیا مطلب ہے؟''

میں نے کہا۔ ''تم میرے مطلب کو چھوڑو...... جو کچھ تمہیں پتہ ہے بتاؤ۔''

وہ گہری سانس لے کر بولا۔ ''پچھلے دنوں ڈاکیہ بھگت سنگھ مجھے ملا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ ستار کے نام کہیں سے کچھ خط آتے ہیں۔ اس میں ستار اور اس کی بیوی کے نام گندی گالیاں لکھی ہوتی ہیں۔ ستار پریشان ہے کہ یہ خط کون لکھتا ہے۔''

میرے ذہن میں پھلجھڑی سی چھوٹی۔ کہیں یہی خطوط تو نہیں تھے جن کی وجہ سے یار محمد اغوا ہوا۔ ظاہر ہے وہ خط کسی نے بھی لکھے ہوں ستار کا دھیان سب سے پہلے اپنے رقیب یار محمد ہی کی طرف گیا ہو گا۔ اسے یار محمد کا ایڈریس بھی معلوم تھا۔ ہو سکتا ہے وہ اپنے دوستوں یا

کرائے کے غنڈوں کے ساتھ وہاں پہنچا ہو اور یار محمد کو اٹھا لیا ہو۔ اگر واقعی ایسا ہوا تھا تو یار محمد کی جان بھی جا سکتی تھی...... مخبر صادق بتا رہا تھا کہ ستار سات آٹھ روز سے جام پور آیا ہوا ہے۔ واردات کو چار پانچ روز ہوئے تھے۔ اس کا مطلب تھا واردات کے دنوں میں ستار کراچی کی بجائے یہاں تھا اور خطوط کی وجہ سے پریشان بھی۔

میں نے پوچھا۔ ''کیا وہ کراچی سے آنے کے بعد قصبے سے باہر گیا ہے؟''

صادق کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔ ''میں ٹھیک سے بتا نہیں سکتا۔ وہ زیادہ تر گھر میں رہتا ہے یا کسی وقت دو برجی دروازے اپنے دوست شاہ جہاں کے پاس آ جاتا ہے۔''

میں نے صادق سے کہا کہ میں اسی وقت ستار سے ملنا چاہتا ہوں۔ ابھی ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ ایک سپاہی بھاگتا ہوا آیا۔ اس نے سیلوٹ مارنے کے بعد ایس ایچ او سے کہا۔

''جناب! ادھر چھاتا گلی میں بڑا ہنگامہ ہو گیا ہے۔ وہ یار محمد زخمی حالت میں پڑا ہے اور چیخ و پکار کر رہا ہے۔''

یہ اطلاع ہمارے لیے دھماکہ خیز تھی۔ میں نے ایس ایچ او کی طرف دیکھا وہ بولا۔

''آئیے خان صاحب! چل کر دیکھتے ہیں۔'' ہم تھانے سے نکلے۔ چھاتا گلی زیادہ دور نہیں تھی، تنگ بازاروں، بھری پُری دکانوں اور چھوٹے چھوٹے احاطوں سے گزرتے ہوئے ہم چھاتا گلی پہنچ گئے۔ چھاتا گلی ایک کٹڑی کی طرح تھی اندر داخل ہونے کے لیے نانک چندی اینٹوں کا قدیم دروازہ تھا۔ چونا، پکی دیواروں والے اونچے اونچے مکان افسردگی سے کھڑے تھے۔ عورتیں اور بچے جھانک رہے تھے۔ ان سب کی آنکھیں نیچے احاطے کی طرف تھیں۔

احاطے میں ایک اونچے بانس پر میونسپل کمیٹی کی بڑی سی لالٹین جھول رہی تھی۔ دن کا وقت تھا اس لیے لالٹین بجھی ہوئی تھی مگر لگتا تھا رات کو بھی بجھی ہی رہتی ہو گی کیونکہ اس کی چمنی ٹوٹی ہوئی تھی۔ بانس کے بالائی سرے پر ایک شریف النفس کوا بیٹھا حیرت سے تماشہ دیکھ رہا تھا احاطے میں مردوں کا ہجوم تھا۔ وہ کسی شخص کو سنبھالنے کی کوشش کر رہے تھے جبکہ وہ زور زور سے چیخ رہا تھا۔ میں نے دیکھا وہ یار محمد تھا۔ اس کے دونوں ہونٹ سوجے ہوئے تھے اور چہرے پر جا بجا نیل تھے۔ اس کی قمیض بھی پھٹی ہوئی تھی۔

''نہیں جاؤں گا میں نہیں جاؤں گا۔ مجھے مر جانے دو۔'' وہ چلا رہا تھا۔

پولیس کو دیکھ کر لوگ کائی کی طرح پھٹنے لگے۔ جن افراد نے یار محمد کو تھاما ہوا تھا وہ بھی پیچھے پیچھے ہٹ گئے۔ مجھے دیکھ کر یار محمد دہائی دینے لگا۔ ''یہ دیکھو تھانیدار جی! میرا کیا حال ہوا ہے۔ میں نے کیا بگاڑا ہے کسی کا؟ کیوں یہ لوگ مجھے جینے نہیں دیتے؟''

مقامی ایس ایچ او نے پوچھا۔ ''کیا ہوا ہے؟ کہاں سے آئے ہو تم؟''

یار محمد روتے ہوئے بولا۔ ''مجھے ستار اور اس کے غنڈوں نے اٹھا لیا تھا۔ پانچ دن انہوں نے مجھے بھوکا پیاسا باندھ کر رکھا ہے۔ دیکھیں مار مار کر میرا کیا حال کر دیا ہے۔'' اس نے اپنا بایاں ہاتھ دکھایا۔ اس کی تین انگلیاں ٹوٹی ہوئی تھیں۔ ''یہ دیکھیں۔'' اس نے شلوار کے پائنچے اٹھائے۔ پنڈلیوں پر چھڑیوں کے گہرے نشان تھے اور خون رِس کر جم گیا تھا۔

ایک بوڑھے نے آگے بڑھ کر زوردار تھپڑ یار محمد کے منہ پر مارا اور چیخ کر بولا۔

''خاموش رہ بدذات! تجھے تو بھوکے کتوں کے آگے ڈال دینا چاہیے۔ ایک شادی شدہ عورت کو بدنام کرتا ہے۔ چوری کرتا ہے اور سینہ زوری بھی دکھاتا ہے۔ تھانیدار صاحب! یہ بدمعاش ہے ہم سب اس کے کرتوت جانتے ہیں۔''

یار محمد چیخ کر بولا۔ ''ہاں میں بدمعاش ہوں جو کرنا ہے کر لو میرا۔ پھانسی چڑھا دو مجھے۔ کتے چھوڑ دو مجھ پر میری بوٹی بوٹی کر دو۔''

میں نے یار محمد کو جھڑک کر خاموش کرایا اور اسے اپنے ساتھ لے کر تماشائیوں کے ہجوم سے نکل آیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہم جام پور کے تھانے میں بیٹھے یار محمد سے پوچھ گچھ کر رہے تھے۔ یار محمد کی حالت پاگلوں سی ہو رہی تھی۔ وہ بار بار کہہ رہا تھا۔

''انسپکٹر! میں نے کسی کو بدنام نہیں کیا۔ ان لوگوں نے خود اپنی بدنامی کا سامان کیا ہے۔ مجھے کیوں اٹھا کر لائے ہیں امرتسر سے۔ کیوں پانچ دن میری ہڈیاں توڑتے رہے ہیں۔ اب میں بھی وہی کہوں گا جو میری زبان پر آئے گا۔ میں ثریا کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اگر وہ مجھے نہیں مل سکتی تو پھر میرا جینا بھی فضول ہے اگر آپ مجھے پھانسی نہ بھی دیں گے تو میں اس کے دروازے کے سامنے خودکشی کر لوں گا اور یہ کوئی زبانی کلامی بات نہیں۔ آپ دیکھیں گے، میں ایسا ہی کروں گا۔''

ایس ایچ او نے غصے میں بھڑک کر اسے ایک گالی دی اور بولا۔ ''تیرا عشق تو ہم ایسا نکالیں گے کہ تیری سات پشتوں تک کوئی عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھے گا۔''

پھر اس نے ایک سپاہی کو آواز دی کہ وہ چھتر لے کر آئے۔ میں نے ایس ایچ او کو آنکھ کے اشارے سے منع کر دیا۔ میں اس معاملے کو احتیاط سے دیکھنا چاہتا تھا۔ ویسے بھی یار محمد اس وقت مدعی تھا۔ اسے اغوا کیا گیا تھا اور حبس بے جا میں رکھا گیا تھا۔ میں نے اسے موقع دیا کہ وہ اس بارے میں بتا سکے۔ اس نے تمام واقعہ تفصیل سے بتایا۔ اس نے کہا کہ اسے ٹیکسی میں ڈال کر امرتسر سے انبالے پہنچایا گیا۔ وہاں ایک رات رکھنے کے بعد جام پور لا کر ایک

تاریک مکان میں بند کر دیا گیا۔ اسے رسیوں سے باندھ کر بھوکا پیاسا رکھا گیا تھا۔ ستار اور اس کے دوست شاہجہاں نے اس پر بے پناہ تشدد کیا ہے۔ ایک دن وہ استرے سے اس کے جسم کے حصے کاٹنے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ اس نے ان کے گھر شرمناک خط لکھے تھے۔ شاید وہ اسے جان سے ہی مار ڈالتے مگر آج صبح وہ کمرے کی ایک کھڑکی کو بند کرنا بھول گئے۔ یار محمد نے لوہے کی جالی توڑی اور نکل بھاگنے میں کامیاب ہوا......"

پوری روئیداد سننے کے بعد ہم یار محمد کو لے کر اسی وقت اس مکان تک پہنچے۔ یہ ستار کے دوست شاہجہاں کا مکان تھا۔ واقعی ایک کمرے کی جالی ٹوٹی ہوئی تھی اور وہاں ایسے آثار تھے جن سے ثابت ہوا کہ یار محمد کو یہاں رکھا گیا ہے۔ شاہجہاں اور ستار دونوں غائب تھے۔ میری ہدایت پر ایس ایچ او رحمان نے ان کی تلاش شروع کرائی۔ قصبے میں دو تین جگہوں پر چھاپہ مارا گیا۔ ان دونوں کے ملنے جلنے والوں سے بھی پوچھ گچھ کی گئی لیکن فوری طور پر نتیجہ نہیں نکلا۔ تاہم شام تقریباً سات بجے وہ دونوں خود تھانے پیش ہو گئے۔ ان کے ساتھ ایک سرکاری افسر بھی تھا اس نے بتایا کہ ستار اور شاہجہاں خوف کی وجہ سے تھانے نہیں پہنچے تھے ورنہ ان کے بھاگنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ خود حاضر ہو کر اپنا مؤقف پیش کرنا چاہتے تھے۔ میں نے ستار سے پوچھا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ اس نے جیب سے کچھ خطوط نکالے اور ہمارے سامنے رکھ دیے۔ ان کی تعداد تقریباً دس تھی۔ نیلی روشنائی کے ساتھ ہولڈر سے لکھی ہوئی تحریر تھی۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ تحریر کو بگاڑ کر لکھا گیا ہے تاکہ پہچانی نہ جا سکے۔ یہ خط گالیوں اور فحش نگاری کا پلندہ تھے۔ لکھنے والے نے کوشش کی تھی کہ تحریر کے ذریعے ستار کو زیادہ سے زیادہ ذلیل کیا جائے۔ ستار نے روہانسا ہو کر کہا۔ "جناب! ان میں سے کچھ خط جو میری برداشت سے باہر تھے میں نے پھاڑ دیئے ہیں۔"

ان خطوط کو پڑھ کر کسی بھی شریف انسان کا دماغ آؤٹ ہو سکتا تھا۔ ستار نے کہا۔ "جناب! یہ گندگی تین ماہ سے میرے گھر میں پھینک رہا تھا اور مجھے یقین ہے کہ یہ یار محمد کے علاوہ اور کوئی نہیں۔ میں نے چاہا کہ یار محمد کے بڑوں سے بات کروں لیکن باپ کے سوا یہاں اس کا بڑا کوئی نہیں اور یہ بڑا بھی بچوں سے بدتر ہے، ہر وقت نشے میں رہتا ہے۔ پچھلے ہی دنوں جیل کاٹ کر آیا ہے...... مجبور ہو کر میں امرتسر پہنچا اور یار محمد سے مل کر اسے سمجھانے کی کوشش کی، لیکن وہ الٹا ہمیں ڈرانے دھمکانے لگا۔ میرا بھی دماغ گھوم گیا۔ میں نے اسے ٹیکسی میں ڈالا اور باندھ کر یہاں لے آیا۔ یہ میرا قصور ہے کہ میں نے اسے چار پانچ دن شاہجہاں کے گھر میں رکھا مگر اس کے سوا میں کرتا بھی کیا۔ پہلے ہی میری بدنامی کے بہت

اشتہار لگ چکے ہیں۔ پولیس تک آتا تو اور بات پھیلتی۔ میں نے سوچا اسے گھر ہی رکھوں اور حیلے بہانے سے یا ڈرا دھمکا کر کسی طرح راہِ راست پر لانے کی کوشش کروں۔ ہو سکتا ہے مجھ سے کچھ زیادتی بھی ہو گئی ہو لیکن خدا گواہ ہے میں اس کے سوا کچھ نہیں چاہتا تھا کہ وہ ہم میاں بیوی کی زندگی سے نکل جائے۔"

یار محمد کے باپ کا جو کردار میرے سامنے آ رہا تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ایک بے راہرو شخص ہے۔ میں نے سوچا کہ اس سے دو باتیں کر لینی چاہئیں...... سرکاری افسر کی مداخلت پر میں نے ستار اور شاہجہاں کو گرفتار نہیں کیا تاہم انہیں زیرِ تفتیش رکھا۔ یار محمد کا حوالات میں رہنا ضروری تھا کیونکہ ابھی اس کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں تھی اور عین ممکن تھا کہ اسے چھوڑا جاتا تو وہ پھر ستار کے گھر کے سامنے جا کر چیخنا چلانا شروع کر دیتا۔ اس کے علاوہ اس کے خطوط کے بارے بھی پوچھ گچھ کرنا باقی تھی۔

یار محمد کو حوالات چھوڑ کر میں اس کے گھر پہنچا اور ولی محمد سے ملاقات کی۔ ولی محمد کے چھوٹے بیٹے نے مجھے باپ کے کمرے تک پہنچایا۔ گھر میں ولی کی دو بیٹیاں اور ایک رشتے دار عورت بھی تھی۔ مگر وہ سب کونے کھدروں میں لگی ہوئی تھیں اور لگتا تھا گھر میں کوئی ہے ہی نہیں۔ میں نے دیکھا ولی ایک چٹائی پر چت پڑا تھا۔ اس نے دھوتی بنیان پہن رکھی تھی۔ قریب ہی ایک تھالی میں کچھ مٹھائی پڑی تھی اور شراب کی بوتل لڑھکی ہوئی تھی۔ ہر طرف مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ اس شخص کو پتہ ہی نہیں تھا کہ تھوڑی دیر پہلے اس کا بیٹا گلی میں چیخ و پکار کر رہا تھا اور اب وہ تھانے میں ہے۔ وہ گھوڑے بیچ کر مدہوش پڑا تھا۔ اس کے لڑکے نے ایک دو بار ہلایا تو وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر سرخ آنکھوں سے ہمارے چہرے دیکھتا رہا پھر اپنے حواس میں آ گیا اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ میں سادہ لباس میں تھا اس لیے وہ میری آمد کا مقصد نہیں سمجھ پا رہا تھا میں نے اپنا تعارف کرایا تو وہ عجیب لاپرواہی سے مسکرانے لگا۔

"مجھے پتہ چل گیا ہے تم کیوں آئے ہو؟" وہ ہچکی لے کر بولا۔ "اس سؤر کے بچے کے لیے آئے ہو نا۔" اس نے بوتل اٹھا کر بچا کھچا سیال حلق میں انڈیلا اور فلسفیوں کی طرح چھت کو گھور کر بولا۔ "تھانیدار صاحب! یہ عورت بڑی ظالم چیز ہے۔ بڑا بُرا نشہ ہے یہ۔ شراب کے نشے میں اور عورت کے نشے میں بدنامی زیادہ ہوتی ہے اسی لیے...... میں نے...... شراب سے شادی کر رکھی ہے۔" اس نے جھوم کر خالی بوتل پر ہاتھ پھیرا اور بولا۔ "تمہیں تمہارے ڈنڈے کی قسم تھانیدار صاحب! ذرا سچ بتاؤ بوتل کوئی عورت سے کم ہے۔ ادھر لاؤ اپنا ہاتھ...... یہ دیکھو اس پر پھیر کر دیکھو۔ کتنی خوبصورت ہے۔ کچھ پتہ چلا اور پھر...... جب بلاؤ پاس آ جاتی

ہے۔ اس کا کوئی نخرا نہیں۔ کوئی حیلہ بہانہ نہیں۔ یہ رہنے کے لیے مکان نہیں چاہتی نہ پہننے کے لیے کپڑا، نہ بچوں کے لیے فیسیں مانگتی ہے۔ نہ بیمار ہوتی ہے نہ اداس ہوتی ہے۔ ہر دم تازہ دم، اس اُلو کے پٹھے سے کہو تھانیدار! اگر عشق کے بنا نہیں رہ سکتا تو اس بوتل کو محبوبہ بنائے چھوڑ دے اس عورت کا پیچھا وہ اسے موت کے سوا کچھ نہیں دے گی۔''

ولی محمد نشے میں تھا۔ میں نے سوچا شاید کوئی کام کی بات معلوم ہو جائے میں نے کہا۔

''ولی محمد یہ عورت تیرے بیٹے کے پیچھے کیسے پڑ گئی؟''

وہ بولا۔ ''تم نے......تم نے سائنس پڑھی ہے۔ نہیں پڑھی ہوگی۔ تھانیدار سائنس نہیں پڑھتے۔ میں نے پڑھی ہے تھوڑی بہت۔ سائنس بتاتی ہے کہ خلاؤں میں پتھر کے بڑے بڑے ٹکڑے تیرتے رہتے ہیں جو ٹکڑا جس سیارے کے پاس ہوتا ہے اس کی کشش انہیں کھینچ لیتی ہے۔ ثریا بھی ایک سیارہ ہے اس نے اپنے مقناطیس سے یار محمد کو کھینچ لیا ہے اب وہ ساری عمر ایک ہی چکر میں رہے گا۔ کبھی پاس چلا جائے گا کبھی دور لیکن اس چکر سے نہیں نکلے گا۔''

میں کافی دیر ولی محمد سے باتیں کرتا رہا۔ اس کی باتیں ایسی ہی تھیں۔ نشے میں ڈوبی ہوئیں اور چاند ستاروں کی خبر لاتی ہوئیں۔ میں اس کے پاس سے اٹھنے ہی والا تھا کہ دروازے کے پیچھے چوڑیوں کی چھم چھم سنائی دی اور کوئی جلدی سے اندر آ گیا۔ وہ ایک جوان عورت تھی بلکہ اسے لڑکی بھی کہا جا سکتا تھا۔ عمر پچیس چھبیس سال رہی ہوگی۔ اس نے ہلکا زرد رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا اس کے ہاتھ میں چھوٹا سا لفافہ تھا۔ وہ بے دھیانی میں اندر آ گئی تھی لیکن مجھے وہاں دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ اب اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ آگے آئے یا واپس چلی جائے۔ پھر وہ ہمت کر کے آگے آ گئی۔ کھنکتی آواز میں بولی۔

''چاچا ولی! یہ دوائی کھا لو بس دو دن اور کھانی ہے۔''

ولی محمد نے گھور کر اسے دیکھا اور بولا۔ ''ثریا! تجھے کتنی بار کہا ہے مت آیا کرو یہاں۔ دوائی کی بات ہے تو مجھے ایک ہی بار لا دے میں خود کھا لیا کروں گا۔ خواہ مخواہ کی رشتے داری نہ بنا ہم سے ہمیں نہیں چاہیے یہ رشتے داری۔''

لڑکی کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے ناراضگی کے آثار ابھرے۔ اس نے دوائی والا لفافہ ولی محمد کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ ''اچھا اب تو کھا لو۔ کل بھجوا دوں گی باقی کی دوائی۔''

ولی محمد نے دوائی لے لی اور بیزاری سے بولا۔ ''جا پانی لے کر آ۔'' وہ مجھے الجھی ہوئی نظروں سے دیکھتی باہر چلی گئی۔ میں یہ جان کر حیران ہو رہا تھا کہ یہی ثریا ہے۔ وہ بہت زیادہ خوبصورت نہیں تھی۔ رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں، آنکھیں بھی کچھ بجھی بجھی تھیں۔ بہر

حال اس میں ایک کشش تھی اور جسم بھی متناسب تھا۔ اس کے باہر نکلتے ہی ولی محمد بولا۔

''پاگل ہے یہ لڑکی اور ہم سب کو بھی پاگل کر رکھا ہے۔ بلکہ دونوں اُلو کے پٹھے ہی پاگل ہیں۔'' اس کا اشارہ اپنے بیٹے کی طرف تھا۔ گہری سانس لے کر بولا۔ ''اب بہانے بہانے سے آئی ہے کہ شاید یار محمد بھی گھر میں ہو۔ ایک طرف اس کو تھپڑ مارتی ہے اور دوسری طرف اس کے لیے دیوانی بھی ہوئی پھرتی ہے۔ پتہ نہیں کیا چاہتی ہے......''

میں نے پوچھا۔ ''لیکن یہ آئی کیسے؟''

وہ بولا۔ ''کچھ نہ پوچھو جی! اس محلے کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے دیواروں سے دیواریں اور چھتوں سے چھتیں ملی ہوئی ہیں۔ گھروں کے درمیان کھڑکیاں بھی ہیں جہاں سے ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا لگا رہتا ہے۔ ہمارے گھروں کے درمیان بھی ایک کھڑکی ہے۔ بس وہیں سے آ جاتی ہے چھپاک کر کے۔ کوئی منہ نہیں لگاتا پھر بھی گھسی چلی آتی ہے...... میں تو......''

اچانک وہ چپ ہو گیا کیونکہ ثریا ہاتھ میں گلاس لیے اندر آ رہی تھی۔ ولی محمد کو دوائی کھلا کر جب وہ جانے لگی تو میں نے اسے آواز دے کر روکا۔ وہ ٹھہر گئی ولی محمد نے کہا۔ ''یہ انسپکٹر نواز ہے تھانے سے آیا ہے۔''

میرا تعارف سن کر وہ ایک دم خوفزدہ نظر آئی پھر سنبھل کر بولی۔ ''جی فرمایئے۔''

میں نے کہا۔ ''میں تم سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ تمہارا خاوند گھر ہی میں ہے۔''

وہ بولی۔ ''نہیں جی......شاہجہاں کے ساتھ آپ کی طرف گئے تھے۔ تھوڑی دیر پہلے ایک منٹ کے لیے آئے تھے اور پھر چلے گئے تھے۔''

میں نے کہا۔ ''چلو ٹھیک ہے اسی گھر میں بات کر لیتے ہیں۔'' پھر میں نے ولی محمد سے کہا۔ ''ولی صاحب! آپ ہمیں چند منٹ دیں گے۔''

وہ میری بات سمجھتے ہوئے اٹھ بیٹھا۔ کچھ دیر کھڑا رہا پھر شرابیوں کے انداز میں ہاتھ باندھ کر بولا۔ ''انسپکٹر صاحب! خدا کے لیے اس کو سمجھائیں۔ اس کے دماغ سے خناس نکال دیں اسے سمجھائیں کہ نہ اپنا گھر اجاڑے، نہ ہمیں برباد کرے۔'' وہ لڑکھڑاتا ہوا باہر نکل گیا تو میں نے ثریا کو بیٹھنے کے لیے کہا وہ ایک کرسی گھسیٹ کر دیوار کے ساتھ بیٹھ گئی۔ ولی محمد کا چھوٹا بیٹا اندر جھانکنے کے لیے آیا تو میں نے اسے کہا کہ دو منٹ کے لیے دروازہ بند کر دو۔

میں نے غور سے ثریا کو دیکھا۔ غالباً چار پانچ سال پہلے وہ بہت خوبصورت تھی۔ اب بھی اس کا چہرہ دیکھنے والوں کی نظر کو خود پر روک سکتا تھا۔ اگر یار محمد نے اس کو دل میں بسایا ہوا تھا اور اس کے دھیان میں رہتے ہوئے شمی جیسی لڑکی کو ٹھکرایا تھا تو یہ کوئی عجیب بات نہیں تھی۔

میں نے اس سے پوچھا۔ ''بی بی! تم جانتی ہو کہ تمہاری وجہ سے کتنا ہنگامہ ہو رہا ہے لیکن تم پھر بھی اپنی ہی لائن پر چلتی جارہی ہو۔ آخر تم چاہتی کیا ہو۔ کیسی عورت ہو تم؟''

اس نے سر جھکایا اور اس کے ہونٹ لرزنے لگے۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر کہہ نہیں پا رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ''تمہارا شوہر شریف ہے کماؤ ہے۔ تم سے محبت کرتا ہے۔ پھر تم یہ کھیل کیوں کھیل رہی ہو۔ کیوں شرم نہیں آتی تمہیں؟''

اس کی آنکھوں سے آنسو ڈھلک کر اس کے رخساروں پر پھسلنے لگے۔ میں نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح وہ اپنے دل کی بات بتائے لیکن وہ ہر بار ہونٹوں کو بھینچ لیتی۔ آخر میں نے جھلا کر کہا۔ ''کچھ تو بولو۔ خاموش رہنے سے کام نہیں چلے گا۔ یہ مت بھولو کہ تمہارا رویہ تمہیں عدالت کے کٹہرے میں بھی پہنچا سکتا ہے۔''

اس نے روتے روتے صرف اتنا کہا۔ ''میں بے قصور ہوں۔ میرا کوئی گناہ نہیں۔''

''بے گناہی ثابت کرنا پڑتی ہے بی بی! الزامات کا جواب دینا پڑتا ہے۔'' میں نے غصیلے لہجے میں کہا۔

وہ ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ بس نگاہیں جھکا کر آنسو گراتی رہی۔ صاف ظاہر تھا وہ کوئی خاص بات چھپا رہی ہے ماتھے پر آنے والی بالوں کی لٹ کو اس نے ہاتھ سے بڑھا کر کان پر چڑھایا تو زرد اوڑھنی اس کے رخسار سے ہٹ گئی۔ اس وقت میری نگاہ اس کے جھمکے پر پڑی۔ میں سکتے میں رہ گیا۔ اس جھمکے کا ڈیزائن چیخ چیخ کر ایک اعلان کر رہا تھا۔ میں نے ایک بار پھر غور سے جھمکے کو دیکھا۔ ثریا نے میرے اس انداز کو محسوس کیا اور ٹھٹک کر میری طرف دیکھنے لگی۔ اوڑھنی نے اس کے کان کو پھر ڈھانپ لیا۔ میں نے کہا۔

''بی بی! یہ اوڑھنی پیچھے ہٹاؤ۔'' وہ پہلے تو میری بات سمجھ نہیں سکی۔ جب میں نے دوسری بار وضاحت سے کہا تو اس نے اپنا کان ننگا کیا۔ میں نے آگے جھک کر جھمکے کا معائنہ کیا۔ شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ یہ انگوٹھی کے ساتھ کا جھمکا تھا۔ میں نے کہا۔

''بی بی! یہ جھمکا تجھے کہاں سے ملا؟''

وہ بولی۔ ''میری شادی کا ہے۔''

''والدین کی طرف سے؟''

''نہیں، سسرال کی طرف سے۔''

''اس کے ساتھ کا کوئی اور زیور بھی ہے؟''

''نہیں۔ بس یہ جھمکے ہی ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''دیکھو بی بی! میں جو پوچھوں سچ بتانا ورنہ تم سب ایک بہت بڑی مصیبت میں پھنس جاؤ گے۔''

ثریا میری حرکات سے پہلے ہی پریشان نظر آرہی تھی جب میں نے ''بڑی مصیبت'' کا ذکر کیا تو وہ اور ہراساں ہو گئی۔ کہنے لگی۔ ''پتہ نہیں آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں بہتر ہے آپ میرے شوہر سے بات کرلیں۔''

میں نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا اور کش لے کر کہا۔ ''گھبرانے کی بات نہیں۔ سچ بولو گی تو میں ہر طرح کا تعاون کروں گا، لیکن جھوٹے کو قانون کبھی معاف نہیں کرتا۔''

اس کے ابھرے ہوئے رخساروں کا رنگ زرد ہو گیا۔ اس نے اوڑھنی کو سینے کے سامنے مٹھی میں جکڑا اور اپنے آپ میں سمٹ سی گئی۔ میں نے کہا۔ ''اس جھمکے کے ساتھ کی ایک انگوٹھی میں نے یار محمد کی انگلی میں دیکھی ہے۔ وہ کہاں سے آئی ہے؟''

''کون سی انگوٹھی؟'' ثریا نے پوچھا۔

میں نے سختی سے کہا۔ ''ثریا! انجان نہ بنو اور نہ ہی میرا ٹائم ضائع کرو۔ معلوم تو سب کچھ ہو جانا ہے۔ بہتر ہے اپنی زبان سے بتا دو۔''

اس نے سر جھکا کر کہا۔ ''وہ...... میں نے اسے دی تھی۔''

میں نے پوچھا۔ ''تمہارے شوہر کو معلوم ہے؟'' وہ انکار میں سر ہلانے لگی۔ میں نے کہا۔ ''تم جانتی ہو تمہارے شوہر کے پاس یہ زیور کہاں سے آیا تھا؟''

وہ سادگی سے بولی۔ ''یہ شادی سے پہلے کی بات ہے۔ مجھے معلوم نہیں۔''

میں نے ثریا سے چند سوالات مزید کیے۔ پھر اسے گھر جانے کی اجازت دے دی مگر اس شرط کے ساتھ کہ وہ گھر سے نہیں نکلے گی اور نہ ہی اس گفتگو کے بارے کسی کو بتائے گی۔ میری ان ہدایات نے ثریا کو مزید خوفزدہ کر دیا۔ وہ سمجھ گئی کہ کوئی گڑبڑ ہونے والی ہے۔

ولی محمد سے رخصت ہو کر میں فوراً تھانے پہنچا۔ ایس ایچ او سے کہا کہ وہ ایک کانسٹیبل فوراً ستار کے گھر بھیج دے اور اگر ستار وہاں پہنچے تو اسے لے کر تھانے آ جائے۔ اس کے بعد ایک سب انسپکٹر کو میں نے ستار کی تلاش میں بھیجا اور اسے کہا کہ وہ ستار کو ہر ممکنہ ٹھکانے پر ڈھونڈے۔

سب انسپکٹر کوئی آدھ گھنٹے بعد ستار کو تلاش کر لایا...... ستار اس اچانک طلبی پر حیران تھا۔ ابھی تھوڑی ہی دیر پہلے تو وہ تھانے سے فارغ ہو کر گیا تھا۔ میں حوالات میں جا کر یار محمد کی انگوٹھی اتروا لایا۔ یہ انگوٹھی میں نے ستار کے سامنے رکھ کر پوچھا۔ ''یہ کس کی انگوٹھی ہے؟''

ستار نے بغور انگوٹھی کو دیکھا اور اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ ہکلا کر بولا۔ ”جناب یہ میری بیوی کی انگوٹھی ہے ثریا کی۔“

”تمہیں کہاں سے ملی؟“

”جی وہ...... جی میں...... جی وہ میں نے...... اللہ بخشے میری والدہ نے بنوائی تھی یا شاید...... بنی بنوائی لی تھی۔“

میں نے ڈرامائی لہجے میں کہا۔ ”والدہ نے بنوائی تھی یا تم نے ڈاکے میں چھینی تھی؟“

ستار کا منہ کھلا رہ گیا۔ ”یہ کیا کہہ رہے ہیں جناب...... ڈاکہ...... کیسا ڈاکہ؟“

میں نے کہا۔ ”وہ ڈاکہ جو تم نے پانچ سال پہلے سہارنپور کے سجد یورائے کے گھر مارا تھا۔“

”کون سا سجد یورائے؟“

”ہاں...... کہاں یاد ہوگا تمہیں۔ پتہ نہیں کس کس کو لوٹ چکے ہو۔ کوئی ایک نام تھوڑا ہی ہے تمہارے کھاتے میں۔“

ایس ایچ او رحمان اور دوسرا عملہ بھی حیران نظر آ رہا تھا۔ ان کے خیال میں ستار ایک شریف، محنتی اور دین دار شخص تھا۔ وہ اس کے ڈاکو ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے لیکن میں اب پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ یہ شخص ڈاکے مارتا رہا ہے۔ اس کی بے پناہ گھبراہٹ سارا پول کھول رہی تھی۔ اس کے علاوہ میں اس کی داہنی کلائی پر گولی کا ایک پرانا زخم بھی دیکھ چکا تھا۔ زخم کی حالت سے ظاہر تھا کہ گولی ڈاکٹر نے نہیں نکالی بلکہ کلائی کو خود ہی چیرا پھاڑا گیا ہے ایسے مخصوص زخم صرف ڈاکوؤں اور مفرور مجرموں کے جسموں پر ہی دیکھے جاتے ہیں۔ اپنے تجربے کی بنا پر میں اس زخم کو بہت اچھی طرح پہچان سکتا تھا۔ میں نے قریب کھڑے ہیڈ کانسٹیبل سے کہا۔

”نادر خاں! عبدالستار صاحب کو ہتھکڑی لگاؤ۔“

میرے منہ سے یہ فقرہ ادا ہوا ہی تھا کہ ستار اسپرنگ کی طرح کرسی سے اچھلا اور ایک سپاہی کو دھکیلتا ہوا دروازے کی طرف بھاگا۔ اس کی پھرتی دیدنی تھی۔ میں چونکہ میز کے پیچھے تھا اس لیے کچھ نہ کر سکا۔ مگر ایک کانسٹیبل نے بڑی ہوشیاری کا مظاہرہ کیا۔ جتنی تیزی سے مجرم بھاگا اس سے دوگنی رفتار سے وہ اس کے پیچھے لپکا۔ تھانے کے احاطے میں اس نے مجرم کو زوردار دھکا دیا اور وہ قلابازیاں کھاتا ہوا گملوں کی ایک قطار پر جا گرا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ اٹھ کر بھاگتا۔ کانسٹیبل نے اسے جھاپ لیا۔ اتنے میں باقی عملہ بھی اس پر ٹوٹ پڑا۔

ملزم کو کڑی، ہتھکڑی لگا کر حوالات میں بند کر دیا گیا۔ اس کی گرفتاری کے فوراً بعد

سہارنپور سے ایک ڈی ایس پی کو جام پور بلایا گیا۔ ڈی ایس پی صاحب اگلے روز صبح سویرے پہنچے۔ ان کے آنے تک ہم نے ملزم سے پوچھ گچھ جاری رکھی...... ڈی ایس پی صاحب ستار کو دیکھتے ہی پہچان گئے۔ انہوں نے انکشاف کیا کہ اس کا نام ستار نہیں بلکہ ابدال شاہ ہے اور یہ کچھ عرصہ پہلے سرگرم مجرم رہا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ یہ شخص اتر پردیش اور مہاراشٹر میں چوری اور ڈکیتی کی کئی وارداتیں کر چکا ہے۔ اپنی آخری واردات اس نے کوئی چار سال پہلے اجمیر میں ایک بس لوٹ کر کی تھی۔ اس واردات کے بعد پولیس بہت سرگرمی سے اس کے پیچھے پڑ گئی۔ لہٰذا اس نے کچھ عرصہ امن سکون سے گزارنے کا فیصلہ کیا اور روپوش ہو گیا تھا۔ ستار کے یہ کوائف بے حد حیران کن اور آنکھیں کھول دینے والے تھے۔ ایک شخص جو ستار کے نام سے ایک شریف شہری کی طرح جام پور کے محلے میں رہتا تھا۔ جرائم کی بساط کا ایک اہم مہرہ تھا...... ڈی ایس پی صاحب اس کی گرفتاری پر جتنے خوش نظر آ رہے تھے اتنے ہی حیران بھی تھے۔ انہوں نے فرداً فرداً ہماری کارکردگی کی تعریف کی......

ہم اس وقت دفتر میں بیٹھے ڈی ایس پی صاحب سے باتیں کر رہے تھے کہ ایک دبلا پتلا سپاہی گھبرایا ہوا آیا۔ اس نے اشارے سے ایس ایچ او صاحب کو باہر بلایا۔ رحمان کے پیچھے ہی پیچھے میں بھی باہر آ گیا۔ سپاہی نے بتایا کہ حوالاتی ستار کی بیوی کی جان سخت خطرے میں ہے ہم نے پوچھا۔ ”اسے کیا ہوا ہے؟“

وہ بولا۔ ”ہوا تو کچھ نہیں جناب...... لیکن ہونے والا ہے۔“

اس نے بتایا کہ حوالاتی ستار نے ایک سپاہی رام دھرم کو رشوت دی ہے اور وہ ستار کا ایک رقعہ لے کر اس کے دوست شاجہاں کے پاس گیا ہے۔ ستار نے شاجہاں کو لکھا ہے کہ وہ گرفتار ہونے سے پہلے اس کی بیوی کا کام تمام کر ڈالے۔

رحمان نے پوچھا۔ ”شاجہاں کہاں ہے؟“

سپاہی نے بتایا۔ ”مجھے نہیں پتہ، لیکن رام دھرم کو پتہ ہے جو رقعہ لے کر گیا ہے۔“

ایس ایچ او رحمان نے دانت پیس کر کہا۔ ”تجھے یہ سب کیسے معلوم ہوا؟“

سپاہی نے کانپتے ہوئے کہا۔ ”جناب! پہلے ملزم نے مجھے پھنسانے کی کوشش کی تھی۔ اس نے اپنی ٹانگوں کے درمیان کچھ روپے چھپا رکھے تھے۔ پہلے مجھے لالچ دیتا رہا کہ یہ دو سو روپیہ لے لو۔ میں نہیں مانا تو رام دھرم کو منا لیا۔“

ایس ایچ او نے کہا۔ ”اس حرامی کو لاک اپ میں کاغذ قلم کس نے دیا؟“

سپاہی بولا۔ ”یہ سب رام دھرم کا کام ہے۔“

سپاہی کا چہرا کہہ رہا تھا کہ وہ سچ بول رہا ہے۔ میں نے کہا۔ ”رحمان! ہمیں فوراً کچھ کرنا ہوگا...... تم ڈی ایس پی صاحب کے پاس بیٹھو، میں دیکھتا ہوں۔“ رحمان کے روکتے ہی روکتے میں باہر نکل آیا۔ مخبری کرنے والا سپاہی اور ایک رائفل مین بھی میرے ساتھ تھا۔ ہم تقریباً بھاگتے ہوئے چھاتا گلی پہنچے (اس گلی کے اوپر چھت تھی) گلی کے موڑ پر رک کر میں نے دیکھا۔ ستار کا تین منزلہ مکان سامنے نظر آ رہا تھا۔ مگر مکان کے اردگرد کوئی ہلچل نہیں تھی۔ اپنے دونوں ساتھیوں کے ساتھ ایک قریبی دکان میں جا گھسا۔ اب یاد نہیں آ رہا کہ کس چیز کی دکان تھی۔ اتنا معلوم ہے کہ دکاندار نے ہمارے لیے کرسیاں رکھوائیں اور چائے منگوائی۔ وہیں بیٹھے بیٹھے ہم ستار کے مکان کی طرف دیکھتے رہے۔ میں اس سے پہلے مکان کا اچھی طرح جائزہ لے چکا تھا اور مجھے تسلی تھی کہ مکان میں داخل ہونے کے لیے ملزم کے پاس کوئی اور راستہ نہیں ہوگا۔

قریباً آدھ گھنٹے کے بعد جب ہم مایوس ہو رہے تھے اچانک ایک تیز رفتار ٹم ٹم گلی میں داخل ہوئی اور سیدھی ستار کے دروازے کے سامنے رکی۔ ہم ہوشیار ہو گئے۔ میں سمجھ گیا کہ فیصلہ کن لمحہ آ گیا ہے اور ہماری گھات کامیاب ثابت ہوئی ہے۔ ٹم ٹم میں سے شاہجہاں نکلا۔ اس نے جسم کے گرد ایک سوتی چادر لپیٹ رکھی تھی۔ سر جھکائے جھکائے وہ تیزی سے تین منزلہ عمارت میں داخل ہو گیا۔ میں نے اپنی جگہ چھوڑی اور بھاگتا ہوا اس کے پیچھے گیا۔ بازار کے لوگ پہلے سے چوکنا ہو چکے تھے انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ ہم دکان کے اندر بیٹھے ہوئے ہیں اور کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔ مجھے بھاگتے ہوئے دیکھ کر سب گلی میں جمع ہونے لگے۔ میں تیزی سے چوبارے کی ڈیوڑھی میں داخل ہو گیا۔ یہ گہری تاریک ڈیوڑھی تھی۔ دن کے وقت بھی اندر بلب جل رہا تھا۔ سامنے تنگ زینہ تھا جو تیسری منزل پر ثریا کی رہائش گاہ تک جاتا تھا۔ میں دو دو زینے پھلانگتا تیسری منزل پر پہنچا تو شاہجہاں بے تابی سے ثریا کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ بلب کی زرد روشنی میں اس نے مجھے دیکھا اور اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔

”خبردار......“ میں نے پستول اس کی طرف سیدھا کیا۔

وہ میری توقع سے کہیں زیادہ پھرتیلا نکلا۔ اپنی لمبی ٹانگ اس نے یوں گھمائی کہ میرا پستول والا ہاتھ تو میرے اپنے ہی سر سے آ ٹکرایا۔ گولی کی آواز تنگ زینوں میں بم کے دھماکے کی طرح گونجی۔ اس کے بعد میں نے شاہجہاں کو خود پر جھپٹتے دیکھا۔ (جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا شاہجہاں بھی ایک نامی گرامی وارداتیا تھا۔ اس کا اصل نام رانا سنگھ تھا۔ وہ بھی جام پور کے اس قصبے کو پناہ گاہ کے طور استعمال کر رہا تھا) ہم اوپر نیچے زینوں پر گرے اور آٹھ دس

فٹ نیچے لڑھک گئے۔ میرے سر کے پچھلے حصے اور کمر پر چوٹ لگی۔ تاہم گرتے گرتے میں اپنے حواس بحال کر چکا تھا۔ جونہی لڑھکنے کا سلسلہ ختم ہوا۔ میں نے ایک زوردار مکہ شاہجہاں کی ناک پر مارا۔ وہ درد سے بلبلا اٹھا۔ میں نے اسے ٹانگوں پر لے کر پورے زور سے دیوار کی طرف اچھال دیا۔ دیوار کے ساتھ تصادم زوردار تھا۔ مگر وہ ڈھیٹ نکلا۔ ایک بڑھک سی مار کر اس نے مجھ پر چھلانگ لگائی اور دونوں ہاتھوں سے گلا دبانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس اثناء میں اوپر والے دروازے سے ثریا برآمد ہو چکی تھی اور دونوں ہاتھ سینے پر رکھے زور زور سے چیخ رہی تھی۔ نچلی منزلوں سے بھی شوروغل کی صدا آ رہی تھی۔ شاہجہاں بڑے جوش سے میرا گلا دبا رہا تھا۔ میں نے اتنے ہی زور سے اس کی ناف پر گھٹنا مارا۔ اس ضرب نے اسے مچھلی کی طرح تڑپا دیا۔ پھر ایک طوفانی مکہ یعنی بلال شاہ کی زبان میں ”باچیاں سیکنے والا مکہ“ اس کی ٹھوڑی پر پڑا اور وہ لڑکھڑاتا ہوا دوسری منزل پر پہنچ گیا...... اسے زخمی حالت میں گرفتار کر لیا گیا۔ اس کی جامہ تلاشی کے دوران ایک بھرے ہوئے ریوالور کے علاوہ وہ رقعہ بھی ملا جو ستار نے اسے حوالات سے بھیجا تھا۔ اس رقعے میں لکھا تھا۔

”رانا! میں پکڑا گیا ہوں پولیس تجھے ڈھونڈ رہی ہے بہتر ہے کہ تُو یہاں سے بھاگ جا لیکن بھاگنے سے پہلے تجھے میرا ایک کام کرنا ہوگا۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے بعد ثریا زندہ رہے۔ تُو اس کا کام تمام کر دے۔ وہ اس وقت گھر میں ہی ہے میرا پستول تخت پوش کے نیچے پڑا ہے۔ وہی لے جا۔ مگر گولی نہ چلائے تو بہتر ہے۔ اگر خود یہ کام نہ کر سکے تو بشیرے یا لطیف میں سے کسی کو کہہ کہ وہ یہ کام کر دیں۔ مگر یہ کام کرنا ضرور ہے۔ رب راکھا۔ تمہارا یار......“

☆======☆======☆

شاہجہاں کے علاوہ اس کے ساتھی بشیرا اور لطیف وغیرہ بھی گرفتار ہوئے...... اس کے بعد تفتیش اور عدالتی کارروائی کا طویل سلسلہ شروع ہوا۔ یار محمد کو میں نے رہا کر دیا۔ اس پر کوئی الزام ہی نہیں تھا۔ اس کہانی کا سب سے اہم کردار ثریا تھی۔ وہ ایک ایسی عورت تھی جو بیک وقت دو مختلف سمتوں میں سفر کر رہی تھی۔ اس کا دل و دماغ اس کی سوچیں سب کچھ بٹ چکا تھا۔ اس کے سیدھے سادے والدین نے اس کا ہاتھ ایک ایسے شخص کو سونپ دیا جو باہر سے کچھ اور اندر سے کچھ تھا۔ ایک بیوی ہونے کی حیثیت سے ثریا اپنے شوہر کو بہت حد تک سمجھ چکی تھی۔ اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ اس کا شوہر جرائم کی تاریک دنیا سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ اندر ہی اندر جلتی اور کڑھتی تھی لیکن شوہر کی بدکرداری کا ذکر کبھی اس کے لبوں تک نہیں آیا۔ وہ سب کچھ

اندر ہی اندر پی گئی، لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ پانی اپنے راستے خود تلاش کرتا ہے جذبے بھی اپنے اظہار کا کوئی نہ کوئی طریقہ ڈھونڈ لیتے ہیں۔ ثریا کے دبے ہوئے جذبات نے بھی اپنے اظہار کا ایک راستہ تلاش کر لیا۔ یہ راستہ معاشرے کو قبول نہیں تھا اور لوگ اس پر انگلیاں اٹھاتے تھے۔ مگر وہ جانتے بوجھتے انجان اور ڈھیٹ بنی ہوئی تھی۔ وہ یار محمد سے محبت کرتی تھی اور اس محبت کو خود بھی کوئی مناسب نام نہیں دے سکتی تھی۔ یار محمد کی بے راہروی پر اسے تھپڑ بھی مارتی تھی اور اسے دیکھنے کے لیے بے چین بھی رہتی تھی۔ وہ ہمارے معاشرے کا ایک مجبور اور بے بس کردار تھی۔ ہر زمانے میں اس کردار پر ترس کھایا گیا ہے، لیکن کسی زمانے میں اس کی مدد نہیں کی جا سکی۔

یقینی بات تھی کہ ستار کو اس کے گھناؤنے جرائم کی پاداش میں کم از کم...... کم از کم عمر قید کی سزا ہوگی۔ لہٰذا ثریا کی درخواست پر میاں بیوی کے درمیان طلاق عمل میں آ گئی۔ مجھے افسوس ہے کہ میں یار محمد اور ثریا کی کہانی کا انجام نہ دیکھ سکا۔ کیونکہ اس واقعے کے کچھ ہی عرصہ بعد میں پنجاب کے ایک دور دراز تھانے میں ٹرانسفر ہو گیا اور پھر کبھی جام پور کی طرف جانا نہیں ہوا۔

تاہم جو حالات میں اس نانک چندی اینٹوں والے قدیم قصبے میں چھوڑ آیا تھا ان سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شاید کچھ عرصہ بعد یار محمد اور ثریا نے شادی کر لی ہو اور وہ قصبہ چھوڑ کر کسی اور بستی میں جا آباد ہوئے ہوں۔ بہرحال یہ ایک قیافہ ہے۔ اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا ہمارے معاشرے میں ایسے معاملوں پر کوئی بھی یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔

کبھی کبھی میں تنہا بیٹھا سوچتا ہوں۔ معمولی معمولی واقعات سے کس طرح زندگیوں کے رخ تبدیل ہوتے ہیں۔ کس طرح کڑیوں سے کڑیاں ملتی ہیں اور سلسلہ بن جاتا ہے۔ اگر اخبار بیچنے والا یار محمد اس طوفانی دھارے جیسی لڑکی شمی کی ''دعوتوں'' کو نہ ٹھکراتا اور اس پر چوری کا الزام نہ لگتا اور نتیجے میں میں اس کے ہاتھ کی انگوٹھی سے آگاہ نہ ہوتا تو شاید عبدالستار کے گھناؤنے چہرے پر ہمیشہ پردہ پڑا رہتا اور ثریا ایک بٹی ہوئی گناہ گار زندگی جیتی رہتی۔

☆======☆======☆

لڑکی، پروفیسر اور شیطان

وہ ایک ایسی لڑکی تھی جو صرف محبت کرنا جانتی تھی۔ وہ اپنی چھوٹی سی جنت میں بہت خوش تھی اُسے معلوم نہیں تھا اُس کی آستین میں ایک سانپ ہے۔

ایک انسان موت کے شکنجے میں تھا۔ اگر میں کنارے پر کھڑا رہتا تو یہ بہت بڑی خود غرضی تھی۔ میں اس بے حسی پر کبھی خود کو معاف نہ کر سکتا۔ سب اندیشوں کو بالائے طاق رکھ کر میں نے پانی میں چھلانگ لگائی اور اس کے ساتھ ہی میں اپنی زندگی کی مشکل ترین گھڑیوں سے دو چار ہو گیا...... میرا خیال ہے کہ یہ واقعہ آپ کو شروع سے بتاؤں۔ یہ اس نہر کا ذکر ہے جو امرتسر کے اندر سے گزرتی ہے۔ اس روز میں موٹر سائیکل پر کچہری سے کمپنی باغ کی طرف آ رہا تھا۔ نہر کے دوسرے پُل پر مڑتے ہوئے میں نے ایک کالے رنگ کی مورس کار دیکھی۔ کار تیزی سے بڑی سڑک کی طرف جا رہی تھی۔ پُل کے درمیان پہنچ کر اچانک کار نے بایاں کنارہ لیا اور فٹ پاتھ پر جاتے ہوئے دو افراد سے جا ٹکرائی۔ میں نے صرف اتنا دیکھا کہ ان میں سے ایک شخص نے نارنجی رنگ کا کوٹ پہن رکھا تھا۔ ضرب نہایت شدید تھی، وہ شخص اچھل کر پُل کے جنگلے سے ٹکرایا، پھر کوئی چھ فٹ نیچے سر کے بل پُل کے چھجے پر گرا اور میری نظر سے اوجھل ہو گیا۔ پُل پر پہنچ کر میں نے موٹر سائیکل کے بریک لگائے۔ کار کا نمبر دیکھنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ نہر میں گرنے والے کا ساتھی جنگلے کو پکڑ کر اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میری نگاہ خود بخود نہر کی طرف اٹھ گئی۔ مضروب کا کہیں پتہ نہیں چلا اور بھی کئی لوگ ہراساں نظروں سے پانی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اچانک ایک لڑکا چلا کر بولا۔

''وہ رہا۔''

میں نے اس کی اٹھی انگلی کا تعاقب کیا۔ وہ اس پُل کے نیچے اشارہ کر رہا تھا جس پر ہم کھڑے تھے۔ اس کا مطلب تھا گرنے والا شخص پُل کے نیچے چلا گیا ہے۔ میں بھاگ کر پُل سے اترا اور کنارے پر چلا گیا۔ نیچے جھک کر دیکھا تو پُل کے نیچے ایک موری کے اندر نارنجی کوٹ کی جھلک نظر آ رہی تھی۔ یہ بڑی خطرناک بات تھی۔ اگر آپ بچپن میں کبھی نہر کے اندر

نہائے ہوں تو جانتے ہوں گے کہ پُل کے نیچے سے گزرنا کتنا خطرناک ہوتا ہے۔ عموماً پُل کے نچلے حصے اور پانی کی سطح کے درمیان بہت کم فاصلہ ہوتا ہے اور بعض اوقات بالکل ہی نہیں ہوتا۔ تیرنے والے کو ڈبکی لگا کر دوسری طرف نکلنا پڑتا ہے۔ اگر پل کی موری کے دوسری طرف کوئی جھاڑی وغیرہ پھنسی ہو یا کوئی دوسری رکاوٹ ہو تو اندر گھسنے والا زندہ نہیں بچ سکتا۔ نارنجی کوٹ کو دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ یہی کچھ ہوا ہے۔ کار کی ٹکر سے پانی میں گرنے والا شخص موری کے اندر جا کر پھنس گیا ہے۔ موری کی رکاوٹ اسے آگے نہیں جانے دیتی تھی اور بہاؤ پیچھے نہیں آنے دیتا تھا...... کوئی لمحہ جاتا تھا کہ وہ جیتا جاگتا شخص لاش کی صورت اختیار کرنے والا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر میں نے بلا ارادہ پانی میں چھلانگ لگا دی۔ پل پر اور نہر کے دونوں طرف اب پندرہ بیس افراد اکٹھے ہو چکے تھے۔ سب شور مچا رہے تھے کوئی کہہ رہا تھا رسہ لاؤ۔ کوئی چیخ رہا تھا بانس پکڑو...... کوئی مجھے آگے جانے سے روک رہا تھا۔ میرا اپنا ارادہ بھی پُل کے نیچے جانے کا ہرگز نہیں تھا مگر جب پاس پہنچ کر میں نے کوٹ والے کو گدلے پانی میں پھڑکتے اور اپنا سر پُل کی چھت سے ٹکراتے دیکھا تو برداشت نہ ہو سکا۔ پتہ ہی نہیں چلا اسے کھینچنے کی کوشش میں کب میں خود بھی پُل کے نیچے آ گیا...... خدا ہر کسی کو ایسی بلا سے محفوظ رکھے۔ میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا کہ وہ گھڑیاں کتنی دشوار تھیں۔ موت سارے فاصلے مٹا کر آنکھوں کے سامنے آ گئی تھی۔ پانی اور پُل کی چھت کا درمیانی فاصلہ دو تین انچ سے زیادہ نہیں تھا۔ پل کی موری میں جھاڑ جھنکار مٹی اور ایک پھٹی ہوئی بوری پھنسی تھی۔ میں نے ہاتھوں اور ٹانگوں کا استعمال کر کے اس رکاوٹ کو دور کرنا چاہا مگر مکمل ناکامی ہوئی۔ پھر میں نے نارنجی کوٹ کا ایک پلو پکڑ کر واپس لوٹنا چاہا مگر یہ کام کہیں زیادہ دشوار تھا۔ یوں لگا جیسے ہم دونوں پانی کی قبر میں دفن ہو گئے ہیں۔ میرا سانس کسی بھی وقت ٹوٹنے والا تھا نارنجی کوٹ والا غوطے کھا رہا تھا مگر اس نے مجھ سے لپٹنے یا مجھے جکڑنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کی یہ سمجھداری مجھے مرتے دم تک یاد رہے گی۔ ایک ڈوبتے ہوئے شخص سے ایسی ہوش مندی کی توقع کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ میں نے آخری زور لگا کر بہاؤ کی مخالفت سمت بڑھنا چاہا۔ بمشکل دو تین فٹ کھسکا ہوں گا کہ دم ٹوٹ گیا۔ ٹھنڈا بے رحم پانی فراٹے بھرتا ہوا ناک اور منہ میں گھس گیا۔ میں نے ایک بار پھر خود کو جھاڑ جھنکاڑ میں الجھا ہوا پایا۔ کہتے ہیں ڈوبنے والا ڈوبنے سے پہلے ایک بار ضرور اوپر آتا ہے مگر ہمارے پاس تو اوپر آنے کی گنجائش بھی نہیں تھی۔ وہ لمحے یاد کرتا ہوں تو آج بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

میں نے دل میں سوچا، نواز خاں قصہ تمام ہوا۔ انجام دردناک ہے لیکن اطمینان کی

ایک ہی بات ہے کہ تم نے ایک انسان کو بچانے کی کوشش کی اور جس نے ایک انسان کو بچانے کی کوشش کی اس نے گویا پوری انسانیت کو بچایا۔ واللہ اعلم بالصواب...... ذہن پر تاریکی سی چھاتی جا رہی تھی۔ دفعتاً مجھے محسوس ہوا کہ ٹانگوں سے کوئی شے لپٹ رہی ہے، میں نے اندھوں کی طرح ہاتھ چلائے۔ ایک رسہ میرے ہاتھ میں آ گیا۔ دل میں امید کرن پھوٹی یہ رسہ بہاؤ کے ساتھ موری کے اندر آیا تھا۔ ظاہر تھا کسی نے اوپر سے پھینکا تھا۔ میں نے رسہ تھام کر پل کے نیچے سے نکلنا شروع کیا۔ نارنجی کوٹ والا مر رہا تھا، مگر میری حالت اتنی خراب تھی کہ اگر اکیلا ہی باہر آ جاتا تو معجزے سے کم نہیں تھا۔ پل کے نیچے سے نکل کر میں نے پانی سے سر نکالا اور چند گہرے، زندگی بخش سانس لیے۔ اسی دوران میں رسہ اپنی کمر سے باندھ چکا تھا۔ سانس ذرا بحال ہوئی تو میں ایک بار پھر پل کے نیچے گھس گیا۔ نارنجی کوٹ والے کے بازو مردہ شاخوں کی طرح پانی پر لہرا رہے تھے۔ میں نے ایک بازو تھاما اور رسے کی مدد سے بہاؤ کی مخالف سمت تیرنے لگا۔ ایک جاں گسل کوشش کے بعد میں یہ پندرہ فٹ کا فاصلہ طے کرنے میں کامیاب ہوا۔ رسہ پھینکنے والوں نے ہمیں کھینچ کر پانی سے نکال لیا۔ نارنجی کوٹ والے کی حالت سے ظاہر تھا کہ وہ مر چکا ہے۔ پھر بھی آخری کوشش کے طور پر ہم نے اسے کنارے پر اوندھا لٹا دیا اور پھیپھڑوں سے پانی نکالنے کی کوشش کی۔ اردگرد لوگوں کا ہجوم ہو چکا تھا۔ اس ہجوم میں اتفاقاً ایک ڈاکٹر بھی موجود تھا۔ اس نے نارنجی کوٹ والے کا معائنہ کیا اور تصدیق کی کہ وہ مر چکا ہے۔

مرنے والا ایک نوجوان شخص تھا۔ لمبے بال، چھوٹی چھوٹی داڑھی اور باریک نقوش، اس کے ساتھ جو ادھیڑ عمر شخص تھا وہ اب زمین پر بیٹھا گھٹنوں میں سر دیئے ہچکیوں سے رو رہا تھا۔ اس کی ایک ٹانگ اور پیشانی پر معمولی زخم آئے تھے۔ ہم نے یہی سمجھا کہ وہ اس کا باپ یا چچا ہے لیکن بعد میں پتہ چلا کہ وہ دونوں استاد شاگرد تھے۔ ادھیڑ عمر شخص کا نام عظیم رحمانی تھا۔ اس کا نام جان کر اور اس کی شکل دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ میں اسے پہلے سے جانتا ہوں۔ شاید اخبار میں کہیں تصویر دیکھی تھی۔ جلد ہی یاد آ گیا کہ وہ ایک مشہور مصور ہے۔ ملک سے باہر بھی اس کی تصویروں کی نمائشیں ہوتی تھیں۔ وہ مصوری کی دنیا کا ایک جانا پہچانا نام تھا......

اسی دوران گشتی پولیس کی ایک جیپ موقعے پر پہنچ گئی۔ ہم سب اس میں سوار ہو گئے لاش کو ایک دوسری گاڑی کے ذریعے ہسپتال پہنچا دیا گیا۔ راستے میں ایک جگہ رک کر عظیم رحمانی کی مرہم پٹی کرائی گئی۔ تھانے پہنچ کر میں نے ان سے پوچھ گچھ شروع کی۔ انہوں نے بتایا کہ ان کی ایک شاگرد شاردا نے انہیں چائے پر بلایا تھا۔ وہ اسی کے گھر سے واپس آ رہے

تھے کہ یہ حادثہ پیش آ گیا۔

میں نے آنکھیں نکال کر کہا۔ ”آپ اسے حادثہ کہہ رہے ہیں یہ سیدھا سادا قتل کیس ہے۔“

وہ گڑبڑا کر بولے۔ ”انسپکٹر صاحب! مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آ رہی کون میرا دشمن ہو سکتا ہے۔“

عظیم رحمانی کی عمر پینتالیس سال کے قریب تھی۔ تاہم اچھی صحت کی وجہ سے چالیس کے لگ بھگ نظر آتے تھے۔ چہرے کے خدوخال سے پتہ چلتا تھا کہ جوانی میں کافی حسین رہے ہوں گے۔ اب بھی ان میں کشش تھی۔ خاص طور پر بال بہت خوبصورت تھے جنہیں وہ بار بار دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر پیشانی سے ہٹاتے تھے۔ اپنے شاگرد کی موت نے انہیں از حد افسردہ کر رکھا تھا...... ابھی ان سے پوچھ گچھ کی جا رہی تھی کہ تھانے کے دروازے پر ایک کار آ کر رکی۔ میں بری طرح چونک گیا۔ یہ کالے رنگ کی مورس کار تھی۔ کار میں سے عینک والا ایک دراز قد نوجوان برآمد ہوا۔ اس کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر شخص اور ایک لڑکی تھی۔ لڑکی نے ساڑھی باندھ رکھی تھی کٹے ہوئے خوبصورت بال شانوں پر لہرا رہے تھے۔ گاڑی سے اترتے ہی وہ لپکتی ہوئی عظیم رحمانی کی طرف آئی۔

”سر! آپ ٹھیک تو ہیں؟“ اس نے بے حد پریشانی سے پوچھا۔

رحمانی صاحب نے رومال سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ”ہاں میں تو ٹھیک ہوں۔“

لڑکی بے دم سی ہو کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ ”سر! یہ کیسے ہو گیا، یہ سب کیسے ہو گیا؟“

عینک والا نوجوان اور دوسرا شخص بھی سلام کر کے اندر آ گئے۔ میرے پوچھنے پر رحمانی صاحب نے بتایا کہ یہی شاردا ہے جس کے گھر سے وہ چائے پی کر آ رہے تھے۔ عینک والا شاردا کا بھائی تھا، وہ ایک پڑھا لکھا اور کسی حد تک سخت گیر شخص نظر آتا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”جس گاڑی نے متوفی کو ٹکر ماری ہے وہ کالے رنگ کی مورس تھی۔“

لڑکی کے چہرے پر کوئی خاص تاثر نہیں آیا۔ میں نے شاردا اور رحمانی صاحب سے پوچھا۔ ”آپ لوگ کس پر شک کر رہے ہیں؟“

میرے اس سوال پر شاردا کے ہونٹ ہلے لیکن بات کرنے سے پہلے ہی وہ خاموش ہو گئی۔ دوسرے لوگ بھی کوئی واضح جواب نہ دے سکے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کچھ سمجھ نہیں پا رہے۔ میں نے شاردا کے بھائی راکیش سے پوچھا۔

”تین اور چار بجے کے درمیان آپ کہاں تھے؟“

وہ بولا۔ ”میں اپنے دفتر میں تھا۔ ساڑھے تین بجے کے قریب شاردا کا فون آیا کہ پروفیسر رحمانی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے، میں فوراً گھر پہنچوں۔ میں گاڑی لے کر گھر آیا اور وہاں

سے شاردا کو لے کر یہاں آ گیا۔"

میں نے پوچھا۔"جب آپ دفتر میں تھے تو گاڑی کہاں تھی؟" اس نے جواب دیا کہ دفتر کی پارکنگ میں۔ میں نے پوچھا" کوئی شخص وہاں سے گاڑی لے جا سکتا ہے؟"

راکیش نے پورے یقین سے کہا کہ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ میں نے باہر نکل کر گاڑی کا معائنہ کیا۔ بظاہر کوئی ایسا نشان نظر نہیں آیا جس پر شبہ ہو سکے۔ ٹکر میرے سامنے ہوئی تھی۔ اس ٹکر میں گاڑی پر نشان آنا ضروری تھا۔ معائنے کے بعد میں واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔

☆======☆======☆

مرنے والے کا نام اختر رحمانی تھا۔ وہ امرتسر ہی کا رہنے والا تھا۔ عرصہ پانچ سال سے وہ مصوری میں رحمانی صاحب کا شاگرد تھا اور ان سے بے حد عقیدت رکھتا تھا۔ اس عقیدت کا ثبوت یہ تھا کہ اس نے اپنے نام کے ساتھ بھی رحمانی جوڑ رکھا تھا۔ شام چھ بجے تک متوفی کے والی وارث تھانے پہنچ گئے۔ ان میں اس کی والدہ اور ماموں بھی تھے۔ دونوں غم سے نڈھال ہو رہے تھے۔ ان کی والدہ نے آتے ساتھ ہی سینہ پیٹ پیٹ کر اعلان کیا کہ اس کے بیٹے کا قاتل اس کا تایا ہے اور" دو ایکڑ زمین" اس کے بچے کی جان لے گئی ہے۔

میں نے کہا۔" ماں جی! اس طرح رونے پیٹنے سے میری کوئی مدد نہیں ہو گی۔ مجھے آرام سکون سے بتاؤ کیا معاملہ ہے۔"

جوان متوفی کی ماں کو آرام سکون کہاں ہوتا ہے۔ تاہم اس نے جو کچھ بتایا وہ اس طرح تھا۔ اختر کے دادا کی دو مربعے زمین تین بھائیوں میں تقسیم ہوئی تھی۔ اس تقسیم سے دو ایکڑ زمین اختر کے حصے میں آئی تھی۔ اختر کو زمینوں کے معاملے سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی لیکن اس کے تایا زاد بھائی بہت ہوشیار ہیں۔ انہوں نے اندر ہی اندر جعلسازی کر کے یہ زمین اپنے نام منتقل کرا لی۔ اختر کو جب اس بات کا پتہ چلا تو اسے بہت دکھ ہوا۔ ماں نے بھی اسے سرزنش کی اور کہا کہ وہ ہر وقت تصویروں، کتابوں کے چکر میں پڑا رہتا ہے اور" شریک" اس کی جائیداد ہڑپ کر گئے ہیں۔ اختر نے فیصلہ کر لیا کہ وہ یہ ناانصافی نہیں ہونے دے گا۔ وہ جھگڑالو نہیں تھا اور نہ ہی زمینوں کے ہیر پھیر جانتا تھا مگر کچھ بااثر لوگوں سے اس کے تعلقات ضرور تھے۔ ان میں سے فضل الٰہی نامی ایک سول جج اس کے فن کا پرستار تھا۔ اختر نے اس کی مدد سے تایا زاد بھائیوں کے خلاف کیس لڑا اور کامیاب ہوا۔ نہ صرف مخالفوں کی جعلسازی ثابت ہو گئی بلکہ انہیں مقدمے کا ہرجانہ بھی دینا پڑا۔ اس واقعے کے بعد وہ لوگ جی جان سے اختر کے دشمن ہو گئے۔ وہ کئی بار اسے سبق سکھانے کی دھمکیاں دے چکے تھے۔ ان کی ماں ہر وقت اس کی

طرف سے فکرمند رہتی تھی۔ خاوند کی موت کے بعد وہی اس کا واحد سہارا تھا۔

اختر کی والدہ کی رپورٹ پر میں نے متوفی کے تایا اور اس کے بڑے بیٹے کے خلاف کیس درج کر لیا اور کارروائی شروع کر دی۔ ملزم پارٹی امرتسر کے نواحی گاؤں لودھر میں رہتی تھی۔ اسی رات ان لوگوں کو تھانے بلا لیا گیا۔ اختر کا تایا بھاری بھرکم جسم والا ایک پُراعتماد شخص تھا۔ اس کا بڑا بیٹا اختر کا ہم شکل تھا مگر تن و توش میں اس سے کہیں زیادہ تھا۔ ان لوگوں سے پوچھ گچھ شروع ہوئی۔ انہوں نے اس واقعے سے مکمل لاعلمی کا اظہار کیا۔ دونوں باپ بیٹے بولے کہ وہ تو پرسوں سے لاہور ایک شادی میں گئے ہوئے تھے اور جس وقت حادثہ ہوا وہ دو ڈھائی سو آدمیوں کے ساتھ ولیمے کی دعوت کھا رہے تھے۔

میں نے تصدیق کرائی تو معلوم ہوا کہ واردات کے روز وہ واقعی لاہور میں تھے...... مگر اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ بے قصور ہیں۔ بعض اوقات مجرم پولیس کو دھوکا دینے کے لیے بھی ایسے ڈرامے رچاتے ہیں۔ خود کچھ گواہوں کے درمیان موجود رہتے ہیں اور ان کے کارندے واردات کر جاتے ہیں۔ ممکن تھا یہ واردات بھی ملزم پارٹی نے اپنے کارندوں سے کروائی ہو۔ میں نے دو ملزموں سے ایسا سلوک کیا جن سے انہیں اندازہ ہوا کہ میرا شک ان پر سے دور ہو گیا ہے یا کم پڑ گیا ہے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے لودھر گاؤں کا ایک ہوشیار مخبر ان کے پیچھے لگا دیا۔ اس کے بعد اختر کے دوسرے ملنے جلنے والوں سے پوچھ گچھ شروع کی۔ اس سلسلے میں ایک مختصر پارٹی کو سیالکوٹ بھی بھیجا۔ وہاں اختر کا ایک دوست رہتا تھا جو واردات سے ایک رات پہلے اسے ملنے آیا تھا اور چند گھنٹے ٹھہر کر خاموشی سے واپس چلا گیا تھا...... تفتیش کا یہ سلسلہ تین چار ہفتے جاری رہا مگر کوئی ٹھوس ثبوت ہاتھ نہیں آیا۔ کسی جانب سے بھی کوئی ایسا سراغ نہیں ملا جو ایک مضبوط کیس کی بنیاد بن سکے۔

پھر ایک اور بات میرے ذہن میں بری طرح کھٹکنے لگی۔ میں سوچنے لگا کہیں ایسا نہ ہو کہ میں تو اختر کے ملنے جلنے والوں سے پوچھ گچھ کرتا رہوں اور مجرم پروفیسر رحمانی کے اردگرد موجود ہوں۔ جیسا کہ میں نے دیکھا تھا کار نے ان دونوں کو ٹکر ماری تھی۔ دیکھنے والا یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ مجرم کا نشانہ اختر تھا، پروفیسر رحمانی تھا یا دونوں تھے۔ اگر یہ فرض کیا جائے کہ اختر کی بجائے رحمانی صاحب کو نشانہ بنایا گیا تھا تو پھر اختر کے قاتلوں کو تلاش کرنا سرے سے غلط تھا۔ مجھے رہ رہ کر شاردا کا وہ انداز بھی یاد آ رہا تھا جب اس نے مجھ سے کوئی بات چھپانے کی کوشش کی تھی۔ کوئی انکشاف اس کے لبوں تک آتے آتے رہ گیا تھا۔ میں نے سوچا کسی روز وقت نکال کر اس لڑکی سے بھی ملنا چاہیے۔ ممکن ہے وہ کوئی اہم بات بتا سکے۔

پھر اسی دوران مجھے ایک دوسرے کیس کے سلسلے میں فوری طور پر چندی گڑھ جانا پڑ گیا۔ یہ بھی بڑا سنگین کیس تھا۔ ایک شخص نے تین بچوں کو اغوا کر کے کچھ ناقابل قبول مطالبات پیش کیے تھے، میں اس معاملے میں الجھا تو بیس پچیس روز بعد ہی واپس امرتسر تھانے میں آسکا۔ مجھے اخبار پڑھنے کا شروع سے ہی شوق رہا ہے۔ میری غیر موجودگی میں میرا عملہ وہ اخبار بھی سنبھال چھوڑتا تھا جو میں مصروفیت کی وجہ سے نہیں پڑھ سکتا تھا۔ اس دفعہ بھی میں واپس آیا تو پندرہ بیس اخبار اکٹھے ہو چکے تھے۔ میں یہ پلندہ اٹھا کر ورق گردانی کرنے لگا۔ سات روز پرانے اخبار میں ایک چھوٹی سی خبر دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ خبر کی سرخی تھی ''استاد شاگرد رشتہ ازدواج میں.....'' نیچے لکھا تھا ''کل یہاں ایک مقامی ہوٹل میں مشہور مصور عظیم رحمانی کی شادی کی تقریب سادگی سے انجام پائی۔ عظیم رحمانی کی عمر پینتالیس سال ہے۔ ان کی دلہن ان سے کم از کم پچیس برس چھوٹی ہے۔ دلہن شاردا ہندو فیملی سے تعلق رکھتی ہے۔ قبول اسلام کے بعد اس کا نام روبینہ تجویز کیا گیا ہے۔''

خبر پڑھ کر میری نگاہوں میں وہ منظر گھومنے لگا جب شاردا (موجودہ روبینہ) تھانے میں رحمانی صاحب سے ملی تھی۔ اس کے لب و لہجے نے مجھے اس وقت بھی شبہے میں مبتلا کیا تھا۔ اب یہ شبہ یقین میں بدل چکا تھا۔ ان دونوں میں استاد شاگرد کے علاوہ بھی ایک تعلق موجود تھا۔ اس خبر کی روشنی میں اب میرا مسٹر اور مسز رحمانی سے ملنا بھی ضروری ہو گیا تھا۔ میں نے رحمانی صاحب کے گھر کا پتہ لگایا اور اگلے روز شام کو ان سے ملنے پہنچ گیا۔

رحمانی صاحب کا مکان کمپنی باغ کے عقب میں واقع تھا۔ چھوٹی سی صاف ستھری کوٹھی تھی۔ گیٹ پر پروفیسر عظیم رحمانی کی نیم پلیٹ لگی تھی۔ میں نے کال بیل بجائی۔ ایک بوڑھے ملازم نے دروازہ کھولا۔ میں سادہ لباس میں تھا۔ وہ بولا۔ ''جی فرمائیں کس سے ملنا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''رحمانی صاحب سے، میرا نام نواز خاں ہے۔''

نوکر اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آ کر اس نے مجھے کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا اور بولا کہ رحمانی صاحب بس آنے ہی والے ہیں۔ اس کے لب و لہجے سے اندازہ ہوا کہ وہ یا اس کی مالکن مجھے پہچاننے میں ناکام رہے ہیں۔ میں ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر بیٹھ گیا اور در و دیوار کا جائزہ لینے لگا۔ ہر چیز مہکی مہکی اور نکھری نکھری تھی۔ گلدان میں تازہ پھول مہک رہے تھے۔ دیواروں پر خوبصورت تصویریں آویزاں تھیں۔ لگتا تھا سارا گھر ایک تصویر ہے۔

میں ٹہلتا ہوا ڈرائنگ روم کی دیوار گیر کھڑکی کے پاس چلا گیا۔ ذرا سا پردہ ہٹایا تو کچھ فاصلے پر ایک دوسرا کمرہ نظر آیا۔ کمرے کے اندر روشنی ہو رہی تھی اور سدابہار کی بیل کے نیچے شیشے والی

کھڑکیوں سے شادا یا روبینہ کا سراپا نظر آرہا تھا۔ وہ بڑی سج دھج کے کپڑے پہنے ہوئے تھی اور واقعی خوبصورت نظر آرہی تھی۔ غالباً وہ کمرہ ان کی خوابگاہ تھا۔ اس کی چھت سے ابھی تک سہاگ کے پھولوں کی لڑیاں جھول رہی تھیں۔ روبینہ بستر کی شکنیں درست کر رہی تھی اور مختلف چیزوں کو جھاڑ پونچھ رہی تھی پھر اس نے کھڑکیوں کے پردے برابر کر دیے اور خوابگاہ کا رنگین منظر میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اونچی ایڑی کی کھٹ کھٹ سے اندازہ ہوا کہ وہ اب ڈرائنگ روم کی طرف ہی آرہی ہے۔ میں رسالہ کھول کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ چند لمحے بعد وہ اندر داخل ہوئی۔ وہ بڑی بے تکلفی سے ملازم کو کچھ ہدایات بھی دیتی آرہی تھی۔ ''صاحب کے سلیپر پلنگ کے نیچے ہیں۔ ان کے لیے چائے کا پانی رکھ دو۔ شام کا اخبار گیٹ سے لے آؤ۔'' باتیں کرتی ہوئی وہ اندر داخل ہوئی۔ خوشبو کا جھونکا سا کمرے میں چکرا گیا۔ مجھے دیکھ کر وہ بری طرح چونکی۔ تاہم اس نے خود کو تیزی سے سنبھال لیا اور میری طرف بڑھ آئی۔

''ہیلو......آپ......آپ تو انسپکٹر صاحب ہیں میں سمجھی......''

میں نے کہا۔ ''مصروفیت زیادہ ہو تو سمجھنے پہچاننے میں غلطی ہو ہی جاتی ہے۔''

اس نے جوڑے سے لپٹی ہوئی موتیے کی لڑیوں کو درست کیا اور بڑی ادا سے صوفے پر بیٹھ گئی۔ ایک دم ہی وہ بے حد سنجیدہ نظر آنے لگی تھی۔ یوں لگا جیسے ایک بٹن دبنے سے نئی نویلی دلہن کہیں دور چلی گئی ہے اور ایک پریشان حال لڑکی میرے سامنے آن بیٹھی ہے۔

''جی فرمایئے کیسے آنا ہوا؟'' وہ بولی۔

میں نے کہا۔ ''میرا خیال ہے آپ بھول نہیں گئی ہوں گی۔ کچھ پرانی بات نہیں ڈیڑھ دو ماہ ہی ہوئے ہیں اختر کے قتل کو۔''

اس نے ایک گہری سانس لی تو خوبصورت گڑھا سا پڑ گیا۔ وہ بولی۔ ''انسپکٹر صاحب! یقین کریں۔ آج ہم دونوں خود ہی آپ کی طرف آنے والے تھے۔ شاید......شاید آپ کو یقین نہ آئے یہ دیکھیے'' وہ اٹھی اور قریبی میز سے ایک لمبوتری ڈائری اٹھا کر دکھانے لگی۔ ''یہ دیکھیے'' اس نے ایک صفحہ پلٹا۔ اسی دن کی تاریخ میں لکھا تھا۔ ''شام سات بجے پولیس اسٹیشن جانا ہے۔ اختر کے سلسلے میں انسپکٹر سے ملنے'' یہ عظیم رحمانی کے ہاتھ کی تحریر تھی۔ مجھے ڈائری دکھانے کے بعد وہ دوبارہ اپنی جگہ جا بیٹھی۔ گہری سنجیدگی سے بولی۔

''ہمیں آپ سے ایک اہم مسئلے پر بات کرنا تھی۔''

اتنے میں گیٹ پر کار کا ہارن سنائی دیا۔ روبینہ کے چہرے پر رونق آ گئی بولی۔ ''میرا خیال ہے، وہ بھی آ گئے ہیں۔'' وہ دلکش چال چلتی باہر چلی گئی۔ کوئی دس منٹ بعد مسٹر اور مسز

رحمانی دونوں میرے سامنے تھے۔ دونوں کی عمروں میں نمایاں فرق تھا مگر لگتا تھا وہ اس فرق سے بالکل شرمندگی محسوس نہیں کرتے۔ شرمندہ ہونے کی ضرورت بھی کیا تھی، اب وہ میاں بیوی تھے۔ پروفیسر رحمانی کے آنے سے روبینہ کی خاصی ڈھارس بندھی تھی اور اب وہ زیادہ پراعتماد نظر آ رہی تھی۔ کچھ رسمی باتوں اور چائے نوشی کے بعد ہم اصل موضوع کی طرف آ گئے۔ ملازم کوٹھی کے دوسرے حصے میں تھا اور ہم اس کمرے میں آزادانہ گفتگو کر سکتے تھے۔

رحمانی صاحب نے تعلیم یافتہ لوگوں کے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ''انسپکٹر نواز! میری وائف کے دماغ پر ایک بوجھ ہے اور یہ ہر صورت اسے اتارنا چاہتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں یہ اس کی غلطی ہے کہ اس نے اتنی دیر کی۔ بہر حال اس کی بھی مجبوری تھی آج ہم خود اسی سلسلے میں آپ سے ملنے والے تھے۔'' اس تمہید کے بعد رحمانی صاحب نے کہا۔

''روبینہ کا خیال ہے کہ اختر کے قتل کی واردات میں نرائن پوری نامی ایک لڑکے کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ یہ لڑکا کالج میں اس کے ساتھ پڑھتا رہا ہے۔ میرے پاس گھر میں بھی کچھ عرصہ پینٹنگ سیکھنے آتا رہا تھا۔ پینٹنگ سے اسے بالکل لگاؤ نہیں تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ صرف لڑکیوں سے آنکھ مچولی کے لیے آتا ہے۔ میں نے اسے اپنی کلاس سے نکال دیا......

اب روبینہ نے بتایا ہے کہ وہ لڑکا ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑا ہوا تھا اور بدتمیزی سے بھی باز نہیں آتا تھا۔ اس کی غنڈہ گردی سے بددل ہو کر روبینہ نے کئی ماہ سے کالج جانا ہی چھوڑ دیا تھا۔ نرائن پوری کو جب یہ پتہ چلا کہ روبینہ مجھ سے شادی کرنے والی ہے تو وہ بہت تلملایا۔ ایک روز اس نے بازار میں اسے روک لیا اور دھمکی دی کہ وہ بڈھے کو جان سے مار دے گا۔ آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے۔ اس کا اشارہ میری طرف تھا۔ اس واقعے کے چند ہی دن بعد وہ پُل والا حادثہ پیش آیا...... اس وقت سے روبینہ کے دل میں یہ خیال جما ہوا ہے کہ ہو سکتا ہے کار والے نے اختر کی بجائے مجھے نشانہ بنایا ہو۔ یہ چاہتی تھی کہ آپ کو جلد سے جلد اپنے شک سے آگاہ کر دے مگر ڈر رہی تھی کہ پتہ نہیں اس کا کیا نتیجہ نکلے۔ اگر نرائن بے قصور تھا تو یہ اور بھی خطرناک بات تھی اس جیسے خرد ماغ سے دشمنی مول لینا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اس لیے یہ بے چاری شش و پنج میں رہی۔ پرسوں اس نے مجھے یہ ساری بات کھول کر بتا دی۔''

پروفیسر رحمانی کا بیان مجھے ایک نیا راستہ دکھا رہا تھا۔ اس بیان سے کیس کی نوعیت ہی بدل جاتی تھی۔ دل ہی دل میں مجھے روبینہ پر غصہ بھی آ رہا تھا کہ اس نے یہ بات اب تک چھپائی۔ بہر حال اس میں میرا بھی قصور تھا میں نے خود ہی رحمانی صاحب کو سامنے رکھ کر تفتیش نہیں کی تھی۔ میرا سارا دھیان اختر کی طرف رہا تھا۔ روبینہ نے کہا۔

انسپکٹر صاحب! وہ بڑا اوباش لڑکا ہے۔ آپ اس سے پوچھ گچھ ضرور کریں مگر میرا نام بیچ میں آ گیا تو وہ ضرور بدلہ لے گا۔''

روبینہ کی خوبصورت آنکھوں میں تشویش کے سائے تھے۔ اس کی یہ تشویش اپنے محبوب شوہر کے لیے تھی۔ میں نے اس سے پوچھا۔

''کیا اختر کے قتل کے بعد کبھی نرائن پوری سے ملاقات ہوئی؟''

اس نے کہا۔ ''ہاں صرف ایک دفعہ تصویروں کی ایک نمائش میں ملا تھا۔ بس دور دور سے گھورتا رہا تھا۔ میرے بڑے بھائی بھی ساتھ تھے اس لیے پاس نہیں آیا۔''

اس ذکر پر میرا دھیان روبینہ کے بڑے بھائی کی طرف چلا گیا۔ اگر قاتل نے اختر کی بجائے پروفیسر رحمانی کو نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی تو پھر روبینہ کے بھائی راکیش پر بھی شک کیا جا سکتا تھا۔ میں نے روبینہ سے پوچھا۔

''تمہارے بھائی راکیش تمہاری شادی سے خوش ہیں؟''

اس کے چہرے پر حیا کا رنگ لہرایا۔ آنکھیں جھکا کر بولی۔ ''پہلے ناخوش تھے مگر اب وہ تین دفعہ مجھے ٹیلی فون کر چکے ہیں وہ اتنے تنگ نظر نہیں ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''رحمانی صاحب! معافی چاہتا ہوں کچھ ذاتی قسم کے سوال کرنے پڑ رہے ہیں۔ آپ بتائیں گے کہ آپ مسز روبینہ کو کب سے پڑھا رہے تھے اور شادی کا فیصلہ آپ لوگوں نے کب کیا؟ اس کے علاوہ شادی کی خواہش کا اظہار آپ کی طرف سے ہوا یا مسز روبینہ کی طرف سے؟''

ان سوالوں کا جواب رحمانی صاحب کی بجائے روبینہ نے دیا۔ وہ بے باکی سے بولی۔

''میں سر سے عقیدت کی حد تک لگاؤ رکھتی ہوں۔ میں ہی کیا ان کا ہر شاگرد ان کی پرستش کرتا ہے۔ سر کی پہلی بیوی آج سے بیس سال پہلے فوت ہو گئی تھیں اس کے بعد سے یہ تنہا تھے۔ میں نے انہیں بہت قریب سے دیکھا اور ان کی تنہائی اور دکھ کو محسوس کیا۔ میرے ہی کہنے پر آج سے چار سال پہلے انہوں نے سگریٹ نوشی اور شراب نوشی ترک کر دی۔ میں نے اس کمی کو اپنی ذات سے پورا کرنے کی کوشش کی اور ہمیشہ ان کی دل جوئی کی کوشش کرتی رہی تاہم اس وقت میرے ذہن میں یہ خیال تک نہیں تھا کہ میں ایک دن سر سے شادی کروں گی۔ نہ ہی انہوں نے کبھی مجھے اس نظر سے دیکھا تھا۔ پھر کچھ عرصہ پہلے یہ بیمار ہوئے تو میں نے گھر والوں کی اجازت سے کئی روز ان کی تیمارداری کی۔ انہی دنوں میں نے فیصلہ کر لیا کہ مستقل طور پر ان کے ساتھ رہوں گی۔''

میں نے کہا۔ ”روبینہ صاحبہ! ایسی باتیں چھپی نہیں رہتیں۔ ظاہر ہے کافی عرصہ پہلے آپ کے گھر والوں کو علم ہو گیا ہوگا کہ آپ پروفیسر صاحب میں دلچسپی لے رہی ہیں کیا انہوں نے آپ کو روکنے ٹوکنے کی کوشش کی؟“

روبینہ نے کہا۔ ”جی ہاں بڑے بھائی نے اس سلسلے کو ناپسند کیا۔ ایک موقعے پر وہ میری منگنی بھی کرنے لگے تھے لیکن میں نے انکار کر دیا۔ مجھے معلوم تھا اس راستے میں بڑی رکاوٹیں ہیں۔ ان ساری رکاوٹوں کو قبول کر کے ہی میں نے یہ سفر شروع کیا تھا۔ اس سلسلے میں باج بھائی نے بھی ہماری بڑی مدد کی۔ باج بھائی ان کے دوست ہیں اور میرے لیے باپ کے سمان ہیں۔ ان کی کوششوں سے ہی بھائی جان نے اپنا رویہ نرم کیا (باج بھائی کو میں بھی جانتا تھا جب روبینہ پروفیسر کے ایکسیڈنٹ کا سن کر تھانے آئی تھی تو باج بھائی ان کے ساتھ تھے۔ باج بھائی کی شخصیت بڑی دلچسپ تھی۔ اس پر علیحدہ سے ایک کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ وہ مذہبی لحاظ سے ہندو تھے مگر ہندو مسلم بھائی چارے کے زبردست علمبردار تھے۔ مندروں میں جانے کے ساتھ ساتھ وہ پیروں فقیروں کے مزاروں پر بھی حاضری دیتے تھے اور چادریں بھی چڑھاتے تھے۔) روبینہ نے مجھے بتایا کہ جب پروفیسر سے اس کی شادی کے تنازعے نے فرقہ وارانہ رنگ اختیار کرنا شروع کیا تو باج بھائی نے ہی اس معاملے کو سنبھالا تھا۔ اگر وہ نہ ہوتے تو شاید یہ شادی بھی نہ ہو سکتی۔

میں نے کہا۔ ”روبینہ صاحبہ! ایک بات بتائیں، آپ کو معلوم ہے واردات میں جو کار استعمال کی گئی وہ اُسی ماڈل اور رنگ کی تھی جیسی آپ کے بڑے بھائی کے پاس ہے۔“

روبینہ نے جواب دیا۔ ”انسپکٹر صاحب! آپ پہلے بھی اس کار کو شک کی نظر سے دیکھ چکے ہیں لیکن میں تصور بھی نہیں کر سکتی کہ بڑے بھائی صاحب ایسا جرم کر سکتے ہیں یا ایسے جرم میں شریک ہو سکتے ہیں۔ اس لائن پر تفتیش کر کے آپ صرف اپنا وقت ضائع کریں گے۔“

میں نے کہا۔ ”کیا آپ کو بھروسہ ہے کہ نرائن پوری کی لائن پر تفتیش کرنے سے وقت ضائع نہیں ہوگا۔“

وہ گڑبڑا گئی۔ کہنے لگی۔ ”انسپکٹر صاحب! مجھے ایسا پختہ یقین ہوتا تو آپ کو پہلے روز نہ بتا دیتی۔ یہ دیر اسی وجہ سے ہوئی ہے کہ مجھے نرائن پوری پر صرف شک ہے۔ وہ سو فیصد مجرم بھی ہو سکتا ہے اور سو فیصد بے گناہ بھی۔“

روبینہ خوبصورت ہونے کے علاوہ عقل مند بھی تھی۔ یہ دونوں خوبیاں کبھی کبھی ہی اکٹھی ملتی ہیں۔ میں پروفیسر رحمانی کی قسمت پر رشک کرتا ہوا ان کے ”محبت کدے“ سے واپس آ

گیا...... اس گفتگو کے دوران سب سے دلچسپ بات یہ معلوم ہوئی تھی کہ روبینہ شادی کے بعد بھی پروفیسر کو ”سر“ کہہ کر بلاتی تھی بہت خوب ادا تھی۔ میں یہ بات بلال شاہ کو بتاتا تو وہ ضرور ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوتا مگر ان دنوں وہ لاہور گیا ہوا تھا۔ اپنے انگوٹھے کا ایکسرے کرانے کے لیے اس کے ساتھ بڑا سانحہ ہو گیا تھا۔ گاؤں میں کسی کی بیمار بھینس کو دوائی کھلانے کے لیے اس نے بھینس کے منہ میں ہاتھ ڈالا تو اس کا انگوٹھا بھینس کی داڑھ کے نیچے آ گیا۔ اب بھینس تو بھلی چنگی تھی مگر وہ انگوٹھے کو گلے میں لٹکائے پھرتا تھا۔

☆======☆======☆

اگلے روز میں نے نرائن کو کالج کے ہوسٹل میں جا لیا۔ وہ ہوسٹل میں رہتا تھا اس کی صورت سے لوفر پن جھلکتا تھا۔ موٹی ناک، بھدے ہونٹ اور پیشانی پر زخم کا نشان۔ میں سادہ لباس میں تھا مگر وہ مجھے دیکھتے ہی پہچان گیا کہ میں مقامی تھانے کا انچارج ہوں۔ میں اسے لے کر کالج کی وسیع و عریض گراؤنڈ کے ایک کونے میں جا بیٹھا۔ وہ کچھ ڈرا ڈرا تھا۔

میں نے کہا۔ ”نرائن بابو! میں تجھ سے اختر کے قتل کیس کے سلسلے میں پوچھ گچھ کرنا چاہتا ہوں۔“

وہ بولا۔ ”انسپکٹر صاحب! میرا اختر سے کیا تعلق؟“

میں نے کہا۔ ”مجھے پتہ چلا ہے کہ تم کالج میں شاردا کے پیچھے لگے ہوئے تھے جواب پروفیسر رحمانی کی بیوی ہے۔“

”انسپکٹر صاحب! وہ تو بڑی پرانی بات ہے۔ دو ڈھائی سال پہلے کی۔ میں نے جب دیکھا کہ پروفیسر نے اسے شیشے میں اتار لیا ہے اور دونوں خوب رنگ رلیاں منا رہے ہیں تو میں نے آؤٹ ہونا ہی بہتر سمجھا۔“

میں نے کہا۔ ”مگر آؤٹ ہو کر بھی تم آؤٹ نہیں ہوئے اور اس کوشش میں لگے رہے کہ کسی طرح پروفیسر کو ناک آؤٹ کر دو۔“

”انسپکٹر صاحب! آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ بھگوان جانتا ہے اس واردات سے میرا کوئی سمبند نہیں۔“

”نرائن! بھگوان کا نام تیرے منہ سے اچھا نہیں لگتا۔ اس منہ سے شراب کی بو آ رہی ہے۔“

”کیا میرا شراب پینا اس بات کا ثبوت ہے کہ میں نے کسی کو قتل کیا ہے۔“

”نہیں۔ تمہارا شراب پینا اس بات کا ثبوت ہے کہ تم نام کے طالب علم اور کام کے غنڈے ہو اور ہر وہ کام کر سکتے ہو جو ایک غنڈہ کر سکتا ہے۔ تم زیر تفتیش ہو۔ تمہیں میرے

ساتھ تھانے چلنا ہوگا۔"

نرائن پوری اکڑ کر کھڑا ہوگیا۔ "میں نہیں جاؤں گا میں دیکھتا ہوں تم مجھے کیسے لے جاتے ہو۔ میں یونین کا سیکرٹری ہوں۔ زیادہ تھانیداری دکھاؤ گے تو فساد ہو جائے گا یہاں...... ہندو مسلم فساد۔"

اس کے ساتھ ہی وہ اپنے ساتھیوں کو آوازیں دینے لگا۔ یکایک کالج کے برآمدوں سے سات آٹھ لڑکے، ہاکیاں، موٹر سائیکل کے چین اور ڈنڈے وغیرہ لہراتے ہوئے نکل آئے۔ مجھے اس خطرے کا علم پہلے سے تھا۔ میرے پانچ ساتھی سادہ لباس میں کالج کے گیٹ پر کھڑے تھے ان کا دھیان میری طرف ہی تھا۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں پاس بلایا۔ ان کے پہنچنے سے پہلے ہی نرائن بھاگ کھڑا ہوا میں نے لپک کر گردن سے پیچھے سے اس کا کالر دبوچ لیا۔ یہ منظر دیکھ کر ایک لڑکے نے موٹر سائیکل کا چین کوڑے کی طرح لہرایا اور میرے سر پر حملہ آور ہوا۔ اگر یہ چین مجھے لگ جاتا تو زندگی بھر کے لیے شکل پہچاننی مشکل ہو جاتی۔ میں نے جھک کر یہ وار بچایا۔ چین نرائن کے سر پر پڑا اور وہ بلبلا اٹھا۔ میں نے ٹانگ سے چین والے کے سینے پر ضرب لگائی اور ایک دوسرے لڑکے کے منہ پر زوردار مکہ مارا۔ وہ ہٹا کٹا لڑکا اپنی ہاکی سمیت دور جا گرا۔ وہ سب چھٹے ہوئے غنڈے تھے مگر اس سے پہلے کہ وہ مجھے گھیر لیتے، عملے کے افراد پہنچ گئے اور ان میں سے دو نے اپنی سفید قمیضوں کے نیچے سے ریوالور نکال لیے۔ ریوالور دیکھ کر لڑکوں کو معاملے کی سنگینی کا احساس ہوا اور وہ کالج کے برآمدوں میں روپوش ہو گئے۔ میں جانتا تھا ابھی کسی چھت پر سے اینٹیں برسنا شروع ہو جائیں گی۔ میں نے نرائن کو دو حوالداروں کے سپرد کیا وہ اسے اٹھا کر باہر کھڑی جیپ میں لے آئے۔

تھانے میں نرائن سے سوال جواب ہوئے۔ وہ بہت اکڑ اکڑ کر بول رہا تھا۔ اس نے پروفیسر رحمانی اور روبینہ پر بہت سے الزامات لگائے۔ اس نے کہا کہ شادی تو انہوں نے صرف لوگوں کو منہ بند کرنے کے لیے کی ہے ورنہ روبینہ بہت پہلے اپنا سب کچھ پروفیسر کے قدموں میں ڈھیر کر چکی تھی۔ اس نے پروفیسر کے کردار پر بھی نکتہ چینی کی اور کہا کہ وہ نوجوان لڑکیوں میں گھرا رہنا پسند کرتا ہے۔ عریاں تصویریں بنانا اس کا مشغلہ ہے اور وہ فن کے نام پر فحاشی پھیلا رہا ہے۔ نرائن نے خود پر کوئی الزام قبول نہیں کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ چار ماہ سے اس نے پروفیسر یا اس کے چہیتے شاگرد اختر کی شکل تک نہیں دیکھی۔ اس نے اختر پر بھی کئی الزامات لگائے...... ہم نے تھانے میں نرائن پر کسی طرح سے سختی نہیں کی۔ پھر بھی کالج سے

خبریں آئیں کہ غنڈوں کا گروہ اگلے روز ہلے گلے کا پروگرام بنا رہا ہے اور اس پروگرام میں ہندو مہا سبھا اور جن سنگھ کے لڑکے شامل ہیں۔ یہ دونوں تنظیمیں فساد کرانے میں اپنی مثال آپ تھیں۔ ان لوگوں نے باقاعدہ تربیت یافتہ غنڈے پال رکھے تھے۔ میں نے خطرے کی بُو سونگھ کر پروفیسر رحمانی سے فون پر رابطہ قائم کیا اور انہیں صورت حال سے آگاہ کیا۔

رحمانی صاحب نے کہا۔ "انسپکٹر تم بے فکر رہو میں باج بھائی سے بات کرتا ہوں۔ وہ سب ٹھیک کر لیں گے۔"

اور واقعی اگلے روز کالج کھلنے سے پہلے پہلے سب ٹھیک ہوگیا۔ باج بھائی نے دو تین طالب علم لیڈروں کو اپنی رہائش گاہ پر بلا لیا اور گھر ہی میں انہیں سمجھا بجھا کر معاملہ ٹھنڈا کر دیا۔ اسی روز میں نے نرائن پوری کو بھی ضمانت پر رہا کر دیا۔ رہا ہو کر وہ کچھ اور بھی اکڑ گیا اور پروفیسر رحمانی اور اس کی بیوی کی شان میں قصیدے پڑھتا ہوا تھانے سے گیا۔

میں نے بے دلی سے تفتیش جاری رکھی۔ نرائن پوری کو بعد میں بھی چند بار تھانے بلایا لیکن اس کے خلاف کوئی اہم ثبوت نہیں مل سکا۔ وہ یونین کا عہدیدار تھا جب تک اس کے بارے میں ٹھوس شہادت نہ ملتی اس پر ہاتھ ڈالنا مناسب نہیں تھا۔ اسی طرح ڈیڑھ دو ماہ اور گزر گئے۔ میری نگاہوں میں کبھی کبھی وہ منظر گھوم جاتا جب ایک بے بس نوجوان میرے سامنے پانی کی قبر میں ہاتھ پاؤں مار رہا تھا اور میں اس کی مدد کرنے سے قاصر تھا، کتنی خاموشی سے جان دی تھی اس نے؟ اور کتنے صبر سے۔ اگر ان خوفناک لمحوں میں وہ عام ڈوبنے والوں کی طرح مجھ سے چمٹ جاتا تو ہم دونوں کی موت یقینی ہو جاتی۔ میں آج بھی کبھی کبھی سوچتا ہوں اس نے مجھے اپنے شکنجے میں کیوں نہ لیا۔ شاید وہ مجھے دیکھ ہی نہیں سکا تھا اگر اس نے مجھے دیکھا تھا اور پھر بھی مجھے پکڑنے سے باز رہا تھا تو یہ اس کی ناقابلِ فراموش ہوش مندی تھی۔ آفرین ہے ایسے شخص پر جو مرتے ہوئے بھی اپنے حواس پر قابو پائے رکھے۔ کبھی کبھی میرے تصور میں اس ماں کا دکھی چہرہ نمودار ہوتا جو بیٹے کی صورت میں اپنی زندگی بھر کی پونجی لٹا بیٹھی تھی اور اب خالی دامن خالی ہاتھ انصاف کی منتظر تھی۔ مجھے زندگی بھر ایسی بے نوا ماؤں سے بہت خوف آیا ہے۔ میں ہمیشہ ان کی آہوں سے ڈرا ہوں اور ان کی بددعا سے بچنے کے لیے اپنی ہمت کے مطابق کوشش کی ہے۔ اس دفعہ میں بھی مجرم تک پہنچنا چاہتا تھا مگر مجرم میرے ارد گرد موجود ہونے کے باوجود کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں عام پولیس والوں کی طرح ہوتا تو دو چار بندوں کو اندر کر کے مطمئن ہو جاتا لیکن میں اصل مجرموں پر ہاتھ ڈالنا چاہتا تھا کسی بے گناہ کو پکڑ کر ایک اور ماں کی آہیں لینا نہیں چاہتا تھا۔ جھوٹی کامیابی سے سچی ناکامی مجھے زیادہ عزیز تھی۔

☆======☆======☆

وہ جون کی ایک گرم دوپہر تھی۔ گرم اور سنسان، ایسی دوپہروں میں خالی برآمدوں میں مکھیاں بھنبھناتی ہیں اور دن میں بھی رات جیسے سناٹے کا راج ہوتا ہے۔ نہ مجرم نہ ملزم نہ مسائل نہ سائل کی ذات، تھانہ بھاں بھاں کر رہا تھا۔ گرمی بھی اس دن معمول سے زیادہ ہی تھی۔ بلال شاہ میرے سامنے لکڑی کے ایک تخت پر چت لیٹا تھا۔ میں نے اسے بہت دفعہ تھانے میں سونے سے منع کیا تھا۔ مگر وہ باز آنے والی شے نہیں تھی۔ منع کرتے کرتے سو جاتا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے بیٹھا تھا۔ پھر ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گیا۔ میں نے ایک فائل کی ورق گردانی کے بعد پلٹ کر دیکھا تو وہ خراٹے لے رہا تھا...... میز سے چھڑی اٹھا کر میں نے اسے ٹہوکا دیا تو وہ جلدی سے اکڑوں بیٹھ گیا اور لال لال آنکھوں کے ساتھ ہنس کر کہنے لگا۔ میں سو تو نہیں رہا تھا۔

میں نے کہا۔ ''نہیں سو تو میں رہا تھا، تم تو جاگ رہے تھے۔''

وہ بولا۔ ''ہاں...... جاگنے سے یاد آیا۔ صبح جاگتے ہی میں نے بڑی مزیدار خبر سنی تھی۔ آپ کو سنانا یاد ہی نہیں رہی۔ وہ ہمارا دودھ والا ہے نا وہ اس پروفیسر کے گھر بھی دودھ دینے جاتا ہے جس نے ہندو لڑکی کو مسلمان کر کے شادی کی تھی؟''

''پروفیسر رحمانی؟'' میں نے پوچھا۔

بلال شاہ نے ہاں میں جواب دیا۔

میں نے بے قراری سے کہا۔ ''کیسی خبر؟''

وہ بولا۔ ''پروفیسر نے طلاق دے دی ہے بیوی کو، دے دی ہے یا دینے ہی والا ہے۔''

میں اس انکشاف پر حیران رہ گیا۔ میں نے کہا۔

''یار بلال شاہ بڑا گھامڑ ہے تُو۔ اتنی اہم خبر اتنی دیر سے سنا رہا ہے...... کیا واقعہ ہے یہ مجھے تفصیل سے بتا۔''

جواب میں بلال شاہ نے بتایا کہ دودھ والے کے بقول میاں بیوی میں کافی دنوں سے جھگڑا چل رہا ہے۔ کبھی پروفیسر گھر سے غائب رہتا ہے کبھی اس کی بیوی۔ پھر دو تین ہفتے گھر کو تالا لگا رہا۔ چند روز ہوئے پروفیسر تو گھر آ گیا مگر اس کی بیوی نہیں آئی۔ ایک پڑوسی نے بتایا کہ پروفیسر نے اسے طلاق دے دی ہے......''

بلال شاہ کی باتیں سن کر میں سناٹے میں رہ گیا میری نگاہوں میں اس خوبصورت گھر کا منظر گھومنے لگا جہاں چند ماہ پہلے سہاگ کے پھول کھلے ہوئے تھے اور ہر طرف محبت کا راج

تھا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ وہ سب کچھ اتنی جلدی ختم ہو جائے گا۔ میں نے اسی وقت اپنے سب انسپکٹر کو بلایا اور اسے ہدایت دی کہ وہ اس معاملے کا پتہ چلائے۔ ہو سکے تو پروفیسر سے بھی ملے اور معلوم کرے کہ اس کی بیوی اب کہاں ہے؟

سب انسپکٹر اسی وقت چلا گیا میں نے اختر قتل کیس کی فائل منگوائی اور ورق گردانی کرنے لگا۔ سب انسپکٹر کی واپسی شام کے وقت ہوئی۔ اس نے بتایا کہ بلال شاہ کی اطلاع میں کچھ نہ کچھ حقیقت ہے۔ پروفیسر اور اس کی بیوی میں طلاق تو نہیں ہوئی۔ مگر ان دونوں میں سنگین جھگڑا چل رہا ہے۔ چند روز پہلے پروفیسر نے اپنی جواں سال بیوی کو مارا پیٹا بھی ہے۔ وہ امید سے تھی۔ تشدد کے نتیجے میں اس کا حمل گر گیا اور وہ کئی دن ہسپتال میں رہی۔ اب وہ باج بھائی کے گھر میں ہے کیونکہ اس کے گھر والے تین ماہ پہلے انگلینڈ جا چکے ہیں اور وہیں رہائش اختیار کر لی ہے۔ سب انسپکٹر نے بتایا کہ اس نے پروفیسر سے ملنے کی کوشش کی لیکن وہ بہت چڑچڑا ہو رہا ہے اس نے بیماری کا بہانہ کر کے ملنے سے انکار کر دیا حالانکہ وہ گھر ہی میں تھا۔

یہ حالات سننے کے بعد میں نے فوری طور پر باج بھائی سے ملنے کا فیصلہ کر لیا۔ شام کے کھانے کے بعد میں اس کے گھر جا پہنچا۔ باج بھائی ایک مالدار شخص تھا۔ کاروبار کے علاوہ اس کی بہت سی زمین بھی تھی۔ مگر وہ سادہ زندگی گزارتا تھا۔ اس کا مکان بھی درمیانے درجے کا تھا۔ یہاں وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ میری دستک پر اس کے نوکر نے دروازہ کھولا اور مجھے بیٹھک میں جا بٹھایا تھوڑی ہی دیر بعد باج بھائی بھی آ گیا۔ اس کی عمر ساٹھ سال کے قریب تھی۔ صحت عمر کے لحاظ سے اچھی تھی۔ وہ بڑے دھیمے لہجے میں بات کرتا تھا۔ وہ اندر آیا تو اس کی پیشانی پر دکھ کی لکیریں تھیں۔ رسمی کلمات کے بعد کہنے لگا۔

''انسپکٹر صاحب! جو کچھ ہوا اچھا نہیں ہوا۔ ہم سب کا سر شرم سے جھک گیا ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''لیکن اس میں قصور کس کا ہے؟''

وہ بولا۔ ''انسپکٹر صاحب، تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی۔ رسی کو توڑنے کے لیے دو طرف سے کھینچنا پڑتا ہے سہاگ کا یہ بندھن جو ٹوٹ رہا ہے تو اسے بھی دو طرف سے کھینچا گیا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ رحمانی کا دوش اس میں زیادہ ہے...... تم روبینہ سے خود ہی بات کر لو۔ وہ یہیں پر ہے۔'' پھر اس نے روبینہ کو آوازیں دینی شروع کر دیں چند لمحوں بعد روبینہ ایک کامدار سوتی چادر میں لپٹی ہوئی اندر آ گئی۔ اس نے ہاتھ پیشانی پر لے جا کر سلام کیا اور ایک طرف صوفے پر سمٹ کر بیٹھ گئی۔ میں اسے دیکھ کر حیران ہوا۔ اس کا کھلتا ہوا رنگ سرسوں کے پھول کی طرح زرد ہو رہا اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے۔ نچلے ہونٹ پر چند دن پرانی چوٹ کا

نشان بھی تھا۔ یہ وہ لڑکی تھی جس نے محبت کی خاطر دنیا سے ٹکر لی تھی۔ بدنامی سہی تھی اور مذہب و خاندان کی قربانی دی تھی۔ شادی کے چند ہی ماہ بعد اس کی یہ حالت میرے لیے افسوس کا باعث تھی۔ میں نے نرم لہجے میں روبینہ سے اس مایوس کن صورت حال کے بارے میں پوچھا۔ وہ ہچکچا رہی تھی۔ اس نے صرف اتنا کہا کہ اب پروفیسر سے اس کا نباہ نہیں ہوسکتا۔ اس نے انہیں سمجھنے میں بہت غلطی کی ہے۔ وہ اندر سے بہت دکھی لگتی تھی مگر ہونٹوں پر شرم وحیا کا تالا لگا ہوا تھا۔ اسے ہچکچاتے دیکھ کر باج بھائی نے اسے باہر بھیج دیا اور اپنے الفاظ میں روبینہ کی بپتا مجھے سنائی۔ یہ باتیں سن کر میں بھی حیران رہ گیا۔ مجھے محسوس ہونے لگا کہ اس سے پہلے نرائن پوری نے پروفیسر کے بارے جو کچھ کہا تھا وہ کافی حد تک درست تھا۔ باج بھائی کی باتوں سے معلوم ہوا کہ پروفیسر آج کل اپنی ایک اور شاگرد سے چکر چلا رہا ہے۔ اس لڑکی کا نام مینا تھا اور وہ اینگلو انڈین تھی۔ کشمیر سے پڑھنے کے لیے یہاں آئی ہوئی تھی۔ روبینہ کو مینا اور پروفیسر کے چکر کا علم سب سے پہلے اس وقت ہوا جب اس نے ان دونوں کو شام کے وقت ایک بازار میں شاپنگ کرتے دیکھا۔ اس نے پروفیسر سے اس بارے میں پوچھا تو وہ خوبصورتی سے ٹال گیا اور بتایا کہ وہ پینٹنگ کا کچھ سامان خریدنے کے لیے گئے ہوئے تھے۔ روبینہ نے یوں تو پروفیسر کی دلیل مان لی مگر اس کے دماغ سے شبہ نہیں نکلا۔ وہ جانتی تھی کہ پروفیسر تمام شاگردوں میں سے مینا پر زیادہ توجہ دے رہا ہے اور گھر میں کلاس ختم ہونے کے بعد وہ اکیلے بھی مصروف رہتے ہیں۔ مینا ویسے بھی ''ہیومن ڈرائنگ'' سیکھ رہی تھی اور مصوری کے اس شعبے میں مرد عورت کے قریب آنے کے بہت سے مواقع ہوتے ہیں۔

روبینہ نے محسوس کیا کہ مینا اور پروفیسر اسی دور سے گزر رہے ہیں جس سے کچھ عرصہ پہلے وہ اور پروفیسر گزرے تھے۔ ایک روز اس نے پروفیسر اور مینا کو ایک نہایت عریاں تصویر پینٹ کرتے دیکھا تھا۔ اس تصویر کے لیے مینا ماڈل بنی ہوئی تھی۔ روبینہ یہ سب کچھ برداشت نہ کرسکی اور اس نے اشاروں کنائیوں میں پروفیسر کو اپنی پریشانی سے آگاہ کیا۔ پروفیسر پر روبینہ کی روک ٹوک کا کوئی اثر نہیں ہوا اور وہ اپنے راستے پر آگے بڑھتا رہا۔ پروفیسر نے اب شراب پینی بھی شروع کردی تھی۔ ایک دوپہر جب پروفیسر کالج میں تھا مینا ان کے گھر آئی اور اس کی سنائی ہوئی خبر بجلی بن کر روبینہ پر گری۔ مینا نے بتایا کہ کل رات پروفیسر نے اس کی عزت برباد کردی ہے۔ وہ بری طرح رو رہی تھی اور خودکشی پر آمادہ نظر آتی تھی۔ اس نے یہ انکشاف بھی کیا کہ پروفیسر نے اسے نشے کے انجکشنوں کا عادی بھی بنا دیا تھا۔ کل رات بھی وہ نشے میں تھی۔ پروفیسر اس کی مدہوشی سے فائدہ اٹھا کر اسے ایک ہوٹل میں لے گیا اور ساری

رات اس کی آبرو سے کھیلتا رہا۔ صبح جب وہ روئی چیخی تو اس نے دلاسہ دیا کہ وہ اس سے شادی کرلے گا۔ مگر ایسے شیطان کے ساتھ شادی کرنے سے وہ موت کو گلے لگانا بہتر سمجھتی ہے......

وہ بہت آزردہ نظر آتی تھی۔ روبینہ کو اندازہ ہوا کہ اگر وہ بے سہارا رہی تو ہوسکتا ہے سچ مچ خودکشی کرلے۔ اس نے خاموشی کے ساتھ اسے کشمیر واپس بھیجنے کا انتظام کردیا اور اگلے ہی روز وہ امرتسر چھوڑ کر واپس چلی گئی۔ باج بھائی نے کہا۔ ''انسپکٹر! میں سمجھتا ہوں کہ اس لڑکی کو واپس بھیج کر اور اس معاملے کو خراب ہونے سے بچا کر روبینہ نے پروفیسر پر آخری احسان کیا ہے۔ اگر روبینہ چاہتی تو اس روز شہر کی دیواروں پر پروفیسر کی بدنامی کے اشتہار لگ جاتے اور وہ اپنے گھر کی بجائے جیل میں ہوتا۔ ایک پتنی اپنے پتی کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا کرسکتی ہے...... مگر اب اس کے دل کے شیشے میں بال آچکا ہے۔ وہ پروفیسر کے گھر رہنا نہیں چاہتی۔ چند روز پہلے ہونے والی مار پیٹ کے بعد تو وہ پروفیسر کی شکل دیکھنے کی روادار نہیں رہی۔ وہ بڑی حساس لڑکی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ پروفیسر نے اس بچے کو قتل کیا ہے جو اس دنیا میں بھی نہیں آیا تھا۔ وہ ایک قاتل کے گھر میں زندگی نہیں گزار سکتی۔''

میاں بیوی کے اس جھگڑے کا اختر کے قتل سے بظاہر کوئی تعلق نہیں بنتا تھا۔ دونوں علیحدہ علیحدہ معاملات تھے۔ اس واقعے سے بس یہ فائدہ ہوا کہ اس کیس میں میری دلچسپی پھر بیدار ہوگئی۔ اگلے روز میں نے پروفیسر رحمانی سے ملاقات کی۔ اس کے خیالات جاننا بھی ضروری تھا۔ ہماری یہ ملاقات پروفیسر کے گھر میں ہوئی۔ وہ بھی پہلے سے بہت دبلا نظر آرہا تھا۔ داڑھی بڑھی ہوئی، بال الجھے ہوئے اور چہرے پر بے رونقی۔ اس کے سیاہی مائل ہونٹ جو چند ماہ پہلے بہت سرخ تھے۔ گواہی دے رہے تھے کہ وہ سگریٹ اور شراب نوشی کثرت سے کررہا ہے۔ وہ بالکل فنکار ٹائپ آدمی نظر آرہا تھا۔ اس کے چہرے کی سب سے نمایاں چیز اس کی آنکھیں تھیں جن میں ہر وقت کوئی بھید سا چھپا لگتا تھا۔ اس نے میرے سوالوں کے جواب چڑچڑے پن سے دیئے۔ اس کا خیال تھا کہ یہ ان کا گھریلو معاملہ ہے اور قابل دست اندازی پولیس نہیں۔ اس نے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔

''معلوم نہیں اس لڑکی نے کیوں ہماری خوشیوں کو برباد کیا ہے۔ میں اسے صرف اپنی شاگرد سمجھتا تھا اور اب بھی سمجھتا ہوں۔ یہ بات غلط ہے کہ میں نے اسے مارفیا کے ٹیکوں کا عادی بنایا ہے۔ وہ پہلے سے اس عادت کا شکار تھی۔ میں تو انسانیت کی بنیاد پر اس کی دلجوئی کرتا تھا اور اس کوشش میں تھا کہ وہ یہ نشہ چھوڑ دے۔ وہ خوبصورت ہونے کے علاوہ ذہین بھی تھی اور اس میں بڑی صلاحیتیں تھیں۔ میں چاہتا تھا وہ اپنی زندگی کو اپنے ہاتھوں بربادی کی طرف

نہ دھکیلے۔ مجھے معلوم تھا کہ روبینہ مجھ پر شک کر رہی ہے مگر میں سمجھتا تھا کہ میری نیت ٹھیک ہے تو جلد ہی اس کا شک بھی دور ہو جائے گا۔ یہ تو معلوم ہی نہیں تھا کہ حالات ایسا رخ اختیار کریں گے۔ میں نے بہت سوچا ہے لیکن کچھ پتہ نہیں چلتا کہ اس لڑکی نے مجھ پر یہ الزام کیوں لگایا ہے۔ یہ سراسر جھوٹا اور بے بنیاد الزام ہے۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس نے یہ سب کچھ کسی سازش کے تحت کیا ہے۔''

میں نے پروفیسر سے پوچھا۔''آپ نے اس لڑکی سے دوبارہ رابطہ کرنے کی کوشش کی؟''

وہ بولا۔''ہاں...... میں چند روز پہلے خود کشمیر گیا تھا۔ چمکور میں اس کے دیئے ہوئے پتے پر ڈھونڈتا رہا ہوں کچھ خبر نہیں ملی۔ لگتا ہے وہ پتہ ہی فرضی تھا۔''

میں نے پوچھا۔''یہاں وہ کس کے پاس رہتی تھی؟''

پروفیسر رحمانی نے بتایا۔''ایک نرس کے گھر میں رہتی تھی۔ نرس اپنی نوکری سے ڈس مس ہو گئی تھی، وہ اور اس کا شوہر شہر چھوڑ کر جا چکے ہیں۔ کوشش کے باوجود مجھے ان کا پتہ بھی نہیں مل سکا۔''

پروفیسر رحمانی کی باتوں سے کچھ بھی اندازہ لگانا مشکل تھا۔ وہ گناہگار بھی ہو سکتا تھا اور بے گناہ بھی۔ اس کی بے گناہی کا ثبوت وہ لڑکی ہی دے سکتی تھی جس نے اس پر الزام لگایا تھا مگر وہ کہیں مل نہیں رہی تھی۔ اس سے یہ شک بھی پیدا ہوا کہ ہو سکتا ہے پروفیسر کو کسی سازش کا نشانہ بنایا گیا ہو۔ سازش کا خیال ذہن میں آتے ہی دھیان نرائن پوری کی طرف چلا جاتا تھا۔ وہ پروفیسر کا رقیب رُوسیاہ تھا اور ویسے بھی اوباش مشہور تھا۔ اس سے کسی بھی چھوٹے یا بڑے جرم کی توقع کی جا سکتی تھی۔ میں نے پروفیسر کو کریدا تو اس نے بھی خیال ظاہر کیا کہ ممکن ہے یہ چکر نرائن پوری کا چلایا ہوا ہو۔ میں نے پروفیسر سے کہا کہ وہ اپنے طور پر اس اینگلو انڈین لڑکی کی تلاش جاری رکھے۔ میں نرائن پوری سے سن گن لینے کی کوشش کرتا ہوں۔

☆======☆======☆

چند روز بعد کی بات ہے۔ میں نے اپنے دو کانسٹیبلوں کو بھیجا کہ وہ نرائن پوری کو تھانے لے آئیں۔ کانسٹیبل ایک گھنٹے بعد خالی ہاتھ واپس آ گئے۔ انہوں نے بتایا کہ نرائن نے آنے سے انکار کر دیا ہے۔ وہ کہتا ہے میں تمہارے تھانیدار کا غلام نہیں ہوں کہ ہر دوسرے تیسرے دن حاضری لگواتا رہوں۔ میں نے یہ سب کچھ بڑے صبر و تحمل سے سنا اور تھانے سے اٹھ کر بذات خود اس کے پتے پر جا پہنچا۔ وہ ان دنوں شہر کے ایک بدنام ہوٹل میں کمرہ لے کر رہ رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس ہوٹل میں ہر ناجائز کام ہوتا ہے مگر ہوٹل کا مالک ایک اعلیٰ سرکاری افسر کا بہنوئی تھا، لہٰذا وہ پولیس کی ناک کے نیچے سب کچھ کر رہا تھا۔ اس کا نام تو کچھ اور تھا مگر

سب اسے ماسٹر تارا سنگھ کے نام سے پکارتے تھے۔ میں ہوٹل کے کمرے میں داخل ہوا تو پورا ہال تمباکو اور چرس کے دھوئیں سے بھرا ہوا تھا۔ بہت سے غنڈہ صورت اوباش افراد یہاں وہاں بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ میں سادہ لباس میں تھا۔ اس کے باوجود ایک دو افراد نے مجھے پہچان لیا۔ میں سیدھا اس میز کی طرف گیا جہاں نرائن پوری چار دوسرے مشٹنڈوں کے ساتھ بیٹھا تاش کھیل رہا تھا۔ وہ بڑی آزادی سے شراب بھی پی رہے تھے۔ ان دنوں مشرقی پنجاب میں میزوں پر ایسے ہی کھلے عام مے نوشی ہوتی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی نرائن اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ ہال میں موجود لوگ بھی سمجھ گئے کہ کوئی گڑبڑ ہونے والی ہے۔

میں نے نرائن پوری کے سامنے پہنچ کر کہا۔''کیوں بھئی تم زیر تفتیش ہو اور میں نے تمہیں تھانے بلایا تھا۔''

وہ بولا۔''تھانیدار! تھانے بلاؤ گے تو بڑا پچھتاؤ گے۔''

میں نے کہا۔''اچھا تم نے جو سانپ نکالنا ہے آج نکال ہی لو میں تمہیں تھانے لے کر جاؤں گا۔''

وہ زہر خند سے بولا۔''تم جیسے بڑے مر گئے، ہمیں تھانے لے جاتے لے جاتے۔''

میں نے کہا۔''تو ٹھیک ہے۔ جہاں دوسرے مرے ہیں مجھے بھی مار دو۔ میں بھی اسی لیے آیا ہوں۔''

نرائن کا ایک مُگھنا ساتھی جس کا قد چار فٹ سے زیادہ نہیں تھا اور آنکھوں میں تیز چمک تھی کرسی پر پاؤں رکھ کر بولا۔''بڑی اکڑ ہے بھئی اس مُسلے میں۔''

ایک دوسرا ساتھی بولا۔''آج پھر اپنے رشتے داروں کو باہر کھڑا کر آیا ہوگا۔''

''نہیں آج اکیلا آیا ہوں۔'' میں نے کہا۔''اور تھانیدار بن کر بھی نہیں آیا۔ عام بندے کی طرح آیا ہوں۔ لڑنا چاہتے ہو تو دل کھول کر لڑ لو۔ پولیس مقابلے کا کیس نہیں بناؤں گا اور ہندو مسلم فساد کرانا چاہتے ہو تو وہ شوق بھی پورا کر لو۔''

نرائن گرج کر بولا۔''ہندو مسلم فساد تو پھر ضرور ہوگا اور یہ آگ بھڑکنے کے ذمہ دار تم ہو گے۔ تمہیں سرکار نے وردی اس لیے نہیں دی تھی کہ ہندو جاتی کو ذلیل کرنے کا ٹھیکہ لے لو۔ تم نے پروفیسر رحمانی کے ساتھ مل کر ایک ہندو لڑکی کو مسلمان ہونے پر مجبور کیا اور اسے اپنے گھر میں ڈالا۔ جب اس نے تمہارے شکنجے سے نکلنا چاہا تو اسے اتنی بے دردی سے مارا گیا کہ اس کا بچہ ضائع ہو گیا۔ تم نے ہماری جاتی کے منہ پر کالک ملی ہے ہم تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے...... اور اب وہ لڑکی بھی تمہارے پاس نہیں رہے گی......''

اس کے ساتھی نے چیخ کر کہا۔ ''تو اس کتے بدکار پروفیسر کا طرفدار بن کر آیا ہے نا...... تیرا ایسا حشر کریں گے کہ پورے شہر کو نصیحت ہوگی۔'' اس نے نصف بھری ہوئی بوتل گھما کر میرے سر پر ماری۔ بوتل میرے کندھے کو چھوتی ہوئی ایک دوسری میز پر گری۔ میں نے نرائن کے منہ پر بھرپور گھونسہ مارا۔ وہ پشت کے بل میز پر گرا۔ اس کے ساتھی مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ میں بھی پوری طرح تیار تھا۔ میں نے ان میں سے دو کو سخت قسم کی چوٹیں لگائیں اور تیسرے ٹھگنے کو پوری قوت سے دھکیل کر دیوار پر دے مارا۔ نرائن ایک کرسی لے کر مجھ پر حملہ آور ہوا تو میں نے ایک چھوٹی میز کو ڈھال کے طور پر استعمال کیا اور نرائن کا وار بچانے کے بعد اس کی پسلیوں پر ایسی ٹھوکر ماری کہ وہ بلبلاتا ہوا دور جا گرا۔ یہ سارا جھگڑا میں نے جان بوجھ کر مول لیا تھا اور اس کی ایک خاص وجہ تھی۔ مگر میرا مقصد پورا ہونے سے پہلے ہی ہال کی بتی چلی گئی اور ہر طرف چیخ و پکار ہونے لگی۔ کچھ دیر بعد جب دوبارہ روشنی ہوئی تو ہال کباڑ خانے کا منظر پیش کر رہا تھا۔ ہر طرف ٹوٹی ہوئی کرسیاں، الٹی ہوئی میزیں اور برتن پڑے تھے۔ یوں لگتا تھا چند لمحوں میں جنوں کا قافلہ یہاں سے گزر گیا ہے۔ مجھ سے دھینگا مشتی کرنے والے چاروں افراد نرائن سمیت غائب ہو چکے تھے۔

اس واقعے کے ٹھیک تین گھنٹے بعد رات کے ساڑھے نو بجے ایک کار تھانے کے دروازے پر آ کر رکی۔ اس میں سے باج بھائی تین دوسرے افراد کے ساتھ برآمد ہوا اور سب تیز قدموں سے میری طرف بڑھے۔ ان کے قدموں کی تیزی سے اندازہ ہو رہا تھا کہ کوئی اہم خبر ہے۔ باج بھائی کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اس نے اندر آتے ہی کہا۔

''غضب ہو گیا انسپکٹر! روبینہ کو میرے گھر سے اغوا کر لیا گیا ہے۔''

''کب...... کیسے؟''

''ابھی کوئی آدھ گھنٹہ پہلے۔ میں روز سونے سے پہلے ایک دفعہ اسے ضرور دیکھتا ہوں۔ آج اس کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا تو اس نے کھولا نہیں۔ اندر بتی بھی جل رہی تھی۔ ورنہ میں سمجھتا کہ شاید وہ سو گئی ہے۔ کھڑکی سے جھانکنے کے لیے کمرے کی پچھلی طرف گیا تو وہاں کھڑکی چوپٹ کھلی تھی اور کھڑکی سے باہر روبینہ کا ایک جوتا پڑا تھا۔ پھر مجھے اس کے کان سے گرا ہوا ایک جھمکا نظر آ گیا۔ یہ دیکھیے...... یہ رہا وہ جھمکا۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک طلائی جھمکا میرے سامنے رکھ دیا۔ بلاشبہ وہ روبینہ کا ہی تھا۔

میں نے کہا۔ ''باج بھائی! آپ بڑی حیرت ناک بات بتا رہے ہیں۔ بھرے پُرے گھر سے ایک لڑکی اٹھالی گئی اور کسی کو پتہ نہ چلا۔ ابھی تو کچھ زیادہ وقت بھی نہیں ہوا۔ کہاں تھے

آپ سب لوگ کہیں......؟''

''کہیں وہیں کچھ نہیں انسپکٹر۔'' باج بھائی نے میری بات کاٹی۔ ''جو کرنا ہے جلدی کرو۔ ورنہ معلوم نہیں وہ بے چاری کہاں سے کہاں چلی جائے۔ اگر اسے کچھ ہو گیا تو اس کا ذمے دار صرف اور صرف میں ہوں گا۔ میں اسے پناہ دے کر اس کی رکھشا نہیں کر سکا...... مجھے...... مجھے تو یہ سب اس مورکھ نرائن کا کام لگتا ہے۔ صرف ایک گھنٹہ پہلے میں نے اسے اپنی گلی سے گزرتے دیکھا تھا۔ اس کے ساتھ تین چار لڑکے بھی تھے۔ سارے کے سارے بری صورتوں والے اگر وہ روبینہ کو لے گئے ہیں تو بھگوان جانے اس کے ساتھ کیا کریں۔ تم ذرا جلدی کرو۔''

میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ''گھبرائیے نہ باج جی! اسے کچھ نہیں ہوگا۔ کم از کم صبح تک وہ بالکل محفوظ ہے۔''

''کیا مطلب...... تم اتنے یقین سے یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟''

''اس لیے باج بھائی کہ روبینہ ابھی آپ کے گھر میں ہی ہے۔''

''میرے گھر میں...... وہ کیسے؟''

''جیسے آپ نے اسے رکھا ہوا ہے۔''

''کک...... کیا کہہ رہے ہو۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی۔''

''سمجھ تو مجھے بھی تمہاری نہیں آ رہی باج بھائی۔ یہ تمہارے اللہ توبہ کرنے کے دن تھے۔ اس عمر میں تمہیں کیا سوجھی یہ کھیل کیوں کھیلا تم نے؟''

''کون سا کھیل؟'' باج بھائی کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی جا رہی تھیں۔ اس کے ساتھ آنے والے بھی منہ پھاڑے میری طرف دیکھ رہے تھے۔

میں نے کہا۔ ''وہی کھیل جس نے ایک بے گناہ نوجوان کی جان لی۔ ایک ہنستے بستے گھر کو اجاڑا اور ایک نیک چلن لڑکی کو زندہ درگور کیا۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ میں نے لڑکی کو گھر میں چھپا رکھا ہے اور تمہیں رپورٹ لکھوانے آ گیا ہوں کہ وہ اغوا ہو گئی ہے۔''

''سو فیصد ایسا ہی ہے۔''

باج بھائی تنک کر کھڑا ہو گیا۔ غصے سے کانپتا ہوا بولا۔ ''یا تمہارا دماغ خراب ہے یا تم انتہائی درجے کے گھٹیا آدمی ہو تمہیں معلوم ہے کس پر کیا الزام لگا رہے ہو۔''

میں نے بھی تند لہجے میں کہا۔ ''باج بھائی! آرام سے بیٹھ جاؤ۔ میں تم سے زیادہ گرم

لہجے میں بات کر سکتا ہوں۔ بیٹھ جاؤ اور سنو جو کچھ میں کہہ رہا ہوں۔ اگر یہ جھوٹ ہے تو پھر جتنا چاہے چیخنا چلانا۔"

میرے اشارے پر ہیڈ کانسٹیبل نے اسے کندھے سے تھام کر نیچے بٹھا دیا۔ میں نے کہا۔ "باج بھائی! تم انسان کے روپ میں شیطان ہو۔ تم وہ شخص ہو جو چور کو کہتا ہے چوری کر اور سپاہی کو کہتا ہے اسے پکڑ۔ تم نے ہمیشہ خود ہی آگ لگائی ہے اور خود ہی اسے بجھا کر نیک نامی کماتے رہے ہو۔ تم انتہائی درجے کے مکار اور خود غرض آدمی ہو۔ تم عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جلسوں کے لیے چندے بھی دیتے رہے ہو اور خود ہی ان جلسوں پر حملے بھی کرواتے رہے ہو۔ محرم پر سبیلیں بھی تم نے ہمیشہ لگائی ہیں اور عزہ داروں پر اینٹیں بھی تمہارے کہنے پر برسائی جاتی ہیں۔ ایک طرف تم پیروں فقیروں کے مزاروں پر چادریں چڑھاتے ہو اور دوسری طرف مہاسبھا اور جن سنگھ کے اکھاڑوں کی خفیہ سرپرستی کرتے ہو۔ درحقیقت نہ تم مسلمانوں کے خیر خواہ ہو اور نہ ہندوؤں کے۔ تم صرف اپنے نفس کے پجاری ہو اور اپنی حرص و ہوس کے غلام......"

میرا دل چاہ رہا تھا کہ اس بدبخت فریبی کے منہ پر جوتا مارنے کے لیے ایک لمبی چوڑی تقریر اس کے سامنے کروں، لیکن مجھے تقریر کرنا نہیں آتی تھی اور ابھی میں اس سانپ کی ساری کینچلیوں سے واقف بھی نہیں تھا...... باج بھائی کا رنگ پیلا پڑ چکا تھا۔ مگر گردن میں ابھی تک اکڑ تھی۔ اس نے اپنی ڈوریے والی نہرو کیپ کو سدھا کیا اور ہاتھ نچا کر بولا۔

"بڑے افسوس کی بات ہے انسپکٹر! تم اس شخص کو بھول رہے ہو جو چند گھنٹے پہلے لڑکی کو اغوا کرنے کی دھمکی دیتا رہا ہے اور دوشی مجھے ٹھہرا رہے ہو۔ بھگوان جانے تمہاری عقل کو کیا ہو گیا ہے۔ ان الزام تراشیوں کا خوفناک نتیجہ بھگتنا پڑے گا تمہیں۔"

میں نے کہا۔ "باج بھائی...... نرائن جیسا بھی ہے تم سے ہزار درجے بہتر ہے۔ وہ غنڈہ ضرور ہے لیکن بے ضمیر نہیں۔ یہ تمہارے گلے میں جو پھندا نظر آ رہا ہے اس کا ڈالا ہوا ہے۔"

میں نے سب انسپکٹر کو اشارہ کیا۔ وہ دوسرے کمرے سے نرائن پوری کو سامنے لے آیا۔ نرائن پوری اطمینان سے میرے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے ساتھ اس کا ٹھگنا دوست بھی تھا۔ ٹھگنے کو دیکھ کر باج بھائی کی اکڑی ہوئی گردن ڈھیلی پڑنے لگی۔ یہ ٹھگنا دراصل باج بھائی کا گھریلو ملازم تھا۔ غضب کا ہوشیار اور چوکس تھا۔ باج بھائی کے خلاف مخبری اسی ٹھگنے نے کی تھی۔

میں نے کہا۔ "اب کیا خیال ہے باج بھائی! بات کچھ سمجھ میں آ رہی ہے۔" اب باج بھائی کی بولتی بند ہو رہی تھی۔ میں نے کہا۔ "باج بھائی! تیری حرامزدگی کا پتہ ہمیں ایک ہفتہ

پہلے ہی چل گیا تھا مگر ہمیں معلوم تھا تُو چکنے گھڑے کی طرح اپنے پنڈے پر پانی کی بوند نہیں ٹھہرنے دے گا۔ اپنے تعلقات کے زور پر عدالت میں کیس کمزور کرنا تیرے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا اس لیے ہم تجھے ٹھیک ٹھاک طریقے سے پھنسانا چاہتے تھے اور میرا خیال ہے ہمیں ناکامی نہیں ہوئی۔"

باج بھائی کی گردن ڈھیلی پڑ گئی اور وہ خوفزدہ بوڑھے بکرے کی طرح ہماری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے کہا۔ "باج بھائی! یہ ثابت ہو گیا ہے کہ تم ایک ذلیل انسان ہو بلکہ "ذلیل" کا لفظ تمہاری مذمت کرنے کے لیے بہت ناکافی ہے تم پروفیسر کے واقف کاروں میں سے تھے۔ جب تمہیں پتہ چلا کہ پروفیسر اپنی خوبصورت شاگرد شاردا سے شادی کر رہا ہے تو تم حسد کی آگ میں جلنے لگے۔ اس موقعے پر تم نے اپنے ایک دوست سے ٹیلیفون پر ایک یادگار فقرہ کہا تھا۔ تم نے کہا تھا۔ "یار! اس گل بدن نے ایک بڈھے کے گلے ہی لگنا تھا تو کیا اپنے دھرم میں کوئی بڈھا باقی نہیں رہا تھا۔ ہم مر گئے تھے......" اس فقرے سے تمہارے کردار کی ہر گرہ کھل جاتی ہے۔ تمہیں شاردا اور پروفیسر رحمانی کی شادی کا بے حد رنج تھا اور تم کسی طرح یہ شادی رکوانا چاہتے تھے۔ مگر سامنے آنے کی نہ تم میں ہمت تھی اور نہ تم ایسا کر سکتے تھے۔ تم اوپر سے ان کے راستے میں کانٹے بوتے رہے۔ جب کوئی ترکیب بھی کامیاب نہ ہوئی اور شادی یقینی ہو گئی تو تم نے ایک شیطانی قدم اٹھایا۔ تم نے پروفیسر کو جان سے مارنے کی کوشش کی۔ جب وہ شاردا کے گھر سے چائے پی کر واپس آ رہا تھا۔ تمہارے آدمی نے اس پر اپنی گاڑی چڑھا دی اس ٹکر سے پروفیسر صاحب تو بچ گئے مگر ان کا شاگرد اختر ہلاک ہو گیا اور میری اپنی جان بھی خطرے میں پڑی۔ اس واقعے میں کسی کا دھیان تیری طرف نہیں گیا۔ ڈیڑھ دو ماہ بعد پروفیسر سے شاردا کی شادی ہو گئی اور وہ شاردا سے مسز روبینہ بن گئی۔ مگر تم نے پھر بھی ہمت نہ ہاری اور اپنے ارادوں پر قائم رہے۔ تم نے درپردہ میاں بیوی میں نفاق کا بیج بونا شروع کیا۔ کسی طرح مینا نامی ایک اینگلو انڈین لڑکی تمہارے ہتھے چڑھ گئی۔ یہ لڑکی مارفیا کی عادی تھی اور نشہ حاصل کرنے کے لیے ہر کام کر سکتی تھی۔ تم نے اسے مصوری سکھانے کے بہانے پروفیسر کے پاس بھرتی کروا دیا اور اس کے ذریعے اپنے منصوبے کو آگے بڑھانے لگے۔ گزرنے والے ہر دن کے ساتھ یہ لڑکی پروفیسر اور روبینہ کے درمیان ایک دیوار اٹھاتی چلی گئی۔ تم ہر قدم پر اسے "مفید مشورے" دیتے رہے اور گھر اجاڑنے کے زود اثر نسخے بتاتے رہے۔ آخر تمہیں اپنے منحوس ارادوں میں کامیابی ہوئی۔ شادی کے چار ہی ماہ بعد ان دونوں میں طلاق کی نوبت آ گئی۔ روبینہ کے والدین انگلینڈ جا چکے تھے۔ تم بڑی عیاری سے روبینہ

کے سرپرست بن کر اسے گھر لے گئے۔ پروفیسر ایک دو دفعہ روبینہ کو منانے کے لیے تمہارے گھر میں آیا۔ مگر تم نے اسے باہر باہر سے واپس بھیج دیا۔ تم نے اپنی شاطرانہ کوششوں سے ان دونوں کو ایک دوسرے سے اتنا دور کر دیا کہ واپسی کا کوئی راستہ باقی نہ رہا...... باج بھائی! میں کوئی غلط بات تو نہیں کہہ رہا ہوں؟''

باج بھائی کو سانپ سونگھ چکا تھا بلکہ کہنا چاہیے، سانپ کو سانپ سونگھ چکا تھا۔ وہ مُردے کی طرح آنکھیں کھولے مجھے دیکھے جا رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''تم اگر تھوڑا سا صبر اور کرتے تو شاید اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتے مگر تمہارے اندر کی خباثت زیادہ دیر چھپی نہ رہی۔ ایک روز تم نے تنہائی میں روبینہ سے شادی کی خواہش ظاہر کر دی۔ روبینہ پر یہ خبر بجلی بن کر گری۔ وہ تمہیں اپنے باپ کی جگہ سمجھتی تھی اور دل کی گہرائی سے تمہارا احترام کرتی تھی۔ وہ سارا دن اور ساری رات روتی رہی۔ اگلے روز اس نے خاموشی سے تمہارا گھر چھوڑ دیا۔ روبینہ کو نہ پا کر تم سخت پریشان ہوئے تمہاری نیک نامی خطرے میں پڑ سکتی تھی۔ تم نے فوری طور پر اسے تلاش کرایا اور ریلوے اسٹیشن پر جا پکڑا اس کی منت سماجت کر کے اور معافی مانگ کر تم اسے واپس لے آئے۔ تم نے اس کے سامنے رام کرشن کی مورتیوں پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی کہ اب کبھی ایسی بات تمہاری زبان پر نہیں آئے گی۔

مگر یہ زبانی کلامی بات تھی۔ تمہارے دل میں تو وہی الاؤ بھڑک رہے تھے۔ تم ہوس کے پجاری تھے۔ تم روبینہ کو نہ صرف اس کی خوبصورتی کی سزا دینا چاہتے تھے بلکہ اس بات پر بھی مزا چکھانا چاہتے تھے کہ اس نے ایک مسلمان کے لیے اپنا دھرم بدلا ہے...... تم اسے ہرگز فراموش نہیں کر سکتے تھے۔''

میں نے باج بھائی کے ٹھگنے ملازم ہری لال سے پوچھا۔ ''کیوں ہری لال میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں؟''

اس نے اپنا ہانڈی جیسا سر زور زور سے اقرار میں ہلایا۔ میں نے کہا۔ ''ہری سب کچھ جانتا ہے۔ اسے پتہ تھا کہ تم اندر سے اب بھی کھوٹے ہو۔ تم روبینہ کو اپنے گھر سے کسی نامعلوم مقام پر پہنچانا چاہتے ہو۔ مگر یہ کام اس طرح کرنا چاہتے ہو کہ تم پر کوئی الزام نہ آئے۔ تم کسی اچھے موقعے کی تلاش میں تھے اور اس تلاش میں کئی مہینے بھی لگ سکتے تھے ہری نے آ کر ہمیں سب کچھ بتایا تو ہم نے تمہارا کام آسان کر دیا...... ابھی تھوڑی دیر پہلے جب ہم نے تمہارے دست راست ماسٹر تارا سنگھ کے ہوٹل میں ہنگامہ کیا اور نرائن نے سرعام دھمکی تھی کہ وہ روبینہ کو اٹھا کر لے جائے گا۔ تمہارے منہ سے رال ٹپکنے لگی۔ اس ہنگامے کی خبر پاتے ہی تم اپنی

اصلیت پر آ گئے اور روبینہ کو اپنی بدنیتی کے شکنجے میں جکڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ تمہیں یقین تھا کہ روبینہ کی گمشدگی کا الزام سراسر نرائن پر ہی آئے گا...... ہمیں یہ امید نہیں تھی کہ تم اتنی جلدی کرو گے۔ ہمارا خیال تھا ایک دو دن تک روبینہ کے بارے میں کوئی خبر سننے کو ملے گی، لیکن تم نے تو دو گھنٹے بھی صبر نہ کیا اور رپورٹ لکھوانے تھانے چلے آئے۔''

باج بھائی کی شکل دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ چہرا مٹی کے ٹوٹے پیالے کی طرح ہو رہا تھا۔ آخر وہ کراہ کر بولا۔

''انسپکٹر! میں تم سے اکیلے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''جب سے میں نے وردی پہنی ہے اکیلے میں بات نہیں کی۔ اکیلے میں بات کرنے والا ہوتا تو آج میں بھی باج رائے ہوتا۔ تم نے جو کہنا ہے سب کے سامنے کہو۔'' خوف سے اس کا سارا جسم لرزنے لگا۔ شاید پھانسی کا پھندا اسے اپنی آنکھوں کے سامنے نظر آ رہا تھا۔ کہنے لگا۔ ''انسپکٹر صاحب! ایک بار...... میں تمہاری منت کر لیتا ہوں۔ میں تمہیں سب کچھ بتاتا ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''باج بھائی! اب تیرے پاس بتانے کے لیے اور کچھ نہیں۔ یہ بات میں اچھی طرح جانتا ہوں۔''

باج بھائی کی قابل رحم حالت دیکھ کر اس کا ایک ساتھی بولا۔ ''انسپکٹر صاحب! آپ ایک پُنی انسان پر قتل کا الزام لگا رہے ہیں، یہ کوئی چھوٹی بات نہیں ہے۔''

میرا سب انسپکٹر بولا۔ ''الزام ہم نہیں لگا رہے۔ شہادتیں لگا رہی ہیں۔ وہ دیکھیے...... وہ سامنے کھڑی ہوئی آپ کی گاڑی بھی یہی الزام لگا رہی ہے۔ اس گاڑی نے مقتول اختر کو ٹکر ماری تھی۔ اس کا سبز رنگ جینئین نہیں ہے۔ اس کے نیچے اب بھی کہیں کہیں کالا رنگ موجود ہو گا اور وہ پینٹر اور ڈینٹر بھی ماشاءاللہ حیات ہے جنہوں نے واردات کے اگلے روز اس گاڑی کی جون بدلی تھی۔'' باج بھائی نے آنکھیں بند کر کے سر کرسی کی پشت سے ٹکا دیا۔ واقعی اس کے پاس اب کہنے کو کچھ نہیں تھا۔

☆======☆======☆

اس واقعے کے ایک ہی گھنٹے بعد روبینہ کو باج بھائی کے گھر کی ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی سے برآمد کر لیا گیا۔ اس کی مشکیں کسی ہوئی تھیں اور منہ میں کپڑا تھا۔ باج بھائی نے اسے اگلے روز علی الصبح کسی نامعلوم مقام پر پہنچا دینا تھا۔ دو تین روز میں اس لڑکی کو بھی تلاش کر لیا گیا۔ جس نے باج بھائی کے کہنے پر پروفیسر رحمانی اور روبینہ رحمانی کی زندگی میں نہ ختم

ہونے والا زہر گھولا تھا۔ اس لڑکی نے عدالتی کارروائی کے دوران جج کے روبرو اعتراف کیا کہ اس نے پروفیسر پر بہتان باندھا تھا۔ اس روز وہ ایک ہفتے سے مافیا کے ایک انجکشن کے لیے تڑپ رہی تھی۔ باج بھائی نے انجکشن فراہم کرنے کے لیے شرط لگا دی تھی کہ میں روبینہ رحمانی کے سامنے عزت لٹنے کا ڈرامہ رچاؤں اور پھر خاموشی سے کسی طرف نکل جاؤں۔ اس نے بتایا کہ باج بھائی وقتاً فوقتاً اس سے رنگ رلیاں مناتا رہا ہے اور اس کے چند عمر رسیدہ دوست بھی اس کھیل میں شریک رہے ہیں...... باج بھائی کے پاس اب بچ نکلنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اس پر قتلِ عمد کا مقدمہ چلا اور بعدازاں ہائی کورٹ سے عمر قید کی سزا ہوئی۔

باج بھائی کی گرفتاری کے دو ماہ بعد وہ ستمبر کی ایک خوبصورت نکھری ہوئی شام تھی۔ ہر چیز دھلی دھلی اور مہکی ہوئی تھی۔ پروفیسر عظیم رحمانی کی چھوٹی سی کوٹھی میں رنگین قمقموں کی بہار آئی ہوئی تھی۔ میاں بیوی اپنی شادی کی پہلی سالگرہ اہتمام سے منا رہے تھے۔ زیادہ خوشی کی بات یہ تھی کہ اس تقریب میں روبینہ کے گھر والے بھی شریک ہو گئے تھے۔ اس کا بڑا بھائی اور والدہ خاص طور پر انگلینڈ سے پہنچے تھے۔ اپنے زرق برق لباس میں روبینہ ہمیشہ سے زیادہ خوبصورت نظر آ رہی تھی۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ ماضی کی تمام غلطیاں بھول کر پھر محبت کی وادی میں قدم رکھ چکی ہے۔ میں نے پروفیسر کو سالگرہ کی مبارکباد دیتے ہوئے کہا۔ ''اچھا پروفیسر صاحب! اب اجازت دیجیے ورنہ ایک پولیس والے کی وجہ سے آپ کا فنکشن بدمزہ ہو جائے گا۔''

وہ خوش دلی سے بولا۔ ''آپ شکل سے ہرگز پولیس والے نہیں لگتے اور جن کو پتہ ہے وہ جانتے ہیں کہ آپ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔''

میں نے کہا۔ ''میں ایک شرط پر ٹھہر سکتا ہوں آپ یہ بتائیں کہ آپ کی مسز آپ کو ''سر'' کیوں کہتی ہیں؟''

وہ قہقہہ مار کر ہنس دیا۔ ''بھائی! اس بھلی مانس کو بہت دفعہ سمجھایا ہے لیکن وہ مانتی ہی نہیں۔ راز کی بات بتاؤں؟...... کہتی ہے جب بچہ ہو جائے گا تو ''سر'' کہنا چھوڑ دوں گی۔''

میں نے کہا۔ ''یاد رکھیے گا۔ کہیں آپ کے بچے بھی آپ کو عزت مآب اور عالی جناب وغیرہ نہ کہنے لگیں۔''

وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔

☆======☆======☆

اور وہ مر گئی

جس وقت فائر ہوا متوفیہ اپنے بستر پر سیدھی لیٹی ہوئی تھی جس زاویے سے گولی جسم میں داخل ہوئی تھی اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ قاتل زیادہ لمبے قد کا نہیں تھا یا اس نے بیٹھ کر گولی چلائی۔

صبح کوئی دس بجے کا وقت تھا۔ گاؤں کا نمبردار امداد علی دوسرے افراد کے ساتھ تھانے میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھیوں میں ایک تو اس کا کارندہ تھا جبکہ دوسرا گاؤں ہی کا ایک شخص تھا۔ میں اس کے چہرے سے واقف تھا لیکن نام معلوم نہیں تھا۔ تینوں افراد گھبرائے ہوئے اندر داخل ہوئے اور سلام کر کے میرے سامنے بیٹھ گئے۔ ان کی حالت سے صاف اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کوئی اہم خبر لے کر آئے ہیں۔

آخر نمبردار امداد علی نے اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔ ''تھانیدار صاحب...... ق......ق......قتل ہو گیا ہے۔''

''کس کا قتل؟'' میں نے تیزی سے پوچھا۔

''نور محمد کی بیوہ کا......''

میں نے کہا۔ ''امداد علی! تمہیں پتہ ہے مجھے ادھوری بات سے نفرت ہے۔ پورا واقعہ بتاؤ۔''

امداد علی ایک نوجوان چوہدری تھا۔ ایسے چوہدری اور نمبردار تھانیداروں سے دب کر رہنا اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ امداد علی میں بھی بڑی اکڑفوں تھی لیکن پانچ چھ مہینے پہلے یہ اکڑفوں ایک واقعے میں نکل گئی تھی...... بہرحال میرے کہنے پر امداد علی نے فوراً اپنی بات کی وضاحت شروع کر دی۔ اس نے کہا۔

''تھانیدار صاحب! آپ کو پتہ ہی ہو گا چار سال پہلے گاؤں میں تہرے قتل کی ایک واردات ہوئی تھی۔ ذیلداروں کا لڑکا نور محمد بھی قتل ہونے والوں میں شامل تھا۔ ہاجرہ، نور محمد کی بیوہ کا نام ہے۔ یہ محمد اشفاق جو میرے ساتھ آیا ہے ہاجرہ کا پڑوسی ہے۔''

میں نے محمد اشفاق کی طرف دیکھا۔ اس نے عام کاشتکاروں والا لباس پہن رکھا تھا۔

شیو بڑھی ہوئی تھی اس کی آنکھوں سے خوف جھانک رہا تھا۔

امداد علی نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''آج صبح سویرے محمد اشفاق کی گھر والی آگ لینے کے لیے ہاجرہ کے گھر گئی۔ اس نے بار بار دروازہ کھٹکھٹایا لیکن دروازہ نہیں کھلا۔ اشفاق کی بیوی پہلے ہاجرہ کو اور پھر اس کے بیٹے امتیازی کو آوازیں دیتی رہی...... آخر مایوس ہو کر اس نے اشفاق کو بتایا۔ اشفاق بھی کچھ دیر آوازیں دیتا رہا پھر دیوار پھلانگ کر اندر چلا گیا......''

میں نے نمبردار کو ٹوکتے ہوئے کہا کہ جب اشفاق یہاں موجود ہے تو پھر وہ کیوں بول رہا ہے۔ میں نے اشفاق سے مخاطب ہو کر کہا۔

''ہاں میاں تم بتاؤ۔ تم اکیلے ہی اندر گئے تھے یا کوئی اور بھی تھا۔''

وہ تھوک نگل کر بولا۔ ''جناب! اکیلا ہی تھا میں...... میں نے امتیازی اور اس کی ماں کو آوازیں دیں پر کوئی جواب نہ آیا۔ میں کمرے میں گیا تو چارپائی پر بہن ہاجرہ کی لاش پڑی تھی۔ میں بھاگ کر صحن میں آیا اور باہر والا دروازہ کھول کر شور مچا دیا۔ پوری گلی اکٹھی ہو گئی۔ بہن ہاجرہ کے پُتر امتیازی کا کہیں پتہ نہیں چل رہا تھا۔ ہم نے سمجھا کہ شاید قتل کرنے والے اسے ساتھ ہی لے گئے ہیں مگر تھوڑی دیر بعد وہ گھر کے اندر سے ہی مل گیا۔ وہ اناج والی کوٹھی میں چھپا ہوا تھا۔ اس نے روتے ہوئے بتایا کہ اس کی ماں کو کالے کپڑوں والے ڈاکو نے گولی ماری ہے اور اگر وہ یہاں نہ چھپ جاتا تو ڈاکو اسے بھی مار ڈالتا......''

میں نے نمبردار امداد علی سے پوچھا۔ ''تم کہہ رہے ہو کہ اشفاق کی بیوی صبح سویرے آگ لینے ہاجرہ کے گھر گئی تھی اور...... اس وقت خیر سے دس بج رہے ہیں۔ تم لوگ اتنی دیر سے اطلاع کیوں پہنچا رہے ہو؟''

امداد علی کے چہرے سے ظاہر تھا کہ وہ میرے اس سوال کے بارے میں پہلے سے جانتا ہے اس نے کہا۔ ''جناب! بات دراصل یہ ہے کہ واردات کا پتہ تقریباً سات بجے ہی چل گیا تھا۔ آدھ پون گھنٹہ تو یہ سوچتے سوچتے گزر گیا کہ پولیس کو اطلاع کون دے۔ پھر اشفاق میری حویلی پہنچا۔ وہ چاہتا تھا کہ مجھے ساتھ لے کر آپ کے پاس آئے، لیکن میں فصلوں پر گیا ہوا تھا۔ وہاں سے آیا ہوں تو ہم سیدھے آپ کے پاس حاضر ہو گئے ہیں۔''

یہ کوئی ایسی عجیب بات نہیں تھی۔ لوگ رپورٹ کرنے میں عموماً دیر کر دیتے ہیں۔ آج کل بھی کرتے ہیں اور اُس دور میں بھی کرتے تھے لیکن مجھے مقتولہ کے ہمسائے پر شک سا ہونے لگا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اس نے گلی میں جا کر شور مچایا اور بہت سے لوگوں کو واردات کے

بارے میں بتا دیا۔ اس کا مطلب تھا کہ قریباً تین گھنٹے پہلے واردات کی خبر گاؤں میں عام ہو چکی تھی۔ یہ گاؤں بڑا تھا لیکن بہت زیادہ بڑا بھی نہیں تھا۔ اگر تین گھنٹے پہلے عام لوگوں کو قتل کا پتہ لگ گیا تھا تو تھانے تک خبر کیوں نہیں پہنچی تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اشفاق کے بیان میں فرق ہے...... بہرحال میں نے فوراً ان لوگوں کو ساتھ لیا اور موقعۂ واردات کی طرف روانہ ہو گیا۔

گھر کے اندر اور باہر کافی لوگ اکٹھے ہو چکے تھے۔ میرے عملے نے انہیں ڈرا دھمکا کر پیچھے پیچھے ہٹایا۔ میں اس کمرے میں پہنچا جہاں خون ہوا تھا۔ مقتولہ کی لاش ابھی تک چارپائی پر پڑی تھی۔ بستر کی چادر خون سے سرخ ہو رہی تھی۔ کھدر کے پھولدار لحاف پر بھی دھبے تھے۔ نمبردار اور اشفاق وغیرہ کا بیان تھا کہ لاش کو اس کی جگہ سے ہلایا نہیں گیا۔ میں نے قریب سے دیکھا، لاش اکڑ چکی تھی۔ مقتولہ پر رائفل سے فائر کیا گیا تھا۔ گولی اس کی چھاتی پر لگی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق مقتولہ کی عمر تیس بتیس کے قریب تھی تاہم وہ دیکھنے میں جوان نظر آتی تھی۔ اس کے کانوں میں سونے کی بالیاں چمک رہی تھیں۔

نمبردار ایک روتے منہ بسورتے لڑکے کو میرے پاس لے آیا اور بتایا کہ یہ امتیازی ہے۔ لڑکے کی عمر تقریباً بارہ سال تھی۔ وہ ایک گورا چٹا صحت مند لڑکا تھا۔ رو رو کر اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ ایک طرح سے یہ لڑکا اس کیس کا سب سے اہم گواہ تھا۔ میں نے لڑکے کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اسے دلاسہ دیا۔ اس دوران میرا سب انسپکٹر موقعے کا نقشہ تیار کرنے میں مصروف ہو گیا۔ کمرے میں جدوجہد کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔ یوں لگتا تھا قاتل اندر آیا اور گولی مار کر خاموشی سے چلا گیا۔ گھر سے کوئی چیز چوری ہوئی تھی اور نہ سامان الٹ پلٹ کیا گیا تھا۔

میں لڑکے کو ساتھ لے کر دوسرے کمرے میں آ گیا۔ اس نے عام دیہاتی لڑکوں کی طرح دھوتی کرتہ پہن رکھا تھا۔ گلے میں چمڑے کا تعویذ تھا۔ کچھ دیر تسلی تشفی کی باتیں کرنے کے بعد میں نے لڑکے سے واقعے کی تفصیل پوچھی۔ اس نے اشکبار آنکھوں سے بتایا کہ وہ ماں کے ساتھ والی چارپائی پر لیٹا تھا (وہ رمضان کے دن تھے) اس کی ماں سحری کے لیے چاول بھگونے کے بعد آئی اور اپنی چارپائی پر لیٹ گئی۔ اس نے ماں سے کہا کہ وہ صبح روزہ رکھے گا اس لیے وہ اسے ضرور جگا دے۔ ماں نے وعدہ کر لیا لیکن امتیازی کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ شاید اسی بے یقینی کی وجہ سے نیند اس کی آنکھوں سے اُڑ گئی۔ ماں سو گئی لیکن وہ کروٹیں لیتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد اسے پیشاب آ گیا۔ وہ پیشاب کرنے باہر نکلا۔ واپس آیا تو کمرے میں

سایہ سا گھستا نظر آیا اس کے فوراً بعد دھماکے کی آواز اور ماں کی مدھم چیخ سنائی دی۔ امتیازی نے برآمدے کے اندر سے دیکھا۔ اس کی ماں بستر پر تڑپ رہی تھی اور کالے کپڑوں والا ایک شخص اس دوسری چارپائی پر جھکا ہوا تھا جہاں ایک منٹ پہلے امتیازی خود سو رہا تھا۔ وہ شخص اب امتیازی کو ڈھونڈ رہا تھا۔ موت امتیازی کی آنکھوں کے سامنے ناچنے لگی۔ وہ بیرونی دروازے کی طرف لپکنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ کالے کپڑوں والا باہر نکل آیا۔ امتیازی گھبرا کر اناج والی کوٹھڑی میں چھپ گیا...... اور صبح تک چھپا رہا۔

میں نے لڑکے سے مختلف سوال بھی پوچھے۔ اس نے بڑی اچھی طرح جواب دیئے۔ حالانکہ اس کی عمر زیادہ نہیں تھی لیکن وہ سمجھداری کی باتیں کرتا تھا۔ شاید یہ اس یتیمی کا اثر تھا جو چار سال پہلے اس کے حصے میں آ چکی تھی۔ باپ کے بعد اب ماں نے بھی ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ وہ اب ایک بن ماں باپ کا بچہ تھا۔ میرے سوالوں کے جواب میں اس نے بتایا کہ وہ ماں بیٹا گھر میں اکیلے ہوتے تھے۔ باہر کے دروازے اور کمرے کے دروازے کو اندر سے کنڈی لگا کر سوتے تھے۔ لالٹین بھی ساری رات جلتی رہتی تھی۔ اس نے بتایا کہ وہ حملہ آور کی شکل ٹھیک طرح دیکھ نہیں سکا۔ اس نے اپنا چہرہ کالی پگڑی میں چھپا رکھا تھا۔ تاہم اس کی پیشانی اور آنکھوں کو دیکھ کر شک پڑتا تھا کہ وہ سرداروں کا آدمی ہے۔

میں نے لڑکے سے پوچھا۔ ”یہ سردار کون ہیں؟“

لڑکے نے کہا۔ ”وہی جی جنہوں نے میرے ابے کو قتل کیا تھا۔ سرداروں کا بڑا لڑکا ماکھا بھی کالے رنگ کا ہے اس کی آنکھیں بڑی بڑی اور ماتھا اونچا ہے۔ کیا پتہ اسی نے میری ماں کو گولی ماری ہو۔“

اس موقعے پر میں نے ضروری سمجھا کہ نمبردار امداد علی اور لڑکے کے سرپرست اس کے تایا رمضان سے کچھ بات چیت کروں۔ میں نے لڑکے کو بھیج کر ان دونوں کو اندر بلایا اور ان سے پوچھا کہ یہ سرداروں کا کیا چکر ہے اور نور محمد کے قتل کی کیا وجہ تھی۔ میرے اس سوال کے جواب میں نمبردار نے کہا۔

”جناب! یہ کوئی چار سال پہلے کی بات ہے۔ اس وقت آپ اس تھانے میں نہیں پہنچے تھے۔ ان دنوں سردار لچھمن سنگھ کا بڑا زور تھا۔ اردگرد کے دیہات میں سب اس سے ڈرتے تھے۔ اس کی زمین بھی کافی تھی اور اولاد بھی جوان تھی۔ اس نے گاؤں سے باہر ایک بڑا شاندار ڈیرہ بنا رکھا تھا۔ کبھی کبھی دیسی یا ولایتی افسر بٹیر تیتر کا شکار کھیلنے آتے تھے تو اس کے ڈیرے پر ٹھہرتے تھے۔ اس ڈیرے کو سرداروں کا ڈیرہ کہا جاتا تھا۔ پھر اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ

دیکھتے ہی دیکھتے سرداروں کا زور ٹوٹ گیا۔ کچھمن سنگھ گھوڑے سے گر کر مر گیا۔ اس کے بیٹے زمین کی تقسیم پر آپس میں لڑنے جھگڑنے لگے۔ کچھمن سنگھ کے ایک بیٹے ماکھا سنگھ کے کھیت نور محمد کے کھیت کی حد سے ملتے تھے۔ پٹواری نے پیسے کھا کر حد کی غلط نشاندہی کر دی۔ ماکھا سنگھ اور نور محمد میں جھگڑا ہو گیا جس کا نتیجہ مسلح لڑائی کی صورت میں نکلا۔ اس لڑائی میں سرداروں کا ایک اور ہمارے دو بندے قتل ہوئے جن میں ایک نور محمد بھی تھا۔ اس کی موت کا سب کو سخت صدمہ ہوا۔ کیس چلا...... لیکن ماکھا رہا ہو کر گھر آ گیا......"

اب میں سمجھ گیا کہ لڑکے امتیازی نے جس "ماکھے" کا ذکر کیا ہے وہ کون ہے۔ میں نے نمبردار سے پوچھا۔

"جس دشمنی کی بات تم کر رہے ہو اس کا اس قتل سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔"

"بہت گہرا تعلق ہے جی!" لڑکے کے تایا رمضان نے جواب دیا۔ "یہ دشمنی کوئی ختم نہیں ہو گئی۔ چل رہی ہے اور پتہ نہیں کب تک چلتی رہے گی۔ امتیازی کی ماں نے ہمارے گاؤں کے سامنے کہا تھا کہ میں اپنے پتر کو صرف اس لیے پال پوس رہی ہوں کہ وہ بڑا ہو کر اپنے باپ کے قتل کا بدلہ لے۔ دشمنوں کو پتہ تھا کہ ایک روز انہیں خون کا حساب دینا پڑے گا۔ اس لیے انہوں نے نور محمد کی نسل ختم کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ ماکھا سنگھ یا اس کے کسی ساتھی کا کام ہے۔ ہمارا پرچہ ماکھا سنگھ اور اس کے ساتھیوں کے خلاف ہے۔"

امتیازی کا تایا بڑا جذباتی ہو رہا تھا۔ میں نے کہا۔ "بھلے مانس! اتنی جلدی فیصلہ مت کرو۔ جب تک ٹھوس ثبوت نہ مل جائے کوئی بات بھی آخری نہیں ہوتی۔ تمہارے پاس کوئی ٹھوس ثبوت ہے؟"

امتیازی کا تایا بولا۔ "جناب اس سے بڑھ کر ثبوت اور کیا ہو گا۔ ہمارے کاکے نے اسے صاف پہچان لیا ہے۔ وہ ماکھے کے سوا اور کوئی نہیں تھا جی۔"

میں نے کہا۔ "کاکا تمہارا تو صرف اتنا کہہ رہا ہے کہ گولی چلانے والے کا چہرہ پگڑی میں چھپا ہوا تھا۔ لالٹین کی روشنی میں صرف بندے کی آنکھیں دیکھ کر اسے پہچانا نہیں جا سکتا...... مجھے یہ بتاؤ کہ ماکھے کے علاوہ تم اور کس پر شک کر سکتے ہو؟"

وہ ڈھٹائی سے بولا کہ جی ہمیں کسی اور پر شک نہیں۔

میں نے پوچھا کہ مقتولہ کا ہمسایہ اشفاق کیسا آدمی ہے؟ میرے اس سوال کے جواب میں نمبردار اور رمضان نے اسے اچھا آدمی قرار دیا۔ میں نے کہا۔

"تمہارے اس اچھے آدمی نے غلط بیان کیوں دیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ قتل کی خبر ساڑھے سات بجے تک لوگوں تک پہنچ چکی تھی۔ آخر ہم بھی گاؤں میں رہتے ہیں۔ اگر یہ خبر ساڑھے سات بجے گاؤں میں گردش کر رہی تھی تو مجھ تک کیوں نہیں پہنچی۔ اس کا صاف مطلب ہے کہ کم از کم ساڑھے آٹھ بجے تک اس خبر کو راز رکھا گیا ہے اور اشفاق کا یہ بیان سراسر غلط ہے کہ اس نے لاش دیکھنے کے بعد سات بجے ہی گلی میں نکل کر شور مچا دیا تھا۔"

نمبردار کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ وہ کچھ دیر سر کے بال کھجانے کے بعد بولا۔

"تھانیدار جی! دائی سے پیٹ نہیں چھپایا جاتا۔ میں بھی آپ کو ساری بات سچ سچ بتا دینا چاہتا ہوں...... آپ کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ نو بجے تک اس واقعے کی خبر گاؤں میں کسی کو نہیں تھی۔ صرف اشفاق اور اس کی بیوی کو معلوم تھا کہ ہاجرہ قتل ہو چکی ہے اور کمرے میں اس کی لاش پڑی ہے۔ وہ امتیازی کو بھی اناج والی کوٹھڑی سے ڈھونڈ چکے تھے اور وہ ان کے گھر میں تھا۔ یہ خبر اشفاق نے کسی بدنیتی کی وجہ سے نہیں چھپائی۔ وہ صرف تھانے اور پولیس کے چکر سے ڈر رہا تھا۔ ساڑھے سات سے لے کر ساڑھے آٹھ بجے تک وہ میری حویلی میں بیٹھا رہا ہے تا کہ میں آؤں اور وہ مجھے ساتھ لے کر آپ کی طرف آئے۔ وہ پولیس سے بہت ڈرتا ہے میرے ساتھ بھی تھانے نہیں آ رہا تھا۔"

نمبردار کی باتوں میں مجھے سچائی کی جھلک نظر آ رہی تھی۔ مگر کچھ بھی تھا اشفاق نے جھوٹ بول کر خود کو میری نظروں میں مشکوک کر لیا تھا...... ایک دو گھنٹے میں مَیں نے بہت سے لوگوں کے بیان قلمبند کیے۔ ان میں پہریداروں کے علاوہ مقتولہ کے ہمسائے اور دوسرے لوگ بھی تھے۔ زیادہ تر لوگوں کا خیال تھا کہ یہ قتل اسی دشمنی کا نتیجہ ہے جس کے سبب چار سال پہلے امتیاز کے باپ نے جان سے ہاتھ دھوئے تھے۔ صرف ایک شخص اللہ رکھے نے ذرا مختلف بیان دیا۔ اس نے کہا کہ رات پچھلے پہر وہ اپنے کھیت میں کام کر رہا تھا۔ کوئی ڈھائی تین بجے کا وقت تھا اس نے دو گھڑ سواروں کو دیکھا جو گاؤں کی طرف سے آ رہے تھے۔ وہ کافی جلدی میں لگتے تھے کیونکہ کچی سڑک پر پہنچنے کے لیے انہوں نے اصل راستہ چھوڑ کر گھوڑے کھیتوں میں ڈال دیئے گھوڑے اللہ رکھے کے کھیت میں سے گزرنے لگے تو اس نے انہیں للکارا۔ جواب میں ایک گھڑ سوار نے اسے بڑی ناقابل برداشت گالی دی۔ گالی سن کر اللہ رکھا آگ بگولا ہو گیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کسّی لے کر گھڑ سواروں کے پیچھے لپکتا اس کے ایک ساتھی نے اسے پکڑ لیا اور کانپتے ہوئے لہجے میں بولا۔ "رہنے دے یار! یہ تو مجھے شاہیا لگتا ہے۔" شاہیے کا نام سن کر اللہ رکھا بھی کانپ گیا کیونکہ شاہیا علاقے کا مشہور نقب

زن تھا۔ چور ہونے کے علاوہ غنڈہ گرد بھی تھا اور کئی لوگوں کے ہاتھ پاؤں توڑ چکا تھا...... وہ گالی کھا کر خاموش ہو گیا اور دونوں گھڑ سوار اس کے کھیت سے گھوڑے بھگاتے نکل گئے۔ بعد میں اللہ رکھا اپنے ساتھی کے ساتھ باتیں کرنے لگا۔ دونوں کا خیال تھا کہ اگر یہ شاہیا تھا تو ضرور کوئی واردات کر کے آیا تھا اور ہو سکتا ہے کہ یہ واردات انہی کے گاؤں میں کی گئی ہو...... اللہ رکھے کو فکر لگ گئی۔ وہ اسی وقت گاؤں آیا اور اپنے بیوی بچوں کو دیکھ کر گیا...... بعد ازاں صبح نو دس بجے انہیں خبر ملی کہ نور محمد کی بیوہ قتل ہو گئی ہے۔

اللہ رکھا نامی اس شخص کا بیان بے حد اہم تھا۔ میرا اپنا اندازہ بھی کہتا تھا اور مقتولہ کے بیٹے نے بھی بیان دیا تھا کہ قتل آدھی رات کے بعد ہوا۔ پُراسرار گھڑ سوار بھی رات کے اسی حصے میں دکھائی دیے۔ عین ممکن تھا کہ ان دونوں واقعات میں کوئی تعلق ہو۔ میں نے اللہ رکھے اور اس کے ساتھی سے پوچھا کہ گھڑ سواروں کے کپڑے کیسے تھے۔ وہ دونوں اس سوال کا ٹھیک جواب نہ دے سکے۔ اللہ رکھے نے کہا کہ ان دونوں نے کھیس یا چادر کی بکلیں مار رکھی تھیں، اور ان میں سے ایک کی شلوار کسی گہرے رنگ کی یا کالے رنگ کی تھی۔

اللہ رکھے کے بیان کے بعد میں نے مقتولہ کے وارثوں سے شاہیے کا ذکر کیا اور یہ جاننے کی کوشش کی کہ کیا یہ لوگ شاہیے کے بارے میں پہلے سے جانتے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی اسے خاص طور پر نہیں جانتا تھا...... ہاں نام سب نے سن رکھا تھا...... سوچنے کی بات یہ تھی کہ اگر شاہیا یا کوئی اور جرم پیشہ شخص گھر میں داخل ہوا ہے تو اس نے صرف ہاجرہ کو قتل کرنے پر بس کیوں کی۔ گھر کی کسی چیز کو ہاتھ کیوں نہیں لگایا۔ یہاں تک کہ مقتولہ کے کانوں کی بالیاں بھی محفوظ رہیں۔ اسے موقعہ نہیں مل سکا یا وہ چوری کی نیت سے آیا ہی نہیں تھا۔ بہت سے سوال ذہن میں سر اٹھانے لگے...... میں نے مقتولہ کے ہمسایوں اور پہریداروں سے ایک سوال خاص طور پر پوچھا تھا اور وہ یہ کہ کیا انہوں نے رات کے کسی حصے میں دھماکے کی آواز سنی۔ اتفاقاً ان میں سے کوئی بھی یہ آواز نہیں سن سکا تھا۔ اس کی وجہ ظاہر تھی۔ سردیوں کا موسم تھا اور سب لوگ بند کمروں میں لحاف اوڑھے سو رہے تھے۔ نیند میں آدمی ویسے بھی معمولی بات پر توجہ نہیں دیتا۔

☆======☆======☆

تفتیش کے سلسلے میں مَیں نے سب سے پہلے ماکھا سنگھ سے رابطہ قائم کیا۔ ہاجرہ کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھجواتے ہی میں نے ایک اے ایس آئی کو ساتھ والے گاؤں ''سوپور'' روانہ کر دیا تھا۔ ماکھا سنگھ اور اس کے بھائی سوپور میں رہتے تھے۔ قریباً تین بجے سہ

پہر اے ایس آئی ماکھا سنگھ کو لے کر تھانے آ گیا۔ ماکھا ایک اونچا لمبا سکھ تھا۔ ماتھے پر کلہاڑی یا کسی اور آلے کا نشان تھا۔ اس کے کندھے سے پستول لٹک رہا تھا۔ ظاہر ہے لائسنس یافتہ ہو گا ورنہ وہ اسے تھانے لانے کی جرأت نہ کرتا۔ سلام دعا کے بعد میں نے اسے بیٹھنے کے لیے کرسی دی۔ میں نے ماکھے سے پوچھا کہ کل رات وہ کہاں تھا۔ اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

''جناب! میں اپنے گاؤں میں تھا۔''

میں نے پوچھا۔ ''رات گیارہ اور تین بجے کے درمیان تم کہاں تھے؟''

وہ بولا۔ ''ساری رات گاؤں کے دائرے میں تھا۔ وہاں ہم نے ''بولی والے'' کو بلایا ہوا تھا۔ گاؤں کے سارے مرد وہاں موجود تھے۔''

میں نے پوچھا۔ یہ ''بولی والا'' کون ہے؟''

ماکھا میری بے خبری پر حیران ہوا۔ بولا۔ ''بولی والا بڑا زبردست گویا ہے جی...... آلے دوالے کے سارے گاؤں اسے جانتے ہیں۔ مرزا صاحباں پڑھتا ہے۔ سننے والے مست ہو جاتے ہیں۔ رات وہ ہمارے گاؤں میں آیا ہوا تھا۔ میں بھی اسے سننے کے لیے گیا تھا۔ گیا تو صبح ہی واپس آ سکا۔''

میں نے پوچھا۔ ''تم کہنا چاہتے ہو کہ کل ساری رات تم دائرے میں رہے تھے۔''

''بالکل جناب!'' ماکھے نے جواب دیا۔ ''ایک درجن بندے اس بات کی گواہی دے سکتے ہیں۔''

''تو پھر ہاجرہ کیسے قتل ہو گئی؟''

میرے سوال نے ماکھے کو گڑبڑانے پر مجبور کر دیا...... اس نے بمشکل خود پر قابو پایا اور بولا۔ ''مجھے اس موت کا بہت افسوس ہے تھانیدار صاحب! پر اگر آپ کے دماغ میں ہے کہ اس موت میں میرا ہاتھ ہے تو آپ غلطی پر ہیں۔ میں نور محمد کی بیوی کو نقصان پہنچانے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ جو ہوا تھا وہ بھی اچانک ہوا تھا اور اس میں میرا ہاتھ نہیں تھا۔ نور محمد نے طیش میں آ کر میرے ایک چاچے کو کلہاڑی مار دی تھی۔ بس اسی بات سے لڑائی شروع ہو گئی تھی۔ دونوں طرف سے کلہاڑیاں اور لاٹھیاں نکل آئیں اور آپ کو پتہ ہی ہے جب ایک بار لڑائی شروع ہو جائے تو......''

''دیکھو! مجھے سبق پڑھانے کی کوشش نہ کرو۔'' میں نے تیزی سے ماکھے کی بات کاٹی۔

''مجھے صرف یہ بتاؤ کہ کیوں نہ تمہیں اس قتل کے شبے میں گرفتار کر لیا جائے۔''

چند لمحوں کے لیے ماکھے کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے پتہ نہیں جی آپ یہ بات کیوں کر رہے ہیں لیکن میرا اس معاملے میں کوئی ہاتھ نہیں۔''

''کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ نور محمد کے گھر سے اب تمہاری کوئی دشمنی نہیں تھی۔''

دشمنی تو تھی جی! اور نور محمد کی بیوی بڑی بڑی باتیں بھی کرتی رہتی تھی، لیکن میں نے فیصلہ کر رکھا تھا کہ اب پہل ہماری طرف سے نہیں ہوگی۔ شاید آپ کو یقین نہ آئے لیکن میں سچ کہتا ہوں کہ کچھ عرصہ پہلے میں نے نور محمد کے وارثوں سے صلح کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔ میں نے نور محمد کے ایک رشتے دار سے کہا تھا کہ میں زمین کا معاملہ گل بات سے طے کرنے کے لیے تیار ہوں اور اگر نور محمد کی بیوہ چاہے تو نور محمد کی موت کا ہرجانہ بھی بھر دوں گا لیکن ان لوگوں نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ میری اس کوشش کو بزدلی سمجھا۔ نور محمد کی بیوہ نے کہا کہ میں پتر کو صرف اس لیے پال پوس رہی ہوں کہ وہ ماکھے کی گردن پر چھری چلائے گا۔''

میں نے کہا۔ ''اور تم نے یہ سوچ کر کہ کل کو میری گردن پر چھری چلے گی ہاجرہ اور اس کے بیٹے کا ٹینٹا ختم کرنے کی کوشش کی۔''

ماکھا بولا۔ ''آپ کو حق ہے جی...... آپ شک کر سکتے ہیں لیکن جو سچ ہے وہ میں نے بتا دیا ہے۔''

میں نے ماکھے کو تو تھانے میں بٹھایا اور اے ایس آئی کو ہدایت کی کہ وہ واپس ''سوپور'' چلا جائے اور یہ معلوم کرے کہ کیا واقعی رات کو گاؤں میں گانے بجانے کی محفل تھی اور یہ بھی معلوم کرے کہ ماکھا ساری رات وہاں موجود تھا کہ نہیں۔ اے ایس آئی ابھی روانہ ہوا ہی تھا کہ سوپور سے ماکھے کا چاچا دو تین تگڑی سفارشیں لے کر پہنچ گیا۔ یہ لوگ ہر صورت ماکھے کو چھڑانا چاہتے تھے۔ ماکھے کے چاچے کا کہنا تھا کہ کل رات ماکھا صبح تک دائرے میں رہا ہے اور اس بات کی گواہی آدھا گاؤں دے سکتا ہے۔

وہ لوگ دائرے والی بات پر جتنا زور دے رہے تھے میرے دل میں اتنا ہی شک پیدا ہو رہا تھا۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ بعض مجرم موقعے سے عدم موجودگی ثابت کرنے کے لیے جان بوجھ کر خود کو گواہوں کے درمیان رکھتے ہیں۔ میں نے سفارشیوں سے صاف کہہ دیا کہ فی الحال میں ماکھے کو نہیں چھوڑ سکتا، ہاں یہ میرا وعدہ ہے کہ اس سے مار پیٹ نہیں ہو گی...... ابھی ماکھے کے حمایتی تھانے میں ہی بیٹھے تھے کہ میرا اے ایس آئی سوپور سے ہو کر واپس آ گیا۔ اس کا چہرہ دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کوئی اہم خبر لایا ہے۔ میں نے اس سے

تنہائی میں جا کر بات کی۔ اے ایس آئی نے بتایا کہ یہ تو صحیح ہے کہ کل رات گاؤں میں گانے بجانے کی محفل تھی اور ماکھا بھی وہاں موجود تھا لیکن اس سے یہ بات ثابت نہیں ہوئی کہ وہ ساری رات گاؤں سے باہر نہیں نکلا۔ اس محفل میں زیادہ تر سکھ بیٹھے ہوئے تھے۔ رات بارہ بجے ایک شخص شراب کے بھرے ہوئے دو مٹکے لے آیا۔ سب نے پیالے بھر بھر کر نشہ کیا اور مستی میں بھنگڑا ڈالنے لگے اور غل غپاڑہ کرنے لگے۔ پھر دو ٹولیاں آپس میں لڑ پڑیں اور صبح تک گاؤں کی گلیوں میں شور شرابہ ہوتا رہا۔ ایسے میں اگر ماکھا سنگھ اکیلا یا اپنے کسی ساتھی کے ساتھ قتل کی نیت سے ہمارے گاؤں آ گیا ہو تو کسی کو کیا پتہ چلا ہو گا۔

اے ایس آئی کی بات قابلِ غور تھی۔ نشہ تو ویسے بھی بری چیز ہے پھر سکھ نے کیا ہو تو سونے پر سہاگہ۔ یہ سوچا جا سکتا تھا۔ کہ نشے میں دھت ہو کر ماکھے کو کوئی پرانا زخم یاد آ گیا ہو اور وہ رائفل لے کر ہاجرہ اور اس کے بیٹے پر چڑھ دوڑا ہو۔ اے ایس آئی نے کہا۔

''جناب! ایک اور بڑی خاص الخاص بات معلوم ہوئی ہے۔ اس بات کی تصدیق گاؤں کے دو آدمیوں نے کی ہے۔ ان میں ماکھے کا ایک رشتے دار بھی شامل ہے۔ ان لوگوں سے پتہ چلا ہے کہ رات کی محفل میں مشہور نقب زن شاہیا بھی موجود تھا۔ شاہیا، ماکھے کا لنگوٹیا رہا ہے لیکن جب سے شاہیے نے رسہ گیری اور چوری چکاری شروع کی ہے وہ دونوں سرِ عام زیادہ نہیں ملتے۔ رات گاؤں کے لوگوں نے بہت دنوں بعد دونوں کو اکٹھے دیکھا تھا۔ وہ پاس پاس بیٹھے بولیاں سنتے رہے۔ پھر جب بھنگڑے کا دور چلا تو دونوں نے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر بھنگڑا ڈالا اور نشے میں للکارے مارتے رہے......''

اے ایس آئی کی یہ آخری اطلاع واقعی اہم تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ کاشت کار اللہ رکھا نے جو بیان دیا وہ سو فیصد درست تھا۔ رات پچھلے پہر اس کے کھیت میں سے گزرنے والے گھڑ سواروں میں سے ایک شاہیا تھا...... اور دوسرا...... عین ممکن تھا کہ ماکھا سنگھ ہو۔ مجھے لگا کہ جیسے یہ کیس بہت جلد حل ہو جائے گا۔ اگر کھیت سے گزرنے والے واقعی ماکھا اور شاہیا تھے تو نوے فیصد امکان تھا کہ یہ قتل انہوں نے ہی کیا ہے۔ وہ نہ صرف ہمارے گاؤں کی طرف سے آئے تھے بلکہ وقت بھی وہی تھا۔ وہ دونوں اتنی جلدی میں تھے کہ انہوں نے گھوڑے اللہ رکھے کے کھیت میں سے گزار دیئے...... اے ایس آئی کی اس اطلاع کے بعد میں نے پختہ فیصلہ کر لیا کہ چاہے کسی کی سفارش بھی آ جائے میں نے ماکھا سنگھ کو نہیں چھوڑنا۔ اس کے علاوہ میں نے شاہیے کی تلاش کے لیے بھی اے ایس آئی کو مشورے کے لیے بلا لیا۔

☆=====☆=====☆

پہلے ماکھا سنگھ کو نرمی سے سمجھایا بجھایا گیا لیکن اس نے شاہیا کے بارے کچھ نہیں بتایا۔ مجبوراً اسے پھینٹی لگانا پڑی۔ کافی مار کھانے کے باوجود وہ یہی کہتا رہا کہ اسے شاہیے کے ٹھکانے کا کچھ پتہ نہیں اور نہ ہی وہ اس رات شاہیے کے ساتھ کہیں گیا تھا۔

پوچھ گچھ کے دوران ماکھے نے یہ بھی کہا کہ اس قتل میں سجن پیر کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ سجن پیر کا نام سن کر میں چونکا۔ یہ نام میرے لیے اجنبی نہیں تھا علاقے میں لوگ اس نوجوان پیر کو بہت مانتے تھے اور اسے دم درود اور جھاڑ پھونک کا ماہر سمجھتے تھے۔ میں نے ماکھے کا گریبان پکڑ لیا اور جھنجھوڑ کر پوچھا۔

''سجن پیر کا اس قصے سے کیا تعلق ہے؟''

''تعلق ہے جی! اسی لیے تو کہہ رہا ہوں اور نور محمد کی بیوہ کو آپ اتنی...... شریف عورت بھی نہ سمجھیں۔ ہم سے کون سی بات چھپی ہوئی ہے۔ خود ہی چپ رہیں تو دوسری بات ہے۔''

ملزم اپنی جان بچانے کے لیے عموماً الٹی سیدھی ہانکنے لگتے ہیں۔ مجھے شک ہوا کہ ماکھا سنگھ تفتیش کو غلط راستے پر ڈالنے کے لیے بے پَر کی اڑا رہا ہے۔ پھر بھی اس کی بات سننا ضروری تھا۔

میں نے پوچھا۔ ''ہاں...... بتاؤ کیا برائی دیکھی تھی تم نے مقتولہ میں؟''

وہ بولا۔ ''میں یہ بات زبان پر نہیں لانا چاہتا تھا اور ویسے بھی مرنے والے کی برائی نہیں کرنی چاہیے لیکن ہاجرہ کے وارثوں نے میرے خلاف پرچہ کٹا کر کھلی جنگ شروع کر دی ہے۔ وہ میری گردن پھانسی کے پھندے میں دینا چاہتے ہیں لیکن اس میں انہیں کبھی کامیابی نہیں ہوگی۔''

میں نے کہا۔ ''ماکھے! میں جو پوچھ رہا ہوں اس کا جواب دو۔ کیا برائی نظر آئی تھی تمہیں ہاجرہ میں؟''

ماکھے نے جواب دیا۔ ''آپ یہ نہ سمجھیں جی کہ میں الزام لگا رہا ہوں۔ آپ اپنے طور پر تصدیق کرا سکتے ہیں۔ گاؤں کے کئی لوگوں کو یہ بات معلوم ہوگی اور کوئی نہ کوئی ضرور سچی بات آپ کو بتا دے گا...... شوہر کی موت کے بعد ہاجرہ بیمار رہنے لگی تھی۔ اس نے جھاڑ پھونک کے لیے انت نگر، سجن پیر کے پاس جانا شروع کر دیا۔ پانچ چھ مہینے بعد وہ تندرست ہو گئی لیکن سجن پیر کے پاس آنا جانا جاری رہا۔ یہ معاملہ بڑھتا گیا اور کبھی کبھی سجن پیر نے بھی ہاجرہ کے گھر آنا اور رات رہنا شروع کر دیا۔ ایک جوان بیوہ عورت کے گھر ایک جوان مرد کا رات رہنا کوئی معمولی بات نہیں ہے جی! سمجھدار لوگ انگلیاں اٹھانے لگے تو ہاجرہ کے وارثوں نے

اسے سختی سے سمجھایا اور ڈانٹ ڈپٹ کی۔ اس کے بعد ہاجرہ نے پیر کے پاس آنا جانا بند کر دیا...... لیکن مجھے پورا وشواس ہے جی کہ یہ معاملہ ختم نہیں ہوا تھا اور اندر ہی اندر کوئی کھچڑی پک رہی تھی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہاجرہ کو گولی مارنے والا سجن پیر ہی ہو......''

ماکھے نے بڑی ہوشیاری سے میرے ذہن میں شک کا بیج بو دیا تھا۔ میں نے ضروری سمجھا کہ سب سے پہلے اس شک کو رفع کیا جائے۔ میں نے اس کام کے لیے اپنے مخبر بلال شاہ کو مقرر کیا اور اسے کہا کہ وہ سجن پیر اور مقتولہ ہاجرہ کے معاملے کا پتہ چلائے...... بلال شاہ نے طوفانی انداز میں کام کیا اور بارہ گھنٹے کے اندر اندر اس بارے میں بہت کچھ جان لیا۔ شام کے پانچ بجے جب میں تھانے میں بیٹھا بلال شاہ کی راہ ہی دیکھ رہا تھا وہ جھومتا جھامتا تھانے میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر عورت بھی تھی...... عورت کچھ خوفزدہ تھی۔ بلال شاہ نے بڑی محبت سے کہا۔

''ماسی...... ادھر بیٹھو کرسی پر۔ یہ تھانیدار صاحب بڑے اچھے بندے ہیں۔ بالکل مکھن کی طرح ملائم ہیں۔ کوئی ضرورت نہیں ان سے ڈرنے کی۔''

اس نے عورت کو کندھوں سے سہارا دے کر کرسی پر بٹھایا اور سنتری کو حکم دیا کہ سامنے حلوائی کی دکان سے دو پاؤ گرم گرم دودھ لے کر آئے۔

میں نے کہا۔ ''کیا بات ہے۔ اماں کہیں گر گئی ہے جو اسے گرم دودھ پلا رہے ہو۔''

وہ بولا۔ ''نہیں جی! دودھ تو میں نے اپنے لیے منگوایا ہے ماسی کے گھر تھوڑی سی جلیبیاں کھالی تھیں، گلے میں کھرکھری سی لگی ہوئی ہے۔''

میں صبر کا گھونٹ بھرنے کے علاوہ اور کیا کر سکتا تھا۔ آخر وہ کام کر کے آیا تھا۔ اس نے اماں کے بارے میں بتایا کہ ''ماسی'' رشتے کرانے والی عورت ہے گاؤں کے ہر گھر کے بارے میں سب کچھ جانتی ہے۔ ہاجرہ کے گھر اس کا کافی آنا جانا تھا۔

میں نے اماں کی شکل دیکھی۔ اپنی طرح کی دوسری عورتوں کے برعکس وہ خاصی بھلی مانس اور معقول لگتی تھی۔ اس نے چادر سے سر کے بال اچھی طرح ڈھانپ رکھے تھے۔ بات چیت میں بھی اس نے دھیما لہجہ اختیار کیا۔ اس نے جو کچھ بتایا اس سے پتہ چلا کہ آج سے ایک ڈیڑھ برس پہلے تک ہاجرہ کا سجن پیر کی طرف آنا جانا تھا اور ایک مرتبہ سجن پیر بھی اس کے گھر مہمان ٹھہرا تھا مگر اس کے بعد جب گاؤں میں باتیں نکلیں تو ہاجرہ نے سجن پیر کے پاس جانا بند کر دیا اور اس کے بعد کبھی وہ انت نگر نہیں گئی اور نہ ہی سجن پیر اس گاؤں میں نظر آیا۔

اماں نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔

"پُتر جی! اللہ کو جان دینی ہے۔ کسی کی بہو بیٹی کے بارے غلط بات کر کے میں اپنے لیے آگ اکٹھی نہیں کر سکتی۔ مجھے تو اللہ بخشے ہاجرہ میں کوئی برائی نظر نہیں آئی وہ صرف اپنے علاج کے لیے پیر کے پاس جاتی تھی اور دل سے اس کی عزت کرتی تھی۔ اگر پیر کے دل میں کوئی غلط بات آ گئی ہو تو میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔ دلوں کے حال تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ ویسے بھی اتنا پتہ ہے کہ وہ لاج شرم والی تھی اور جب اس نے سنا کہ لوگوں نے باتیں کی ہیں تو وہ بڑی شرمندہ ہوئی اور اس نے دل میں پکا ارادہ کیا کہ اب وہ مرتی مر جائے گی لیکن پیر کے پاس علاج کے لیے نہیں جائے گی۔"

ماکھے نے کچھ اور بتایا تھا اور اماں کی بات اس واقعے کا دوسرا رخ پیش کر رہی تھی۔ میں نے اماں سے پوچھا۔

"تمہارا کیا خیال ہے۔ وہ سجن پیر کیسا آدمی ہے؟"

میرے اس سوال نے مائی کو گڑبڑا دیا۔ وہ سر پر چادر درست کر کے بولی۔ "وہ دیکھنے میں تو ٹھیک ہی لگتا ہے پر کسی کے دل کا کیا پتہ......"

میں نے کہا۔ "میں نے سنا ہے کہ اس نے ابھی تک شادی نہیں کی، اور اس کے پاس عورتیں بہت آتی ہیں۔"

اماں بولی۔ "ہاں! عورتیں تو اسے بہت مانتی ہیں۔"

عورت کے جوابات سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ خود بھی سجن پیر کے کردار پر شک کرتی ہے۔ تاہم وہ یہ بات کھل کر زبان پر نہیں لا رہی تھی...... میں اس نتیجے پر پہنچا کہ موجودہ حالات میں میرا سجن پیر سے ملنا بہت ضروری ہو گیا ہے۔

بوڑھی عورت کو میں نے رازداری کا پابند کر کے واپس بھیج دیا اور بلال شاہ سے مشورہ کر کے یہ فیصلہ کیا کہ کل پچھلے ٹائم ہم دونوں اس "سجن پیر" سے ملنے انت نگر جائیں گے۔ ابھی ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ شہر سے مقتولہ کی پوسٹ مارٹم رپورٹ آ گئی۔ یہ بڑی تفصیلی رپورٹ تھی پولیس سرجن کوئی قابل آدمی لگتا تھا۔ اس نے ایک ایک بات پر وضاحت سے روشنی ڈالی تھی۔ خاص طور پر گولی کے زخم کا اس نے بہت تفصیل سے ذکر کیا تھا۔ زخم کی پوری پیمائش، رخ، گہرائی اور نوعیت ہر چیز بیان کی تھی۔ اس نے لکھا تھا کہ گولی تقریباً آٹھ دس فٹ کی دوری سے چلائی گئی۔ اس کا مطلب ہے گولی چلانے والا کمرے کے دروازے پر کھڑا تھا۔ جس وقت فائر ہوا متوفیہ اپنے بستر پر سیدھی لیٹی ہوئی تھی۔ جس زاویے سے گولی متوفیہ کے جسم میں داخل ہوئی اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حملہ آور زیادہ لمبے قد کا نہیں تھا۔ یا پھر اس

نے بیٹھ کر گولی چلائی ہے۔ یہی بات اس دوسری گولی کے سوراخ سے ثابت ہوئی ہے جو دیوار میں لگی تھی۔ اس سوراخ کا زاویہ میرے اندازے کے مطابق 30 درجے سے کم نہیں ہونا چاہیے تھا......

اس کے علاوہ انگریز سرجن نے اور بھی بہت سی تفصیلات لکھی تھیں۔ وقوعہ کا وقت اس نے رات گیارہ اور تین بجے کے درمیان بتایا تھا۔ اس کے معائنے کے مطابق بارہ بور کی گولی متوفیہ کی بائیں چھاتی کے نیچے سے سینے میں داخل ہوئی تھی اور پھیپھڑا پھاڑ کر پچھلی پسلی میں جا اٹکی تھی۔ یہ ایک مہلک زخم تھا اور اس سے دو تین منٹ کے اندر موت واقعہ ہو گئی تھی۔ اس رپورٹ کو پڑھنے کے بعد میں سوچ میں ڈوب گیا۔ ماکھا سنگھ اور شاہیا میں سے کوئی بھی چھوٹے قد کا نہیں تھا۔ دونوں دراز قد اور چوڑے چکلے تھے۔ اگر ان دونوں میں سے کسی نے گولی چلائی تھی تو پھر پولیس سرجن کی رپورٹ کیا معنی رکھتی تھی۔ اچانک میرا دھیان اشفاق کی طرف چلا گیا۔ مقتولہ کا ہمسایہ اشفاق چھوٹے قد کا تھا مشکل سے سوا پانچ فٹ کا ہو گا۔ پھر اس نے بیان بھی بڑا الٹا پلٹا دے رکھا تھا۔ میں سوچنے لگا کہیں پولیس سرجن کی رپورٹ اشفاق کی طرف اشارہ نہیں کر رہی۔ بہر حال اتنی جلدی کوئی رائے قائم کرنا ممکن نہیں تھا۔ میں نے اس خیال سے سوچ بچار ترک کر دی کہ پہلے اس کہانی کے ایک اہم کردار سجن پیر سے ملاقات کر لی جائے۔

☆======☆======☆

سجن پیر کا ڈیرا انت نگر گاؤں سے باہر ہی تھا۔ نیم اور جامن کے درختوں سے گھرا ہوا ایک جھونپڑا نما کچا مکان تھا۔ مکان کے آگے ایک وسیع احاطہ تھا جس میں قطار اندر قطار بہت سے مٹکے رکھے ہوئے تھے اور عقیدت مندوں کے بیٹھنے کے لیے چبوترہ سا بنا ہوا تھا۔ تاہم جب میں اور بلال شاہ پہنچے احاطہ ویران نظر آیا تھا۔ صرف مکان کے دروازے پر دو بوڑھی عورتیں سر جھکائے بیٹھی تھیں اور ایک لمبا تڑنگا شخص لاٹھی لیے پہرہ دے رہا تھا۔ میں اور بلال شاہ دیہاتیوں کے لباس میں تھے۔ سردی سے بچنے کے لیے دونوں نے گرم چادروں کی بکلیں مار رکھی تھیں۔ چہروں کا بس تھوڑا سا حصہ دکھائی دیتا تھا۔ لاٹھی بردار شخص کے قریب پہنچ کر میں نے بلال شاہ کو آگے کر دیا۔ بلال شاہ نے لاٹھی بردار سے کہا کہ ہم پیر صاحب سے ملنا چاہتے ہیں۔

اس نے گردن اکڑا کر کہا۔ ''اللہ لوکو! آج ملاقات کی چھٹی ہے کل دوپہر کے بعد ملاقات کھلے گی۔''

بلال شاہ منت کرنے لگا کہ ہم بہت دور سے آئے ہیں ہمارا ملنا بہت ضروری ہے وغیرہ وغیرہ وہ شخص اپنا سر مسلسل دائیں بائیں ہلا رہا تھا۔ اس کا ایک ساتھی بھی آ گیا تھا اور اب وہ دونوں ہمیں دھکے دینے کی فکر میں تھے۔ اتنے میں ایک جوان لڑکی آئی۔ اس نے بوسکی کی چادر سے کانا گھونگھٹ نکال رکھا تھا۔ چال ڈھال سے وہ بڑی تیز لگتی تھی۔ آتے ساتھ ہی اس نے سریلی آواز میں پوچھا ''پیر جی ہیں؟'' لاٹھی بردار نے اثبات میں سر ہلا دیا اور فوراً اس کے لیے راستہ چھوڑ دیا۔ وہ چادر کے اندر کولہے مٹکاتی خراماں خراماں چلی گئی۔

بلال شاہ نے آگ بگولا ہو کر کہا۔

''چھٹی ہے تو اس کو کیوں اندر جانے دیا ہے؟''

ایک لاٹھی بردار نے پُراسرار مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''اس کی بات چھوڑو۔ وہ جا سکتی ہے۔'' دونوں لاٹھی بردار ایک دوجے کو معنی خیز نظروں سے دیکھنے لگے۔ ان کا یہ انداز بہت کچھ سمجھا رہا تھا۔

بلال شاہ کو تاؤ آ گیا۔ کڑک کر بولا۔ ''ہم نہیں جا سکتے تو وہ کیوں جا سکتی ہے۔ پھوپھی لگتی ہے تمہاری......''

ایک لاٹھی بردار نے بلال شاہ کا گریبان پکڑ لیا...... ''اوئے منہ سنبھال کر بات کر نہیں تو دانت ہتھیلی پر رکھ دوں گا۔''

بلال شاہ کا چہرہ دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ اب وہ ایک شاندار گالی پہریدار کی خدمت میں پیش کرے گا اور اس سے لپٹ جائے گا۔ ایسا ہی ہونا تھا کیونکہ میں ایسا ہوتے بارہا دیکھ چکا تھا۔ میں لپک کر ان دونوں کے درمیان آ گیا اور سر سے چادر اتار کر اپنا تعارف کروایا کہ میں رام پور تھانے کا ایس ایچ او ہوں۔ پہریداروں میں سے ایک مجھے پہچان گیا اور اس کے ساتھ ہی اس کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔ اس کی کیفیت دیکھ کر دوسرے پہریدار نے بھی بلال شاہ کا گریبان چھوڑ دیا...... چند منٹ بعد ہم مکان کے ایک کمرے میں سجن پیر کے سامنے بیٹھے تھے۔ وہ مناسب قد کاٹھ کا ایک پُرکشش شخص تھا۔ اگر خدا لگتی بات کی جائے تو وہ ایک شاندار شخص تھا۔ سرخ و سفید رنگت، حسین چہرہ، کالی داڑھی، شانوں پر لہراتی ہوئی چمکیلی زلفیں، اس نے سیاہ تہبند پر سیاہ قمیض پہن رکھی تھی اور گلے میں بڑی خوبصورت سی مالا تھی۔ میرے اندازے کے مطابق اس کی عمر اٹھائیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ ہمیں دیکھ کر کچھ زیادہ گھبراہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا۔ بڑے اطمینان سے باتیں کرنے لگا۔

میں نے کہا۔ ''پیر جی! تمہاری ایک پرانی مریدنی کا قتل ہو گیا ہے تمہارا ''علم'' کیا کہتا ہے۔ اس قتل کے بارے میں۔''

وہ بولا۔ ''مجھے کل ہی پتہ چلا ہے۔ بڑا دکھ ہوا ہے سن کر، لڑکا بے چارہ بے سہارا ہو گیا۔''

میں نے کہا۔ ''مجھے پتہ چلا ہے کہ آج کل تمہاری اور ہاجرہ کی بول چال بند تھی؟''

''بول چال؟'' اس نے حیرت سے کہا۔ ''میری تو اس سے کبھی بول چال نہیں تھی۔ بس پیری مریدی کا رشتہ تھا۔ وہ اپنے بیٹے کو ساتھ لے کر مجھ سے دم کرانے آیا کرتی تھی۔''

بلال شاہ نے کہا۔ ''لیکن لوگ تو کچھ اور بھی کہتے ہیں۔''

سجن پیر کا رنگ بدل گیا۔ ''لوگوں کا تو کام ہی کہنا ہے جی! آپ کیوں یقین کرتے ہیں ایسی باتوں پر۔ اللہ نے میرے ہاتھ میں شفا دی ہے۔ میرے پاس دکھی لوگ آتے ہیں ان

میں عورتیں بھی ہوتی ہیں......''

سجن پیر کافی دیر اپنی صفائی میں بولتا رہا۔ اس کی کچھ باتوں میں وزن بھی تھا لیکن ابھی تھوڑی دیر پہلے ہم نے اپنی آنکھوں سے جو ایک ''ٹھوس ثبوت'' اس کے گھر میں جاتے دیکھا تھا اس نے ہمیں کسی بات پر یقین نہیں کرنے دیا...... میں نے سجن پیر سے مختلف سوالات پوچھے۔ ابھی سوال جواب کا یہ سلسلہ جاری تھا کہ باہر سے شور وغل کی آواز سنائی دی۔ پھر ایک داڑھی والا آدمی بھاگتا ہوا اندر آیا۔ اس نے ہانپتے ہوئے لہجے میں سجن پیر سے مخاطب ہو کر کہا۔

''پیر جی! گٹو پہلوان کی لڑائی ہو گئی ہے جلدی آئیں جی۔''

سجن پیر پہلے تو حیران ہوا۔ پھر اس نے گھبرا کر ہماری طرف دیکھا۔ غالباً ہماری موجودگی میں اسے یہ اطلاع کچھ زیادہ ہی بری لگی تھی۔ ''میں ایک منٹ میں حاضر ہوتا ہوں۔'' اس نے کہا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ ہم دونوں کہاں رکنے والے تھے۔ اس کے پیچھے ہی پیچھے ہم بھی باہر آئے۔ سوڈیڑھ سو گز آگے درختوں کے جھنڈ میں ہلچل نظر آ رہی تھی۔ قریب پہنچ کر ہم نے دیکھا کہ پانچ چھ افراد آپس میں دست و گریبان ہیں۔ ان میں کچھ سجن پیر کے آدمی تھے اور کچھ کاشت کار ٹائپ لوگ۔ ان لڑنے جھگڑنے والوں میں ایک مُھگنا سا گنجا شخص پیش پیش تھا۔ اس نے ایک لمبے دیہاتی کا گریبان پکڑ رکھا تھا اور کسی صورت چھوڑنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ سجن پیر جھگڑنے والوں کے درمیان آ گیا اور اس نے اپنے چمٹے سے دھکیل دھکیل کر لڑنے والوں کو پیچھے ہٹایا۔ گنجا اچھل اچھل پڑ رہا تھا۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ اس کے ایک ہاتھ میں کھلا ہوا چاقو تھا۔ وہ دیہاتیوں کو للکار رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ ''میں تمہاری زبانیں کھینچ کر کتوں کو کھلا دوں گا۔ تمہیں جرأت کیسے ہوئی پیر جی کی شان میں گستاخی کرنے کی۔'' سجن پیر کے آدمیوں نے بڑی مشکل سے گنجے کو قابو کیا اور بڑی صفائی کے ساتھ اس کے ہاتھ کا چاقو غائب کر دیا۔ ہم سجن پیر کے ساتھ واپس مکان میں آ گئے۔ میرے پوچھنے پر سجن پیر نے بتایا کہ آج ملاقات کا ناغہ ہے لیکن کچھ اجڈ دیہاتی من مانی پر اتر آتے ہیں اور میرے آدمیوں سے جھگڑنے لگ جاتے ہیں۔ ان لوگوں نے بھی کوئی ایسی ہی بات کی تھی جس کی وجہ سے جھگڑا کھڑا ہو گیا۔

میں نے دل میں سوچا، اپنے مریدوں پر غنڈے چھوڑ کر تم اچھا ہی کرتے ہو۔ ایسے بے وقوفوں کی یہی سزا ہونی چاہیے۔ کچھ دیر بات چیت کے بعد ہم سجن پیر سے رخصت ہو گئے۔ رخصت ہوتے وقت جب میں نے سجن پیر سے کہا کہ وہ شامل تفتیش ہے اور تھانے میں اطلاع دیے بغیر وہ اس گاؤں سے باہر نہیں جائے گا۔ تو اس کا بھاڑ جیسا منہ کھلا رہ گیا۔ اس نے احتجاج

کے طور پر کچھ کہنا چاہا لیکن اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی میں بلال شاہ کے ساتھ باہر آ گیا۔

گاؤں کی طرف ہمارا واپسی کا سفر شروع ہوا۔ راستے میں بلال شاہ نے مجھے ایک اہم بات بتلائی۔ اس نے کہا۔ ''خان صاحب! آپ نے اس بوسکی کی چادر والی کو پہچانا تھا۔'' بلال شاہ کا اشارہ اس لڑکی کی طرف تھا جو سجن پیر سے ملنے اس کے مکان میں گئی تھی۔ میں نے انکار میں سر ہلا دیا۔ بلال شاہ بولا۔

''جناب وہ رحمت لوہار کی چھوٹی دھی پروین ہے۔ وہی جو شادی کے تین مہینے بعد طلاق لے کر گھر آ گئی تھی۔ اس کا باپ آپ کے پاس دعویٰ کرنے بھی آیا تھا۔''

بلال شاہ کی بات پر مجھے اس لڑکی کا نام یاد آ گیا وہ ہمارے ہی گاؤں کی رہنے والی تھی۔ اس کا گھر تھانے سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اس کے باپ کو نشے کی لت تھی اور میرے سپاہی اسے ایک دو بار پکڑ کر تھانے بھی لا چکے تھے...... جس طرح یہ لڑکی دندناتی ہوئی سجن پیر کے گھر میں گھس گئی تھی اس سے صاف اندازہ ہوتا تھا کہ پیر جی سے اسے ''گہری عقیدت'' ہے۔ اس لڑکی سے ہمیں پیر کے بارے میں کافی کچھ معلوم ہو سکتا تھا۔

☆======☆======☆

اگلے روز میں تھانے میں بیٹھا اسی کیس کی بھول بھلیوں میں الجھا ہوا تھا کہ اچانک ذہن میں اس شخص کا خیال آیا جسے سجن پیر نے گٹو پہلوان کے نام سے یاد کیا تھا اور جو کل دیہاتیوں سے مرنے مارنے پر آمادہ نظر آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی انگریز سرجن کی رپورٹ کے الفاظ آنکھوں کے سامنے گھومنے لگے۔ اس نے صاف طور پر لکھا تھا کہ گولی چلانے والا لمبے قد کا شخص نہیں...... کہیں ہاجرہ کو قتل کرنے والے ہاتھ گٹو پہلوان کے تو نہیں تھے؟ یہ سوال پوری شدت سے میرے ذہن میں ابھرا۔ سوچتے سوچتے میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے واقعے کے چشم دید گواہ یعنی مقتولہ کے بیٹے امتیازی سے اس بارے میں پوچھنا چاہیے۔ ماں کی موت کے بعد لڑکے کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ وہ بالکل گم صم رہتا تھا اور کبھی زور زور سے رونے لگتا تھا۔ اسے اس کے تایا نے ایک قریبی قصبے کے ہسپتال میں داخل کرا رکھا تھا۔

میں امتیازی سے ملنے ہسپتال پہنچا تو اسے تیز بخار ہو رہا تھا۔ میں نے اس سے زیادہ بات چیت مناسب نہ سمجھی۔ میں صرف ایک ہی سوال کا جواب چاہتا تھا میں نے اس سے کہا۔

''امتیازی بیٹا! جب کالے کپڑوں والے نے تمہاری ماں کو گولی ماری تو تم برآمدے میں تھے۔ وہاں سے تم نے اس شخص کو کمرے میں گھومتے پھرتے دیکھا۔ تم یہ بات ذہن سے نکال دو کہ وہ تمہارے ابا کا قاتل ماکھا تھا۔ میں تمہیں یقین سے کہتا ہوں کہ وہ ماکھا سنگھ نہیں

تھا...... مجھے صرف یہ بتاؤ کہ وہ لمبے قد کا آدمی تھا یا چھوٹے قد کا۔''

لڑکے کی آنکھوں میں خوف و ہراس نظر آ رہا تھا۔ جیسے ماں کی موت کا منظر پھر اس کی نظروں کے سامنے ہو۔ کچھ دیر اس کے ہونٹ لرزتے رہے پھر اس نے کہا۔ ''وہ...... وہ چھوٹے قد کا نہیں تھا...... لیکن اتنا لمبا بھی نہیں تھا۔ اس کی گردن موٹی سی تھی......''

لڑکے کا جواب میرے لیے بیکار تھا۔ اس سے کوئی بات بھی ثابت نہیں ہوتی تھی۔ میں نے چند اور سوال پوچھ کر لڑکے اور اس کے تایا سے اجازت لی اور ہسپتال سے واپس آ گیا۔

اب میرا رخ گاؤں کی طرف تھا۔ میں سب سے پہلے رحمت لوہار کی بیٹی سے پوچھ گچھ کرنا چاہتا تھا۔ جب میں گاؤں میں داخل ہوا۔ بارش ہو رہی تھی۔ گلیاں سنسان پڑی تھیں۔ رحمت لوہار کے گھر جانے کے لیے یہ موقع اچھا تھا۔ میری ہمیشہ کوشش رہی ہے کہ کسی شریف آدمی کے گھر جا کر پوچھ گچھ کروں تو کم سے کم لوگوں کو اس بات کا پتہ چلے...... میں نے رحمت کے دروازے پر دستک دی تو اس کی بیٹی نے ہی دروازہ کھولا۔ مجھے دیکھ کر اور پہچان کر وہ تھوڑا سا گھبرا گئی۔ میں نے نرم لہجے میں اسے بتایا کہ اس سے چند سوال کرنا چاہتا ہوں۔ معمولی ہچکچاہٹ کے بعد وہ مجھے اندر لے گئی۔ اس کے انداز سے پتہ چلتا تھا کہ کل سجن پیر نے اسے ہمارے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ میری آمد سے خاصی حیران ہو رہی تھی۔ اس کا باپ گھر ہی میں تھا، لیکن افیم کھا کر ایک کمرے کے فرش پر لڑھکا ہوا تھا۔ میں نے پروین سے کہا کہ وہ باپ کو جگائے پروین کافی دیر کوشش کرتی رہی لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ میں نے کہا۔ ''اچھا چلو رہنے دو۔'' میں اس کے ساتھ برآمدے میں چارپائی پر آ بیٹھا۔ میں نے دو تین منٹ میں اس پر یہ واضح کر دیا کہ مجھے اس کے اور سجن پیر کے تعلق کا پتہ ہے اور اگر وہ سجن پیر کے بارے میں کچھ چھپانے کی کوشش کرے گی تو اس کے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔ پروین خوفزدہ نظر آنے لگی۔ وہ شکل وصورت سے چالاک نظر آتی تھی۔ شکل بھی اچھی تھی اور جسم میں تو جیسے پارہ بھرا ہوا تھا۔ میرا تجربہ کہتا ہے کہ یہ لڑکی فتنے کھڑے کرنے میں ماہر ہوگی۔

میری توقع کے مطابق پروین نے سجن پیر کے ساتھ کسی بھی تعلق سے انکار کیا اور بتایا کہ ان کے درمیان صرف پیری مریدی کا واسطہ ہے۔ میں پروین کی اس بات پر کیسے یقین کر سکتا تھا۔ کل میں نے اس سلسلے میں کافی تحقیق کی تھی اور چند اور لوگوں کی زبانی بھی پتہ چلا تھا کہ رحمت لوہار کی بیٹی ہر دوسرے تیسرے دن انت نگر جاتی ہے اور اس کے لچھن ٹھیک نہیں ہیں میں نے کہا۔

''پروین بی بی! چھپانے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا اور بتانے سے تمہارا کوئی نقصان نہیں

ہوگا۔ صرف میرا کام کچھ آسان ہو جائے گا۔''

وہ روہانسی ہو کر بولی۔ ''پتہ نہیں کس نے آپ کو میرے پیچھے لگا دیا ہے۔ کہیں یہ...... یہ ہاجرہ کا کام تو نہیں؟''

''تمہارا اندازہ درست ہے۔'' میں نے اس کے شبہے کی تصدیق کر دی اندھیرے میں چھوڑا ہوا میرا یہ تیر کارگر رہا۔ ہاجرہ کا نام سن کر پروین کی آنکھوں میں ایک آگ سی روشن ہو گئی۔ وہ غصے سے بولی۔

''تھانیدار صاحب! مرے ہوئے کی برائی نہیں کرنی چاہیے، لیکن ہاجرہ کیا تھی یہ میں اچھی طرح جانتی ہوں اگر اس میں کچھ عقل ہوتی تو میرے بارے میں کچھ کہنے سے پہلے اپنے گریبان میں منہ ڈال کے دیکھتی۔ چور کو سارے ہی چور نظر آتے ہیں۔ شاید آپ کو پتہ نہیں وہ پیر جی کے پیچھے دیوانی ہو رہی تھی۔ ننگے پاؤں چل چل کر ان سے ملنے جاتی تھی۔ اپنے بالوں سے ان کے جوتے صاف کرتی تھی اور فرش پر جھاڑو دیتی تھی۔ اس نے کئی بار پیر جی سے کہا تھا کہ وہ اس سے شادی کر لیں یا اپنی داسی بنا کر اسے پاس رکھ لیں۔ اگر پیر جی نے اسے منہ لگایا ہوتا تو وہ اب تک اس کے کئی بچوں کی ماں ہوتی۔ میں سب کچھ جانتی ہوں جی وہ کیا چیز تھی۔ اوپر سے تسبیح اندر سے کسبی۔ ایسی ایسی باتیں سنی ہیں میں نے اس کے بارے میں کہ آپ کو بتا نہیں سکتی......''

پروین جب ایک بار شروع ہوئی تو پھر دیر تک بولتی رہی۔ عورت کا صدیوں پرانا کینہ اور حسد اس میں بھی موجود تھا۔ اس نے ہاجرہ اور سجن پیر کے بارے میں بہت سی سچی اور جھوٹی باتیں میرے کانوں تک پہنچا دیں۔

قارئین! آپ نے دیکھا ہوگا اس کیس کے حوالے سے مختلف لوگوں کے بیانات مختلف تھے۔ پولیس کے سامنے بیان دیتے ہوئے ہر شخص اپنے فائدے کو سامنے رکھتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ کبھی کبھی تفتیش بے حد مشکل ہو جاتی ہے۔ اب سجن پیر اور ہاجرہ کا معاملہ ہی لے لیں۔ ہاجرہ کے وارثوں کا خیال تھا کہ یہ سراسر بہتان ہے۔ رشتے کرانے والی مائی کا خیال تھا کہ ہاجرہ بے قصور تھی۔ ہو سکتا ہے سجن پیر کی نیت میں کوئی فرق ہو۔ ماکھا سنگھ کا کہنا تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے چکر میں تھے اور سجن پیر ہاجرہ کے گھر راتیں رہتا تھا۔ سجن پیر کا کہنا تھا کہ ہاجرہ صرف اس کی مریدنی تھی اور وہ صرف ایک بار اس کے گھر میں رات رہا تھا اور اب سجن پیر کی دوسری معشوقہ کا کہنا تھا کہ ہاجرہ پیر کی دیوانی تھی اور اس کی آغوش میں سمانے کے لیے بے قرار رہتی تھی۔ ان سارے مختلف بیانوں کے درمیان کہیں ہاجرہ پر فائر ہونے والی

گولیوں کا مسئلہ بھی اٹکا ہوا تھا۔ یہ گولیاں چلانے والا کون تھا؟ شاملِ تفتیش سارے افراد پر شک کیا جا سکتا تھا اور سب کو بے قصور بھی قرار دیا جا سکتا تھا۔ ضرورت ایک ٹھوس ثبوت کی تھی۔ جو قاتل کا چہرہ روشنی میں لائے اور قانون کی نظر اسے پہچان سکے۔ مجھے معلوم تھا، قاتل کہیں باہر سے نہیں آیا وہ انہی لوگوں میں کہیں موجود ہے۔ ہمارے اردگرد کہیں گھوم رہا ہے مگر مسئلہ اسے شناخت کرنے کا تھا...... جہاں تک سجن پیر اور ہاجرہ کا تعلق ہے میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ ان کے بارے میں کسی کا بیان بھی درست نہیں ہے۔ ان میں نہ تو بہت گہرا تعلق تھا اور نہ وہ صرف پیر مریدنی تھے۔ ان کا معاملہ ان دونوں کے درمیان تھا۔ ممکن تھا کہ وہ ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے ہوں اور ان کی ملاقاتوں میں محبت کا رنگ آ گیا ہو۔ اگر ایسا تھا تو ایک اور بات بھی سوچی جا سکتی تھی اور وہ یہ کہ قریباً ڈیڑھ سال سے ہاجرہ نے سجن پیر کے پاس آنا جانا بالکل بند کر رکھا تھا۔ ممکن تھا کہ سجن پیر کو اس قطع تعلقی کا رنج ہو۔ اس نے ہاجرہ کو پرانی ڈگر پر لانے کی کوشش کی ہو اور ناکام ہو کر قتل کر دیا ہو (اس مقصد کے لیے وہ اپنے ٹھگنے پہلوان کو بھی استعمال کر سکتا تھا۔ میں دیکھ ہی چکا تھا کہ وہ ایک غصیلا اور خطرناک شخص تھا۔ اس کے علاوہ وہ سجن پیر کا وفادار بھی ضرورت سے زیادہ ہی نظر آتا تھا) میں بہت دیر اس بارے میں غور کرتا رہا۔ آخر سب انسپکٹر اور بلال شاہ وغیرہ سے مشورہ کرنے کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ سجن پیر کو تفتیش کے لیے تھانے لایا جائے۔ یہ ایک خاصا مشکل کام تھا۔ اردگرد کے موضعات میں سجن پیر کے بہت سے عقیدت مند موجود تھے۔ کوئی مسئلہ بھی کھڑا ہو سکتا تھا۔ ویسے اس کے دشمن بھی کم نہیں تھے۔ ان میں زیادہ تعداد ان مردوں کی تھی جن کی بیبیاں سجن پیر کے چکر میں پڑی ہوئی تھیں اور یہ بات ہمارے حق میں جاتی تھی۔ غرض اسی رات نو بجے کے قریب میرا سب انسپکٹر امداد خاں گاؤں انت نگر پہنچا اور سجن پیر کو اس کے گٹو پہلوان سمیت پکڑ کر تھانے لے آیا۔

☆======☆======☆

اگلے روز قریباً نو بجے صبح میں اپنے دو ہیڈ کانسٹیبلوں کے ساتھ نزدیکی قصبے سوادر کا رخ کر رہا تھا۔ میں ایک آخری نتیجے پر پہنچ چکا تھا اور میری یہ روانگی مجرم کی گرفتاری کے لیے تھی۔ مجرم ایک ایسا شخص نکلا تھا جس پر میں نے بہت کم بلکہ نہ ہونے کے برابر شبہ کیا تھا۔

گیارہ بجے کے قریب ہم اس ہسپتال میں پہنچ گئے، جہاں ہاجرہ کا بیٹا امتیازی زیرِ علاج تھا اور اس کا تایا اس کی تیمارداری کر رہا تھا۔ ابھی ہم برآمدے میں ہی پہنچے تھے کہ میری نظر ہاجرہ کے ہمسائے اشفاق پر پڑی۔ وہ غالباً امتیازی کی مزاج پرسی کے لیے آیا ہوا تھا۔ ہمیں

دیکھتے ہی وہ بری طرح ٹھٹکا اور تیز قدموں سے واپس مڑ گیا۔ وہ سیدھا اس وارڈ میں داخل ہوا جہاں امتیازی کا بستر تھا لیکن پھر فوراً باہر آ گیا اور تیزی سے ایک دوسری گلی میں مڑ گیا۔ یقیناً بدحواسی میں اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کرے۔ چند قدم چلنے کے بعد اس نے اچانک بھاگنا شروع کر دیا۔ میں نے اپنے ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ اس کا پیچھا کرو اور پکڑ کر لاؤ۔ وہ اس کے پیچھے لپکے تو بھاری بوٹوں کی گونج سے ہسپتال کا برآمدہ گونج اٹھا۔ لوگ کھڑکیوں سے منہ نکال نکال کر دیکھنے لگے۔ میں ایک سپاہی کے ساتھ امتیازی والی وارڈ میں چلا گیا۔ امتیازی اور اس کا تایا بھی حیرت سے یہ ہنگامہ دیکھ رہے تھے۔ امتیازی کی حالت اب پہلے سے بہتر نظر آتی تھی۔ اس نے آج منہ ہاتھ دھویا تھا اور لباس بھی نیا پہنا ہوا تھا۔ امتیازی کے تایا نے پوچھا۔

”تھانیدار جی! یہ کیا ہوا ہے۔ آپ کا عملہ کس کے پیچھے گیا ہے؟“

”اشفاق کے پیچھے۔“ میں نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”وہ ہمیں دیکھ کر بھاگ کھڑا ہوا تھا، لیکن کتنا بھاگے گا؟“

امتیازی اور اس کا تایا حیرت سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ امتیازی نے پوچھا۔

”تھانیدار جی! وہ کیوں بھاگا ہے کیا وہ...... مجرم ہے؟“

میں نے نرمی سے کہا۔ ”نہیں امتیازی وہ مجرم نہیں ہے صرف ڈرپوک ہے۔ پولیس سے خوف کھاتا ہے۔ اس نے سمجھا کہ شاید ہم اسے پکڑنے آئے ہیں۔“

”تو پھر کون ہے مجرم؟“ امتیازی نے پوچھا۔

”تم مجرم ہو۔“ میں نے بڑے سکون سے جواب دیا۔ ”تم نے قتل کیا ہے اپنی ماں کو۔“

امتیازی نے چونک کر میری طرف دیکھا لیکن اگلے ہی لمحے سر جھکا لیا۔ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا اور اس کی خاموشی نے بڑی سادگی سے اس کی پیشانی پر اعترافِ جرم لکھ دیا...... وہ کوئی گھاگ مجرم نہیں تھا۔ ایک بارہ سالہ لڑکا تھا۔ یتیمی اور زمانے کی سختیوں نے اسے اپنی عمر سے زیادہ شعور ضرور دے دیا تھا لیکن وہ ”چالبازی“ نہیں دی تھی جو سچائیوں کو چھپا لیتی ہے۔ وہ خاموش بیٹھا تھا اس کا تایا حیرت سے کبھی مجھے اور کبھی بھتیجے کو دیکھتا تھا۔

”تھانیدار جی...... یہ...... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“ اس کا تایا ہکلایا۔

”ٹھیک کہہ رہا ہوں خوشی محمد......“ میں نے جواب دیا۔ ”ہاجرہ پر گولی چلانے والا خود امتیازی ہے۔“

مجھے لگا جیسے امتیازی کا تایا بے ہوش ہو کر گر جائے گا۔

☆======☆======☆

تھانے میں میرا سارا عملہ بلال شاہ سمیت موجود تھا مقتولہ کے دو تین رشتے دار بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ میں انہیں اس کیس کی تفتیش سے آگاہ کر رہا تھا۔ مقتولہ کے بارے میں بتانے سے پہلے میں نے اس کے رشتے داروں سے کہا کہ وہ اٹھ کر باہر چلے جائیں۔ ورنہ انہیں کچھ باتیں بری لگیں گی۔ دو آدمی تو چلے گئے لیکن ایک وہیں بیٹھا رہا۔ میں نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا...... یہ حقیقت ہے کہ ماکھا سنگھ وغیرہ کا اس قتل سے کوئی تعلق نہیں۔ ہمیں ماکھا سنگھ اور شاہیا پر شک ضرور ہوا تھا کیونکہ ایک گواہی کے مطابق واردات کی رات شاہیا اپنے ایک ساتھی کے ساتھ ہمارے گاؤں کے پاس موجود تھا۔ بعد میں ہمیں شبہہ ہوا کہ شاید شاہیے کا ساتھی گھڑ سوار ماکھا سنگھ تھا۔ اب یہ بات بھی ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ وہ ماکھا سنگھ نہیں تھا۔ وہ شاہیے کا ایک ساتھی تجمل حسین شاہ تھا جو میزبانی کے شوق میں اسے اپنے گھر لے کر جا رہا تھا...... خیر یہ بات تو ختم ہوئی۔ اب ہم ہاجرہ اور سجن پیر کی طرف آتے ہیں۔ شروع میں ہاجرہ صرف علاج کی غرض سے سجن پیر کے پاس جاتی رہی لیکن جوں جوں اس کا جسم ٹھیک ہوتا گیا اس کے دل کو روگ لگتا گیا۔ وہ سجن پیر کی مردانہ کشش کے جال میں پھنس گئی۔ سجن پیر بھی اسے پسند کرنے لگا۔ ایک عرصے تک ان کی محبت بے زبان رہی۔ وہ ایک دوسرے کو دیکھتے رہے اور دل ہی دل میں چاہتے رہے۔ لیکن محبت ایک جگہ رکنے والی چیز نہیں۔ یہ یا تو گھٹتی ہے...... یا بڑھتی ہے۔ ہاجرہ اور سجن پیر کی محبت بھی چپکے چپکے پروان چڑھتی رہی۔ وہ عورت جو نیک نام اور شریف سمجھی جاتی تھی۔ جس کا ایک بیٹا بھی تھا اور جو اپنے بیٹے سے محبت بھی کرتی تھی...... جب سیدھے راستے سے پھسلی تو پھر پھسلتی چلی گئی۔ پہلے آنکھوں سے باتیں ہوتی تھیں اب آنکھوں کی جگہ زبان نے لے لی۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے ملنے کے لیے بے قرار رہنے لگے۔ انہی دنوں ایک دوبار سجن پیر ہاجرہ کے گھر بھی ٹھہرا۔ معاملہ بڑھا تو لوگوں کی انگلیاں بھی اٹھنے لگیں۔ بات ہاجرہ کے بڑوں تک جا پہنچی اور ایک روز ہاجرہ کو بڑی سختی کے ساتھ اس بارے میں سمجھایا گیا...... معلوم نہیں ہاجرہ نے اس سمجھانے بجھانے سے کیا اثر لیا اور لیا بھی یا نہیں لیکن اتنا ضرور ہوا کہ اس نے سجن پیر سے ملنا بالکل چھوڑ دیا۔ پانچ چھ ماہ اسی طرح گزر گئے پھر سجن پیر نے ہمارے ہی گاؤں کی لڑکی پروین کو شیشے میں اتارنا شروع کر دیا۔ یہ لڑکی بھی جلد ہی سجن پیر کے جال میں آ گئی۔ عشق و محبت کی جو آنکھ مچولی پہلے ہاجرہ کے ساتھ کھیلی جا رہی تھی اب پروین کے ساتھ کھیلی جانے لگی۔ درحقیقت سجن پیر نے صرف ہاجرہ کو جلانے اور ستانے کے لیے یہ کھیل شروع کیا تھا۔ وہ ہاجرہ میں رقابت کا جذبہ جگا کر اس کے دل میں اپنی محبت زندہ رکھنا چاہتا تھا اور وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہوا۔ ہاجرہ جو پہلے بھی سجن پیر کو بھلا نہیں سکی تھی اب اور تڑپنے لگی۔ وہ

دیکھتی کہ پروین بن ٹھن کر انت نگر کا رخ کر رہی ہے تو اس کے سینے پر سانپ لوٹنے لگتے۔ وہ پروین کی ساری ادائیں اچھی طرح سمجھ رہی تھی......

یہ کشمکش ایک عرصہ جاری رہی۔ آخر ایک دن دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر ہاجرہ نے پھر انت نگر کا رخ کیا۔ سجن پیر اسے اپنے سامنے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ پردے کی اوٹ میں ہاجرہ کی آنکھیں آنسو بہا رہی تھیں۔ ان آنسوؤں کو دیکھ کر سجن پیر کو اپنی جیت کا یقین ہو گیا۔ دونوں بہت دیر باتیں کرتے رہے۔ شکوے گلے ہوئے۔ شکایتیں سنی اور سنائی گئیں۔ سجن پیر نے ہاجرہ سے وعدہ کر لیا کہ وہ چند دن بعد ایک مقررہ وقت پر اسے اپنے گاؤں سے باہر ملے گی۔ سجن پیر کی کشش نے ہاجرہ کی مت مار رکھی تھی۔ وہ وعدے کے دن سجن پیر سے ملنے چلی گئی۔

گاؤں سے چند فرلانگ کے فاصلے پر ایک جوہڑ کے کنارے سرکنڈوں میں ان کی ملاقات ہوئی۔ شکست تو ہاجرہ کو اسی روز ہو چکی تھی جب وہ شرم کی چادر اتار کر سجن پیر سے ملنے انت نگر گئی تھی۔ آج اس شکست کو عملی جامہ پہنا دیا گیا۔ سجن پیر نے اپنی فتح کا خراج ہاجرہ کے جسم سے وصول کیا۔ وہ شریف عورت جو ایک بیٹے کی ماں تھی اور خدا نے جس کے قدموں میں جنت رکھی تھی۔ ایک مرد کی مسکراہٹ کے عوض اپنا سب کچھ لٹا بیٹھی...... گناہ کے رستے پر پہلا قدم ہی مشکل ہوتا ہے اور ہاجرہ یہ قدم اٹھا چکی تھی۔

نہایت راز داری کے ساتھ وہ ہر دس پندرہ روز بعد سجن پیر سے ملنے کے لیے جانے لگی۔ جوہڑ کے کنارے سرکنڈوں کی تاریکی میں شیطان نے اپنا شیطانی کھیل جاری رکھا۔ ہاجرہ بالکل بھول گئی کہ اس کا ایک بیٹا بھی ہے جو گو جوان نہیں لیکن ایسا کم سن بھی نہیں۔ امتیاز نہایت خاموشی سے اپنی ماں کے طور اطوار دیکھ رہا تھا۔ وہ بڑا سیانا لڑکا تھا۔ اسے پتہ تھا کہ کچھ عرصہ پہلے لوگوں نے سجن پیر کا نام لے کر اس کی ماں کے بارے باتیں کی تھیں۔ اسے شک ہوا کہ کہیں ماں پھر اسی شخص سے ملنے تو نہیں جاتی۔ ایک شام اس نے بڑی دلیری سے ماں کا پیچھا کیا اور انہی سرکنڈوں میں جا پہنچا جہاں شیطان سجن پیر کے روپ میں چھپا بیٹھا تھا۔ وہ کچھ دیر سرکنڈوں کے کنارے حیران کھڑا سوچتا رہا کہ اب کیا کرے...... پھر اس نے ہمت کی اور بے آواز چلتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ کچھ آگے جا کر اس نے اپنی والدہ اور سجن پیر کو شرمناک حالت میں پایا...... وہ چند لمحے ہکا بکا دیکھتا رہا۔ پھر خاموشی سے واپس آ گیا...... اسی رات اس نے ٹرنک کے اندر سے اپنے باپ کی بندوق نکالی اور سوئی ہوئی ماں پر دو فائر کر کے اسے ابدی نیند سلا دیا۔

یہ میری زندگی کا ایک یادگار کیس ہے۔ میری نگاہوں میں آج بھی اس بارہ سالہ بچے

کا غیور چہرہ گھوم رہا ہے جس نے بے غیرتی کا زہر پینے سے انکار کیا اور اپنی زندگی کے آخری سہارے کو اپنے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ماں کی موت کے بعد اس کا ڈرنا اور سہم جانا...... اور سہم کر اناج والی کوٹھڑی میں چھپ جانا مجھے آج بھی یاد ہے۔ اس کے وہ آنسو بھی یاد ہیں جو لاوارثی کے پہلے روز اس کے تروتازہ رخساروں پر لڑھک رہے تھے۔

ان آنسوؤں میں دو دکھ تھے۔ ایک ماں کی موت کا...... اور دوسرا اس کی بے وفائی کا۔

☆======☆======☆

لڑکا، لڑکی اور لوگ

لوگوں کے گھروں میں عام کام کرنے والی پٹھان دوشیزہ اور لکڑیوں کے ٹال پر محنت مزدوری کرنے والے ایک دلیر قبائلی نوجوان کے پیار کی امر کہانی۔

سردیوں کی رات تھی۔ قریباً گیارہ بجے کا وقت رہا ہوگا۔ میں تھانے میں بیٹھا تھا۔

رات کے اس پہر تھانے میں بیٹھنے کی وجہ یہ تھی کہ ان دنوں میرے تھانے کی حدود میں اوپر تلے پانچ چھ سنگین وارداتیں ہوئی تھیں۔ ایک قتل تھا۔ دو چوریاں تھیں۔ دو اغوا تھے اور ایک رسہ گیری کی زبردست واردات تھی۔ ان وارداتوں کی وجہ سے کام کا بوجھ بہت بڑھ گیا تھا۔

دو دن پہلے علاقے کے ایس پی صاحب نے تھانے کا دورہ کیا تھا اور وارداتوں کی رفتار پر سخت تشویش ظاہر کی تھی۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو یقیناً سخت جھاڑ کھاتا، لیکن ایس پی صاحب مجھے اچھی طرح جانتے تھے اور میری کارکردگی سے بھی آگاہ تھے۔ اس لیے انہوں نے میرے لیے کوئی سخت لفظ استعمال نہیں کیا۔

ایس پی صاحب کے دورے کے بعد میں نے تہیہ کیا تھا کہ اپنے تھانے کی کارکردگی کو بہتر بناؤں گا۔ یہی وجہ تھی کہ میں رات کے گیارہ بجے اپنے کمرے میں بیٹھا کچھ کیسوں کی جانچ پڑتال میں مصروف تھا۔ دفعتاً ایک آواز میرے کانوں میں پڑی۔

''میں نے پی شراب تُو نے کیا پیا، آدمی کا خون......''

کوئی شخص تھانے کے سامنے سے گاتا ہوا گزر رہا تھا۔ آواز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ صرف گا ہی نہیں رہا اس نے شراب بھی پی رکھی تھی۔ دس منٹ میں یہ تیسری بار تھی کہ میں نے یہ آواز سنی۔ اس دفعہ مجھ سے نہیں رہا گیا۔ میں نے فائل بند کی اور دروازہ کھول کر کمرے سے نکل آیا۔ برآمدے میں تھانے کا محرر جان محمد کمبل لپیٹے اپنی کرسی پر سو رہا تھا۔ ساتھ والے کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ باتوں کی آواز بھی آ رہی تھی، شاید حوالدار محمد حسین، ہیڈ کانسٹیبل کو اپنی تیسری شادی کی داستان سنا رہا تھا۔ میں تھانے کے صحن میں پہنچ کر سڑک پر جھانکنے لگا۔ یہ جہلم شہر کا تھانہ تھا۔ جہلم ان دنوں کوئی زیادہ بارونق شہر نہیں تھا۔ رات نو

ساڑھے نو بجے سڑکیں سنسان ہو جاتی تھیں۔ گیارہ بجے شراب کے نشے میں دھت آوارہ گردی کرنے والا شخص یقیناً کوئی شریف شہری نہیں تھا۔ میں نے دیکھا وہ جھومتا ہوا دروازے کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ دروازے کے عین سامنے پہنچ کر اس نے ایک بار پھر ہانک لگائی۔

''میں نے پی شراب تُو نے کیا پیا......''

اگر محرر جاگ رہا ہوتا یا کوئی کانسٹیبل برآمدے میں موجود ہوتا تو اب تک اس کمبخت کو گدی سے پکڑ کر تھانے میں لا چکا ہوتا لیکن یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ وہ اب تک بچا ہوا تھا۔ میں جب دروازے پر پہنچا وہ کوئی بیس گز آگے نکل چکا تھا۔ پہلے تو میں نے اسے آواز دینے کی ٹھانی لیکن پھر نہ جانے کیا دل میں آئی کہ میں خاموش رہا۔ پہلے ہی کام سر پر چڑھا ہوا تھا۔ خواہ مخواہ کی مصیبت مول لینے سے کیا فائدہ تھا۔ میں نے دل میں اس نامعلوم شخص سے کہا۔

''جا چلا جا شاید تیری کوئی نیکی سامنے آ گئی ہے۔''

لیکن ابھی میں واپس مڑ کر برآمدے ہی میں پہنچا تھا کہ شرابی کی آواز پھر قریب آتی محسوس ہوئی۔ وہ واپس آ رہا تھا۔ شاید آج اس نے گرفتار ہونے کی قسم کھا رکھی تھی۔ میں پھر دروازے پر پہنچا۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس نے اب عین دروازے کے سامنے بجلی کے پول سے ٹیک لگا لی تھی اور اوٹ پٹانگ تانیں اڑا رہا تھا۔ اس کی دیدہ دلیری حیران کن تھی۔ وہ یا تو پاگل تھا یا بالکل مدہوش ہو رہا تھا۔ اب اسے پکڑنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں نے وہاں کھڑے کھڑے حوالدار محمد حسین کو آواز دی وہ دو کانسٹیبلوں کے ساتھ بھاگا بھاگا باہر آیا۔ میں نے سڑک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''اس اُلو کے پٹھے کو پکڑ کر اندر لے آؤ۔ شراب پی رکھی ہے اور تھانے کے سامنے ماں بہن کو یاد کر رہا ہے۔''

حوالدار محمد حسین نے مونچھوں کو تاؤ دیا اور کانسٹیبلوں کے ساتھ سڑک کی طرف بڑھا۔

پولیس کو دیکھ کر وہ شخص جلدی سے سیدھا کھڑا ہو گیا اور شرابیوں کے انداز میں ہاتھ ہلانے لگا۔

حوالدار نے اس کی گرم چادر اس کے گلے میں پٹکے کی طرح کس دی اور کھینچتا ہوا اندر لے آیا۔

بلب کی روشنی میں مَیں نے دیکھا۔ وہ ایک ستائیس اٹھائیس سالہ شخص تھا۔ شلوار قمیض کے نیچے اس نے پشاوری چپل پہن رکھی تھی۔ صوبہ سرحد سے آیا ہوا لگتا تھا۔ اس کی شخصیت کی سب سے اہم چیز اس کا قد تھا۔ وہ بمشکل پانچ، پونے پانچ فٹ کا ہوگا۔ جسم گٹھا ہوا تھا اور شکل سے سخت گیر دکھائی دیتا تھا۔ آنکھوں سے نشہ صاف جھلک رہا تھا لیکن وہ زیادہ مدہوش بھی نہیں

تھا۔ میں نے نام پوچھا تو اس نے گل حسن بتایا۔

میں نے پوچھا۔ ''اس وقت کہاں سے آ رہے ہو؟''

اس نے اونگی بونگی مارنی شروع کر دی۔ کبھی کہتا کہ فلم دیکھنے گیا تھا۔ کبھی کہتا کہ گھر کا راستہ بھول گیا ہے۔ ویسے ایک بات تھی وہ خوفزدہ بالکل نہیں تھا۔ جبکہ دیکھنے میں آیا ہے تھانہ اور پولیس دیکھ کر بڑے بڑے گھبرے نشے باز ہوش میں آ جاتے ہیں۔ وہ بڑے اطمینان سے بکواس کیے جا رہا تھا اور ہنستا جا رہا تھا۔ میں نے اسے دو زناٹے کے تھپڑ مارے اور حوالدار سے کہا کہ اس ''تان سین'' کی اولاد کو حوالات میں بند کر دو۔ جب کوئی والی وارث آئے گا تو دیکھا جائے گا۔

اس کا بندوبست کرنے کے بعد میں دوبارہ کمرے میں آ بیٹھا، لیکن ذہن سخت الجھا ہوا تھا۔ آخر مجھے بھی پولیس کی نوکری میں برسوں گزر رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ شخص جان بوجھ کر حوالات میں آیا ہو۔ اس کا بار بار تھانے کے سامنے سے گزرنا۔ پھر تھانے کے سامنے کھڑے ہو جانا اور بعد میں الٹ پلٹ بیان یہ سب کچھ کسی سازش کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ جیسے کہ میں دیکھ چکا تھا وہ بہت زیادہ مدہوش بھی نہیں تھا اور نہ پاگل تھا۔ پھر وہ ایسا کیوں کر رہا تھا اچانک ذہن میں ایک شبہ سر ابھارنے لگا یہ شخص کسی جائے واردات سے اپنی غیر موجودگی ثابت کرنا تو نہیں چاہتا تھا۔ بعض ہوشیار مجرم قانون کو دھوکہ دینے کے لیے ایسے ہتھکنڈے بھی استعمال کرتے ہیں۔ اگر میرا یہ شبہ درست تھا تو پھر کہا جا سکتا تھا کہ کسی جگہ عنقریب کوئی سنگین واردات ہونے والی ہے۔ ڈاکہ زنی، آبرو ریزی یا پھر قتل، میری بے چینی میں اضافہ ہو گیا۔ حالات ایسے تھے کہ ان دنوں میں کسی نئی واردات کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ پہلے ہی ایس پی صاحب پریشان تھے۔ جوں جوں میں سوچ رہا تھا۔ میرا شک بڑھتا جا رہا تھا۔ میں کمرے میں ٹہلتے ہوئے غور کرنے لگا۔ اگر کوئی واردات ہونے والی ہے تو اس کا پتہ کیسے چل سکتا تھا۔

میں نے حوالدار محمد حسین کو بلایا اور اسے بتایا کہ مجھے دال میں کچھ کالا لگتا ہے۔ اس آوارہ گرد کا نشہ ہرن کر کے ذرا میرے کمرے میں لے آؤ۔

محمد حسین نے میری ہدایات پر عمل کیا۔ پانچ منٹ بعد شرابی گل حسن پانی میں تربتر میرے سامنے کھڑا تھا۔ شاید محمد حسین نے ٹھنڈے پانی کی پوری بالٹی اس پر انڈیل دی تھی۔

میں نے گل حسن سے کہا۔

''بیٹا! اب ذرا صاف صاف بتا دو اصل چکر کیا ہے۔ تم نے رات حوالات میں گزارنے کا فیصلہ کیوں کیا ہے۔''

میری اس بات پر گل حسن کے چہرے نے جس طرح رنگ بدلا مجھے سو فیصد یقین ہو گیا کہ میرا اندازہ درست تھا کہ گل حسن کی گرفتاری کے پیچھے کوئی سازش ہے۔ گل حسن نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے کھڑے کھڑے بھرپور ٹانگ اس کے سینے پر جمائی۔ وہ الٹ کر کرسیوں پر جا گرا۔ پھر حوالدار محمد حسین اور کانسٹیبلوں نے اسے سنبھلنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ زمین پر لٹا کر انہوں نے اسے ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ وہ بری طرح چلانے لگا۔ دفعتاً اس کی آواز رک گئی۔ مجھے کسی خطرے کا احساس ہوا۔

''ٹھہرو'' میں چیخا۔

دونوں کانسٹیبل رک گئے۔ گل حسن اوندھے منہ ساکت پڑا تھا۔ میں نے نیچے جھک کر جلدی سے اسے سیدھا کیا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور ہونٹوں سے خون کی لکیر بہہ کر کانوں تک آ رہی تھی۔ میں نے نبض ٹٹولی۔ رفتار بہت دھیمی تھی۔ کوئی ضرب کسی نازک جگہ پر لگ گئی تھی۔ ہم نے اسے ہوش میں لانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ ساکت رہا۔ اچانک بے ہوشی کے عالم میں ہی اس نے خون کی قے کی۔ یہ قے صورتِ حال کی سنگینی کی طرف اشارہ کر رہی تھی میں نے قمیض اٹھا کر اس کا پیٹ ننگا کیا پہلو پر ایک گہرا نیلا داغ نظر آ رہا تھا۔ جیسا کہ بعد ازاں پتہ چلا یہ کسی ٹھوکر کا نشان نہیں تھا۔ کرسیوں پر گرتے ہوئے ایک چوبی کونہ یہاں لگ گیا تھا۔ بہرحال خونی قے کے بعد ملزم کا ہسپتال میں پہنچانا ضروری ہو گیا۔

☆======☆======☆

گل حسن کو ہسپتال پہنچانے کے بعد میں نے اندرون شہر کا رخ کیا۔ ہسپتال میں ایک مریض نے اسے پہچان لیا تھا۔ اس نے بتایا کہ یہ شخص اس کا محلے دار ہے۔ تانگہ چلاتا ہے اور ان کے گھر کے قریب ہی کرائے کے مکان میں رہتا ہے۔ اس مریض سے یہ بھی معلوم ہوا کہ گل حسن جھگڑالو طبیعت کا مالک ہے۔ اس کا باپ بھی ایسا ہی ہے۔ گھر سے مار پیٹ کی آوازیں آتی رہتی ہیں۔ محلے کے لوگ ان کے بارے میں زیادہ کچھ نہیں جانتے۔ ہاں اتنا معلوم ہے کہ وہ کسی نواحی گاؤں کے رہنے والے ہیں۔

یہ کوائف مجھے مجبور کر رہے تھے کہ میں گل حسن کے متعلق مزید چھان بین کروں وہ بدستور بے ہوش تھا لیکن ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ زیادہ خطرے کی بات نہیں۔ مریض کے بتائے ہوئے پتے پر میں اندرون شہر پہنچا۔ اس وقت رات کا ایک بج چکا تھا۔ میں نے اپنی موٹر سائیکل ایک چھوٹے سے مکان کے سامنے کھڑی کی۔ دروازے پر ٹاٹ کا پردہ جھول رہا تھا۔ میں نے دستک دی۔ تیسری دستک پر ایک ادھیڑ عمر شخص نے دروازہ کھولا۔ حلیے کے

مطابق وہ گل حسن کا باپ تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔

''کیا بات ہے بھائی!'' وہ سخت پریشانی سے بولا۔

''تمہارا بیٹا ہسپتال ہے۔ میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔''

کوتاہ قد بڈھے نے پہلے تو بدحواسی میں اِدھر اُدھر دیکھا پھر مجھے گھر میں لے گیا۔ نیچی چھت والے ایک کمرے میں اس کی چارپائی بچھی تھی۔ چھوٹی چلم والا حقہ قریب پڑا تھا۔ میں نے دیکھا بوڑھے نے اخروٹ توڑ توڑ کر کمرے میں چھلکوں کا انبار لگا رکھا تھا۔ ایک طرف اخباری کاغذ پر اخروٹ کا مغز رکھا تھا۔ میں نے دیکھتے ہی اندازہ لگا لیا کہ بوڑھا شہر میں خشک میوہ بیچتا ہے۔ بعد ازاں یہ اندازہ درست ثابت ہوا۔ بوڑھے نے بتایا کہ بازار میں اس کی چھوٹی سی دکان ہے۔ اس کا بیٹا تانگہ چلاتا ہے۔ اس گھر میں ان دونوں کے علاوہ اس کی بیوی، بیٹی اور بہو رہتی ہیں تینوں عورتیں ساتھ والے کمرے میں سو رہی تھیں اور انہیں ابھی تک میری آمد کا پتہ نہیں چلا تھا۔

بڈھے کے ساتھ میری بات ہو رہی تھی کہ اچانک کسی کے رونے کی آواز آنے لگی۔ یہ آواز ساتھ والے کمرے سے آ رہی تھی۔ رونے والی کوئی عورت تھی۔ رات کے تاریک سناٹے میں یہ دردناک آواز دل و دماغ پر عجیب اثر کر رہی تھی۔ یہ آواز نہیں تھی ایک نوحہ تھا، ایک بین تھا جو خاموشی کی لہروں میں ڈوب کر ابھر رہا تھا۔ میں نے بڈھے کی طرف دیکھا۔ بلب کی مدھم روشنی میں اس کا چہرہ خوفزدہ دکھائی دے رہا تھا۔

''کون ہے یہ عورت؟'' میں نے بڈھے سے پوچھا۔

''کک...... کوئی نہیں۔'' بڈھا گڑبڑا گیا۔ ''مم...... میری بیٹی ہے۔ اس کے سر میں سخت درد رہتا تھا۔ کئی بار رات کو رونے لگتی ہے۔''

بڈھے کا چہرہ اس کی زبان کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ میں خاموشی سے یہ آواز سننے لگا۔ محسوس ہو رہا تھا کہ یہ کسی انتہائی دکھی اور مجبور عورت کے دل کی پکار ہے یہ کسی مریض کی آہ و زاری نہیں تھی۔ میں نے بڈھے سے کہا۔

''میں گھر کی عورتوں سے ملنا چاہتا ہوں۔''

بڈھا بولا۔ ''تھانیدار صاحب! ہم عزت دار لوگ ہیں۔ ہماری عورتیں غیر مردوں کے سامنے نہیں آتیں۔''

میں نے رعب سے کہا۔ ''بابا! خواہ مخواہ اپنا کیس خراب نہ کر یہ نہ ہو تجھے اور تیری پردہ دار عورتوں کو تھانے میں بیٹھ کر چیخ و پکار کرنی پڑے۔ چل جلدی انہیں اس کمرے میں لے آ۔

اس میں تیری عزت ہے۔''

بڈھا میرے لہجے کی تبدیلی پر حیران رہ گیا۔ جہاندیدہ آدمی تھا سمجھ گیا کہ بات بڑھانا ٹھیک نہیں۔ اٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد اتفاقاً میری نظر صحن کی طرف اٹھی تو میں نے دیکھا کہ ایک ہیولا سا بھاگتا ہوا دروازے کی طرف لپک رہا ہے۔ انداز نہایت مشکوک تھا۔ پہلی بات تو میری سمجھ میں یہی آئی کہ بڈھا فرار ہو رہا ہے۔ میں تیزی سے اٹھ کر صحن میں آیا۔ سایہ اب دروازے تک پہنچ چکا تھا۔ قد کاٹھ سے وہ گل حسن کا باپ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے جھٹکے سے دروازہ کھولنا چاہا لیکن بڈھے نے مجھے اندر لانے کے بعد کنڈی چڑھا دی تھی۔ دروازہ نہیں کھلا تھا۔ اتنے میں مَیں اس کے سر پر پہنچ گیا لیکن اس سے پہلے کہ میں ریوالور نکالتا یا اسے بازوؤں میں جکڑنے کی کوشش کرتا۔ وہ تیر کی طرح میری طرف آیا۔ مجھے زور سے دھکا دے کر وہ مخالف سمت میں بھاگا۔

''رک جاؤ'' میں چلایا۔

پھر میں نے بھاگ کر اس کا پیچھا کیا۔ میرا زوردار دھکا کھا کر وہ لڑکھڑاتا ہوا صحن میں لگے ہینڈ پمپ سے ٹکرایا اور الٹ کر گرا لیکن گرتے ساتھ ہی پھرتی سے کھڑا ہو گیا۔ میں نے ایک زوردار مکہ اس کی ٹھوڑی پر جمایا۔ اگر مکہ ٹھکانے پر لگ جاتا تو یہ بھاگ دوڑ ختم ہو جاتی لیکن ٹھوڑی کی بجائے یہ مکہ اس کی گردن پر لگا۔ وہ تھوڑا سا لڑکھڑایا اور سنبھل کر بھاگ کھڑا ہوا۔ گھر کے عقب میں چار دیواری خاصی نیچی تھی۔ اس نے اچھل کر دیوار پھاندی اور باہر نکل گیا۔ جب تک میں نے دیوار تک پہنچ کر دوسری طرف جھانکا وہ گہری تاریکی میں روپوش ہو چکا تھا۔

دھما چوکڑی کی آوازوں سے گھر والے جاگ گئے تھے عورتیں چلا چلا کر اپنی پریشانی کا اظہار کر رہی تھیں۔ غنیمت تھا کہ اردگرد کے مکان دور دور تھے ورنہ ہمسائے بھی اکٹھے ہو جاتے۔ میں نے عورتوں کو ڈانٹ کر خاموش رہنے کی ہدایت کی۔ بڈھا ہراساں نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا میں نے سخت لہجے میں کہا۔

''بابا! تُو تو کہتا تھا گھر میں عورتوں کے سوا اور کوئی نہیں۔ اب یہ چھ فٹ کا بندہ کہاں سے نکل آیا۔''

بڈھا گھبرا کر بولا۔ ''قسم لے لو تھانیدار! مجھے کچھ پتہ نہیں یہ کون ہے۔ شاید کوئی چور اچکا تھا۔''

"اچھا تو سارے کام آج کی رات ہی ہونے ہیں؟" میں نے سر ہلا کر کہا۔ "آج ہی تیرا بیٹا پکڑا گیا۔ آج ہی تیری بیٹی کو سر درد کا دورہ پڑا آج ہی تیرے گھر میں چور گھسا...... مجھے سچ سچ بتا دے یہ چکر کیا ہے ورنہ سارا گھر تھانے میں جائے گا۔"

بوڑھا سنبھل کر بولا۔ "تھانیدار! تُو بار بار مجھے یہی دھمکی دے رہا ہے۔ قسم خدا کی میں خود کو بھی گولی مار لوں گا اور اپنی عورتوں کو بھی۔ ہم شریف لوگ ہیں اور اپنی عزت کی حفاظت کرنا جانتے ہیں۔"

پہلے تو جی میں آئی کہ بڈھے کا دماغ درست کر دوں لیکن پھر میں نے برداشت سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "بابا! تیری بیٹی کہاں ہے۔ میں اس سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔"

"یہ ہے میری بیٹی!" بوڑھے نے ایک چھوٹے قد کی اٹھارہ بیس سالہ لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ باپ اور بھائی کی طرح وہ بھی کوتاہ قد تھی۔ میری طرف دیکھ کر اس نے جلدی سے گھونگھٹ نکال لیا۔ اس کی ایک جھلک دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ رونے والی لڑکی یہ نہیں تھی۔ اس کی آنکھیں تو ابھی تک نیند میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ میں نے وہیں کھڑے کھڑے لڑکی سے پوچھا۔

"ابھی تھوڑی دیر پہلے تم رو کیوں رہی تھیں؟"

لڑکی کا لہجہ اپنے باپ اور بھائی کی طرح پٹھانوں جیسا تھا۔ اس نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں کہا۔ "میں کب رو رہی تھی۔"

بڈھا بے قراری سے ہاتھ مل رہا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"بابا! یہ پانچواں جھوٹ ہے جو اس تھوڑی سی دیر میں تُو نے مجھ سے بولا ہے۔ پھر بھی تُو کہتا ہے کہ میں عزت دار آدمی ہوں۔"

بڈھا اب افسوس کر رہا تھا کہ وہ پھنستا جا رہا ہے۔ اس نے جھلا کر کہا۔ "تھانیدار! تُو چاہتا کیا ہے؟ اگر میرے بیٹے نے نشہ کیا ہے تو اس کا اس بات سے کیا تعلق ہے کہ میرے گھر کی کون سی عورت رو رہی تھی اور کون نہیں۔"

میں نے کہا۔ "بابا گھبرا مت سب کچھ تجھے بتا دوں گا۔ پہلے تُو مجھے یہ بتا کہ رونے والی عورت کون ہے۔"

بڈھا خاموش رہا۔ لگتا تھا اندر ہی اندر کھول رہا ہے۔ عین ممکن تھا وہ صبر کا دامن چھوڑ دیتا اور اندر گھس کر اپنی بندوق نکال لاتا۔ اس کے تیوروں سے تو ایسا لگتا تھا۔ لیکن اس موقعے پر اگر میں کسی کمزوری کا اظہار کرتا تو ٹھیک نہیں تھا۔ میں نے گرج کر کہا۔

"گھورتا کیا ہے۔ سیدھی طرح بتا کون عورت رو رہی تھی۔"

اتنے میں پھر رونے کی ویسی ہی دبی دبی آواز آئی۔ یہ آواز دائیں طرف کھڑی عورت کی تھی۔ میرا ابھی یہی اندازہ تھا کہ کمرے میں یہی عورت رو رہی تھی۔ غالباً یہ بڈھے کی بہو اور گل حسن کی بیوی تھی۔ گھرانے کے دوسرے افراد کی نسبت اس کا قد کافی لمبا تھا۔ میں نے بڈھے سے کہا۔

"میں تمہاری بہو سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔"

بڈھے کی تیور پھر چڑھ گئے۔ غرا کر بولا۔ "میں غریب ضرور ہوں بزدل نہیں۔ اگر مجھے اتنا دباؤ گے تو کچھ کر گزروں گا......"

میں جانتا تھا کہ پردے داری کا تو بڈھا صرف ڈھونگ رچا رہا ہے۔ اصل مقصد مجھ سے کچھ چھپانا ہے۔ میں نے اس کی تیوری کو نظر انداز کرتے ہوئے اطمینان سے کہا۔ "تو ٹھیک ہے میں چلتا ہوں لیکن یاد رکھو دو گھنٹے کے اندر تمہیں بہو کو لے کر تھانے آنا پڑے گا۔"

میرے لہجے کی دھمکی نے قریب کھڑی بوڑھی عورت کو لرزا دیا۔ وہ کچھ سمجھدار لگتی تھی پشتو میں اپنے شوہر سے کچھ کہنے لگی۔ شاید اسے سمجھا رہی تھی۔ کچھ دیر دونوں میں فقروں کا تبادلہ ہوا پھر بڈھے نے پشتو میں ہی اپنی بہو سے کچھ کہا۔ میں صاف محسوس کر رہا تھا کہ وہ اسے دھمکا رہا ہے۔ بہرحال انہوں نے مجھے بہو سے بات کرنے کی اجازت دے دی۔ میں نے اسے علیحدہ کمرے میں بٹھا کر کہا۔

"دیکھو بہن! تمہارا سسر مجھے سٹھیایا ہوا لگتا ہے اگر تم چاہتی ہو کہ تمہاری اور تمہارے گھر والوں کی مشکل آسان ہو تو مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش نہ کرنا۔ میں تمہیں یہ بتا دوں کہ تمہارا شوہر حراست میں ہے اور اس نے بہت سی باتیں مجھے پہلے ہی بتا دی ہیں۔"

جواب میں عورت پھر اسی پُر درد آواز میں رونے لگی۔ اس نے گھونگھٹ نکال رکھا تھا اور سارا جسم چادر میں چھپا ہوا تھا لیکن ہاتھ ننگے تھے۔ میں نے غور سے دیکھا ہاتھوں پر سرخی مائل نشان نظر آ رہے تھے۔ یہ تازہ چوٹوں کے نشان تھے۔ کلائی پر بھی ایک میلی سی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ اس گھر میں اس عورت پر کوئی ناقابل برداشت ظلم ہو رہا ہے...... لیکن وہ کچھ نہیں بتا رہی تھی۔ بمشکل میں نے اسے چپ کرایا اور اپنا سوال دوہرایا۔ اس نے گلوگیر آواز میں اتنا کہا۔

"تھانیدار صاحب! آپ کو دھوکا ہوا ہے۔ اس گھر کے رہنے والوں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ میری ساس اور سسر بہت اچھے ہیں۔ میرے شوہر کو بھی اس کے دوستوں نے نشہ پلا دیا

ہوگا ورنہ وہ ایسا نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔ "تمہارے گھر سے ابھی جو آدمی فرار ہوا ہے وہ کون تھا؟"

لڑکی نے روتے ہوئے کہا۔ "مجھے کچھ معلوم نہیں۔ میرے سسر نے جو کچھ بتایا ہے وہی ہوگا۔"

میں دیکھ رہا تھا کہ لڑکی میرے اندازوں سے بڑھ کر خوفزدہ ہے خاص طور پر اپنے سسر سے وہ بہت مرعوب نظر آتی تھی میں بہت آسانی سے اسے باتوں میں الجھا کر جھوٹا ثابت کر سکتا تھا لیکن اس سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ ہاں اگر وہ کچھ بتانے پر آمادہ ہوتی تو بات بن سکتی تھی۔ میں نے کہا۔

"دیکھو بہن! جہاں تک میں نے اندازہ لگایا ہے تیرا شوہر کسی نہایت سنگین جرم میں ملوث ہونے والا ہے۔ یہ جرم کسی کا قتل بھی ہو سکتا ہے۔ اگر تُو میرے ساتھ تعاون نہیں کرے گی تو میں اس جرم کو ہونے سے روک نہیں سکوں گا۔ مجھ سے دل کی بات چھپا کر تُو ایک طرح اپنے شوہر کو پھانسی کے تختے تک پہنچا رہی ہے۔"

یہ تیر نشانے پر لگا۔ لڑکی نے تھوڑا سا گھونگھٹ اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اس کی بے قرار نگاہیں ایک لمحے کے لیے مجھ سے ٹکرائیں۔ یہ آنکھیں اس ادھیڑبُن کو دور کر رہی تھیں کہ وہ عورت ہے یا لڑکی۔ وہ نوجوان لڑکی تھی اور اپنی آواز ہی کی طرح خوبصورت بھی۔ وہ سخت شش و پنج میں دکھائی دے رہی تھی۔ پھر اس کی نگاہ دروازے کی طرف اٹھ گئی۔ دفعتاً اس نے گھونگھٹ کھینچ لیا اور دوبارہ رونے لگی۔

چادر کے اندر اس کا سر نفی میں ہل رہا تھا۔ کبھی اردو اور کبھی پشتو میں وہ بار بار کہہ رہی تھی۔ "مجھے کچھ معلوم نہیں، مجھے کچھ پتہ نہیں۔" میں نے تیزی سے گھوم کر دروازے کی طرف دیکھا لیکن وہاں اب کوئی نہیں تھا۔ میرا اندازہ ہے کہ اس وقت اسے دروازے پر اپنا سسر نظر آیا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ اس عورت کا اتنی جلدی اپنے خول سے باہر نکلنا ممکن نہیں۔ وہ خوف اور بے یقینی میں بری طرح جکڑی ہوئی تھی۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اپنے شوہر کے ارادوں سے واقف ہے اور یہ بھی چاہتی ہے کہ اس کا شوہر کسی جرم میں ملوث ہونے سے باز رہے لیکن پھر بھی وہ میری مدد نہیں کر رہی تھی۔ میرے خیال میں اس کی تین وجوہات تھیں۔ وہ خوفزدہ تھی۔ اسے اس بات کا یقین نہیں تھا کہ اس کی فراہم کردہ اطلاعات سے اس کے شوہر کو فائدہ پہنچے گا یا پھر شوہر کے بارے سے کسی اور کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔

کچھ باز پُرس کے بعد میں گل حسن کے گھر سے واپس چلا آیا۔ میں بڈھے کو گرفتار کرنا

چاہتا تھا لیکن پھر میں نے ارادہ بدل دیا۔ اگر ہسپتال میں گل حسن کی حالت بہتر تھی تو مطلوبہ معلومات اس سے بآسانی حاصل ہو سکتی تھیں۔ بڈھا ایک تو "بڈھا" تھا۔ دوسرا خاصا ڈھیٹ اور واویلا کرنے والا شخص دکھائی دیتا تھا۔ ایسے لوگوں کے سامنے بعض اوقات پولیس بھی بے بس ہو جاتی ہے۔ زیادہ مارو پیٹو تو جان جانے کا ڈر ہوتا ہے۔ پیار محبت سے یہ جہاندیدہ لوگ قابو میں نہیں آتے۔ پھر عمر رسیدہ شخص چاہے کیسا بھی قابل نفرت مجرم ہو اس کی بزرگی کا خیال بہر حال رکھنا پڑتا ہے۔ میں نے سوچا اگر گل حسن بات چیت کے قابل نہ ہوا تو پھر بڈھے کو پکڑ کر لے جاؤں گا۔ اس بات کا مجھے قریب قریب یقین ہو چکا تھا کہ گل حسن اور اس کا باپ کوئی گل کھلانے والے ہیں۔ میں ایسا بچہ نہیں تھا کہ بڈھے کی اس بات پر یقین کر لیتا کہ گھر سے فرار ہونے والا شخص کوئی چور اچکا تھا۔ وہ یقیناً میری آمد سے پہلے گھر میں موجود تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ کوئی کرائے کا قاتل ہو یا گل حسن کا کوئی دوست ہو لیکن وہ کوئی بھی تھا اس کے ارادے اچھے نہیں تھے۔ ورنہ میری آمد سے خوفزدہ ہو کر وہ بھاگ نہ نکلتا۔ پھر جس طرح اس نے مجھ سے ہاتھا پائی کی تھی یہ بات صاف ظاہر ہوتی تھی کہ وہ کوئی عام شخص نہیں ہے۔ اس قسم کے کاموں کا اسے خاصا تجربہ ہے۔ بہر حال ایک بات کا مجھے اطمینان تھا۔ اگر آج رات ان لوگوں نے کوئی واردات کرنا تھی تو وہ اب نہیں کریں گے۔ حالات سے ظاہر تھا کہ گل حسن موقع سے اپنی غیر موجودگی ثابت کرنا چاہتا تھا تا کہ اس پر کوئی الزام نہ آئے لیکن اس کا یہ منصوبہ بری طرح فیل ہو چکا تھا۔

☆======☆======☆

بڈھے کی دھاڑیں سارے تھانے میں گونج رہی تھیں اس نے مجھے اور میرے عملے کو ہر معروف اور غیر معروف گالی دے ڈالی تھی۔ اس کی عمر اسّی سال کے قریب تھی، لیکن آواز اب بھی چالیس سال کی لگتی تھی۔ میرے تین کانسٹیبلوں نے اسے بمشکل قابو کر رکھا تھا۔ آخر میری ہدایت پر انہوں نے بوڑھے کا منہ کھول کر اس کے اندر کپڑا ٹھونس دیا اور اوپر سے ایک پٹی باندھ دی۔ الٹی ہتھکڑی لگا کر اسے حوالات میں دھکیل دیا۔ وہ پھر بھی اچھل کود کر رہا تھا اور حلق سے غوں غاں کی آوازیں نکال رہا تھا۔ اسے بڑی حکمت عملی سے تھانے لایا گیا تھا۔ ورنہ وہ ایسا تماشا لگاتا کہ اس کے پیچھے پیچھے لوگوں کا پورا جلوس تھانے پہنچتا۔ اس کا نام احمد علی خاں تھا۔ جس بازار میں اس کی دکان تھی وہاں اسے عجب خان اور "بابا گولی" جیسے ناموں سے پکارا جاتا تھا۔ میں نے علی الصبح اس کے گھر ایک اے ایس آئی کو دو کانسٹیبلوں کے ساتھ بھیجا۔ وہ تینوں سادہ لباس میں تھے انہوں نے کہا کہ وہ گل حسن کے دوست ہیں اور انہوں نے تھانے

سے اس کی ضمانت کروالی ہے۔ بس ایک کاغذ آپ کا انگوٹھا ضروری ہے۔ چل کر لگا دیں بڈھے نے پہلے تو تھانے آنے سے انکار کیا لیکن اے ایس آئی بہلا پھسلا کر اسے لے آیا۔ یہاں آکر جب اس نے نقشہ دیکھا تو واویلا شروع کر دیا۔

بہر حال احمد علی خان عرف عجب خان و بابا گولی کو حوالات میں بند کرنے کے بعد میں اس کے گھر پہنچا۔ بڑھیا اور اس کی بیٹی نے تُو تُو میں میں کی کوشش کی لیکن میں نے جلد ہی انہیں ٹھنڈا کر لیا۔ احمد علی کی بہو کو علیحدہ بلا کر میں نے پھر اس سے بات چیت شروع کی۔ سب سے پہلے میں نے اسے یہ بتایا کہ تمہارا سسر اس وقت حوالات میں ہے اور اگر میں چاہوں تو وہ چار پانچ سال اس گھر کی دہلیز پار نہیں کر سکتا۔ یہ اطلاع لڑکی کے لیے نہایت سازگار ثابت ہوئی۔ میں نے دیکھا رات کی طرح ایک بار پھر اس نے گھونگھٹ کی اوٹ سے مجھے جھانکا اور اس کا لرزہ بھی قدرے کم ہو گیا۔ میں نے دوسری اطلاع اسے یہ دی کہ اس کا شوہر جو ہسپتال میں تھا وہاں سے فرار ہو گیا ہے اور جاتے جاتے پہرے پر موجود ایک کانسٹیبل کی رائفل بھی چھین لے گیا ہے۔ اس اطلاع نے لڑکی کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا (حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ گل حسن ابھی تک ہسپتال میں تھا، لیکن اس کی حالت ایسی نہیں تھی کہ میں پوچھ گچھ کر سکتا) لڑکی نے پُرتشویش نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور میں نے تصور کی آنکھوں سے دیکھا کہ پھولدار اوڑھنی کی دوسری جانب اس کے نازک ہونٹ لرز رہے تھے۔ وہ میرے جال میں پھنس چکی تھی میں نے آخری حملہ کرتے ہوئے کہا۔

"دیکھ بہن! میں پھر تجھ سے کہہ رہا ہوں۔ اگر تُو چاہے تو اپنے شوہر کو پھانسی کے پھندے تک پہنچنے سے بچا سکتی ہے۔ تُو بتا سکتی ہے کہ بندوق لے کر اس نے کس طرف رخ کیا ہے اور وہ کہاں جائے گا۔ میں بروقت پہنچ کر اسے اس جرم سے روک لوں گا۔ شراب پینے اور ہسپتال سے بھاگنے کے جرم میں اسے زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ دو برس کی قید ہو جائے گی۔ اس کے بعد وہ پھر تمہارے پاس آ جائے گا...... اب یہ فیصلہ تمہیں کرنا ہے کہ کیا چاہتی ہو۔ شوہر یا شوہر کی لاش؟"

ایک مشرقی عورت کے انداز میں وہ سسک اٹھی...... "نہیں تھانیدار صاحب! وہ کیسا بھی ہے میرا مجازی خدا ہے، اسے مرنے سے بچا لو۔"

"لیکن کیسے؟" میں نے زور دے کر کہا۔ "مجھے کیا خبر وہ کہاں گیا ہے؟"

"وہ بخت خاں کو مارنے گیا ہے۔" وہ چلا کر بولی آنسو اس کی آنکھوں سے ساون بھادوں کی بارش کی طرح برسنے لگے۔

"کون بخت خاں؟" میں نے پوچھا۔

وہ ہچکیاں لیتے ہوئے بولی۔ "بڑے ڈاکخانے کے سامنے پکی گلی میں وہ لکڑیوں کے ٹال پر کام کرتا ہے۔" اس کے انداز میں بے تابی تھی جیسے مجھے فوراً بخت خان کی طرف روانہ کرنا چاہتی ہو لیکن مجھے ایسی کوئی جلدی نہیں تھی کیونکہ میں جانتا تھا کہ گل حسن ابھی ہسپتال میں پڑا تھا۔ میں نے فوراً بات بنائی۔

"اچھا وہ بخت خاں! لیکن وہاں تو میں نے پہلے ہی پہرہ بٹھا رکھا ہے۔ گھبرانے کی بات نہیں۔ اب تم مجھے تفصیل سے سب کچھ بتا دو تا کہ میں کسی نتیجے پر پہنچ سکوں۔"

لڑکی نے چادر کا پلو درست کیا۔ پھر سسکیوں کے درمیان دھیمی آواز سے بولنے لگی۔ اس نے جو پہلا فقرہ کہا وہ یہ تھا۔ "پتہ نہیں میرے اس بیان کے بعد میرے باپ اور بھائیوں سے کیا سلوک ہو گا لیکن اپنے شوہر کو بچانے کے لیے میں آپ کو سب کچھ صاف صاف بتا رہی ہوں۔" اس تمہید کے بعد اس کا طویل بیان شروع ہوا۔ درمیان میں مَیں نے کہیں کہیں سوال بھی کیے۔ لڑکی کا نام یاسمین تھا۔ یاسمین سے مجھے جو کچھ معلوم ہوا اس کا خلاصہ کچھ یوں ہے۔

وہ شہر سے بیس پچیس میل دور جہلم کے کنارے واقع ایک خوبصورت موضع راہوال کی رہنے والی تھی لیکن یہ اس کا آبائی گاؤں نہیں تھا۔ اس کے باپ دادا آزاد قبائلی علاقے کے باسی تھے۔ وہاں ان کی کسی کے ساتھ پرانی دشمنی چلی آ رہی تھی۔ اس دشمنی کی وجہ سے ان کے خاندان کو نقل مکانی کر کے یہاں آباد ہونا پڑا۔ نقل مکانی کرنے والوں میں دو اور خاندان بھی شامل تھے۔ ان لوگوں نے یہاں مختلف کام شروع کر دیے۔ کچھ دیواریں بنانے لگے۔ کچھ شہر میں چوکیداری کرنے لگے اور کچھ نے کھیتی باڑی شروع کر دی۔ غرض وہ یہاں مستقل آباد ہو گئے۔ یاسمین اسی سرسبز گاؤں کے اونچے نیچے ٹیلوں اور گنگناتے چشموں میں پروان چڑھی۔ اس کا باپ غلام خان اور دو بھائی کاشتکاری کرتے تھے۔ زندگی کی گاڑی بڑی اچھی چل رہی تھی...... لیکن پھر ایک طوفان اٹھا۔ شیشم کا ایک درخت ان کی پُرسکون زندگیوں کو تہہ و بالا کر گیا۔ یہ درخت یاسمین کے باپ کے کھیت میں تھا۔ لیکن ساتھ والے کھیت کا مالک اسے اپنی ملکیت سمجھتا تھا۔ وہ اسے کاٹنا چاہتا تھا اور یاسمین کا باپ کسی قیمت پر اسے کھونا نہیں چاہتا تھا۔ جھگڑا بڑھتے بڑھتے بڑھ گیا۔ تمام مصالحتی کوششیں ناکام ہو گئیں۔ افسوس کی بات یہ تھی کہ جھگڑا دو ایسے گھرانوں کے درمیان تھا جو ایک ہی علاقے سے تعلق رکھتے تھے اور اکٹھے نقل مکانی کر کے یہاں آباد ہوئے تھے۔ ماضی میں ان کے دشمن اور دوست ایک تھے لیکن اب وہ آپس میں سر کاٹنے پر تُل گئے تھے۔ مخالف فریق کا سربراہ احمد علی خاں تھا (وہی احمد علی خاں

جواب یاسمین کا سسر تھا) اس نے ایک روز غلام خاں کو للکار کر کہا کہ آج رات وہ درخت کاٹ لے گا۔ اگر وہ روک سکتا ہے تو روک لے۔

اس روز یاسمین بہت روئی تھی۔ وہ جانتی تھی آج رات جھگڑا ہوگا اور اس کے باپ یا بھائیوں میں سے کوئی نہ کوئی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ اس کی ماں نے اسے سینے سے لگا لیا تھا۔ پھر ایک تاریک کوٹھڑی میں بیٹھ کر وہ دونوں دیر تک روتی رہی تھیں اور وہ یہی کر سکتی تھیں۔ مردوں کو روکنے کی نہ ان میں ہمت تھی اور نہ ان کے رسم و رواج اجازت دیتے تھے۔

اس رات یاسمین مصلیٰ بچھائے دیر تک اپنے باپ اور بھائیوں کی سلامتی کی دعائیں مانگتی رہی تھی۔ اگر اس وقت اسے معلوم ہوتا تو وہ صرف بھائیوں کی سلامتی کی دعا ہی نہ مانگتی ان کے دشمنوں کی خیر بھی مانگتی لیکن اس کی سوچ اتنی دور کیسے پہنچ سکتی تھی۔ اسے کیا معلوم تھا ایک روز اسے اپنے باپ اور بھائیوں کے گناہوں کا کفارہ ادا کرنا پڑے گا۔ اس کے زخمی جسم کو ناکردہ گناہوں کی سزا میں کانٹوں پر گھسیٹا جائے گا۔ وہ عورت تھی اس لیے اس کی سوچ کی اتنی بلند پرواز نہیں تھی۔ یا شاید اس کی سوچ کے پر پیدائش کے روز ہی کاٹ دیے گئے تھے۔ وہ صرف اپنے باپ اور بھائیوں کی سلامتی مانگتی رہی اور اس کے کنوارے ہونٹوں سے نکلی ہوئی معصوم دعا قبول ہوئی۔ اس کا باپ اور بھائی زندہ سلامت واپس آ گئے۔ وہ کتنا خوش ہوئی تھی، اس نے اپنے باپ کا چوڑا سینہ دیکھا تھا۔ بھائیوں کے مضبوط بازو دیکھے تھے اور نظروں نظروں میں ان کی بلائیں لے لی تھیں۔ اس نے اور اس کی ماں نے سمجھا تھا شاید جھگڑا ٹل گیا لیکن جھگڑا ہوا تھا اور اس جھگڑے میں مخالف فریق کا ایک نوجوان سینے پر گولی لگنے سے ہلاک ہو گیا تھا۔

......دشمنی کی جڑیں مزید گہرائی میں اتر گئی تھیں۔ اس کا پھل اور کڑوا ہو گیا تھا لیکن معصوم یاسمین ان حقیقتوں سے بے خبر وادی کے نشیب و فراز میں اپنی زندگی کا حسین ترین گیت گنگنا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک شہزادہ بسا ہوا تھا اور اس کی الہڑ دھڑکنوں میں ایک ہی نام کی گونج تھی۔ بخت خاں...... بخت خاں، وہ اس کا چچا زاد بھائی تھا۔ بادامی آنکھوں، سرخ ہونٹوں اور لمبے قد والا غیور بخت خاں، وہ اسے اپنی زندگی کی طرح چاہتا تھا۔ اسے دیکھتے ہی یاسمین کی پلکیں جھک جاتی تھیں اور دوبارہ اٹھنے کا نام نہ لیتی تھیں۔ یاسمین کو دیکھتے ہی بخت خاں کے قدم رک جاتے تھے اور آگے بڑھنے سے انکار کر دیتے تھے۔ جہلم کے گنگناتے پانی نے بارہا ان کی بے آواز سرگوشیاں سنی تھیں...... لیکن پھر ایک روز سب خواب ٹوٹ گئے۔ جدائی کا وہی صدیوں پرانا قصہ دوہرایا گیا۔

غلام خاں اور احمد علی خاں کی دشمنی جو ایک شخص کی موت کے بعد اور بڑھ گئی تھی۔ فیصلہ مانگ رہی تھی۔ قتل کے بعد دو تین بار دونوں پارٹیوں کے افراد جھگڑ چکے تھے۔ خدشہ تھا کہ مزید خون خرابہ ہوگا۔ کچھ لوگوں کا مشورہ تھا کہ پولیس کو اطلاع دی جائے لیکن دونوں فریق پولیس تک پہنچنا بزدلی سمجھتے تھے۔ احمد علی خاں نے تو اپنے آدمی کے قتل کو بھی پولیس سے پوشیدہ رکھا تھا بلکہ گاؤں میں بھی بہت سوں کو خبر نہیں تھی کہ احمد علی کا آدمی غلام خاں اور اس کے بیٹوں کے ہاتھوں ہلاک ہوا ہے۔ دراصل ان لوگوں میں پولیس تک پہنچنے کا رواج ہی نہ تھا۔ وہ ہمیشہ سے اپنے فیصلے بندوق کی گولی سے کرتے آئے تھے۔

......لیکن اس دفعہ گولی نہیں چلی۔ ان کے چند بزرگوں نے اپنے قدیم رواج کے مطابق ''ننواتے'' (مصالحت) کی کوشش شروع کر دی۔ بالآخر ان کی کوشش کامیاب ہوئی۔ غلام خاں اور احمد علی خاں میں صلح ہو گئی۔ صلح کی شرائط کے مطابق غلام خاں نے احمد علی خاں کی کھیتی مناسب داموں میں خرید لی۔ اس کے علاوہ اس نے ''سورہ'' پر بھی آمادگی ظاہر کی......

یہاں میں ''سورہ'' کے بارے میں آپ کو کچھ بتا دوں۔ یہ رسم ہمارے شمالی اور قبائلی علاقوں میں قدیم زمانے سے رائج ہے۔ لڑائی جھگڑے کے دوران جب کوئی شخص اپنے مخالف فریق کا کوئی آدمی قتل کر دیتا ہے یا اتفاقاً اس سے ایسا ہو جاتا ہے تو مقتول کے ورثاء اس کے جان کے درپے ہو جاتے ہیں۔ انتقام لیے بنا انہیں چین نہیں آتا۔ قاتل اگر اپنے جرم پر پشیمان ہو اور خون خرابے کا یہ سلسلہ ختم کرنا چاہتا ہو تو وہ مقتول کے وارثوں سے معافی کا طلبگار ہوتا ہے۔ معافی مانگنے کے مختلف طریقے ہیں جن میں قاتل اپنی عاجزی اور ندامت کا اظہار کرتا ہے۔ مصالحت کی مختلف کوششوں میں ایک یہ ''سورہ'' کی رسم بھی ہے۔ اس میں قاتل اپنی نیک خواہشات کے اظہار کے لیے اپنی بیٹی بہن یا کسی اور قریبی عزیز کا رشتہ مقتول کے خاندان کے کسی فرد سے کر دیتا ہے۔ اس سے ''رشتے داری'' وجود میں آتی ہے اور عموماً قتل و غارت کا سلسلہ رک جاتا ہے۔ ''سورہ'' کا اصل مقصد مقتول کے خاندان کی تالیف قلب ہوتی ہے لیکن بعض صورتوں میں اس کے نتائج توقع کے خلاف بھی نکلتے ہیں...... بہر حال باہمی صلاح و مشورے سے غلام خاں نے اپنی بیٹی یاسمین کا رشتہ مقتول کے ورثاء کو دینے کا فیصلہ کر لیا۔ بخت خاں پر یہ خبر بجلی بن کر گری۔ یاسمین اپنی معصوم محبت کو سینے سے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ رات کی تاریکی نے ان دونوں کی بے آواز فریادیں سنیں۔ وہ تڑپے مچلے لیکن نامہرباں وقت اپنا وار کر کے رہا۔

یاسمین کی شادی احمد علی کے بیٹے گل حسن سے کر دی گئی۔ وہ ''گل'' جو خار سے بڑھ کر

نوکیلا اور تکلیف دہ تھا۔ وہ کسی طرح اس کے لائق نہیں تھا۔ نکھٹو، آوارہ، مُھگنا اور بلا کا نشے باز، گاؤں کی کوئی لڑکی اس کی طرف دیکھنا گوارا نہ کرتی تھی لیکن رسم ورواج کی رسی نے گاؤں کی سب سے حسین لڑکی کو باندھ کر اس کے قدموں میں ڈال دیا۔ وہ اپنی خوش بختی پر جتنا بھی ناز کرتا کم تھا لیکن اس نے اس ہیرے کی قدر نہ کی۔

شادی کے بعد احمد علی خاں زمین کی رقم لے کر بیٹے کے ساتھ شہر آ گیا۔ یہاں ایک دو ماہ تو خیریت سے گزرے پھر یاسمین کا شوہر اپنی ماں اور بہن کی باتوں میں آنے لگا۔ وہ دونوں ہر وقت یاسمین پر طعنہ زنی کرتی رہتیں۔ اسے خونی کی بیٹی اور قاتلوں کی بہن قرار دیتیں۔ مرنے والا یاسمین کی ساس کا بھانجا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ یاسمین کو دیکھتے ہی اس کی ساس اپنے دل کی نفرت کو چھپا نہ سکتی۔ کوئی نہ کوئی بات اس کے منہ سے ایسی نکل جاتی جو یاسمین کو پہروں رونے پر مجبور کرتی۔ آہستہ آہستہ نند اور ساس کی زیادتیاں بڑھتی گئیں۔ شوہر نے پہلے پہل معمولی سی مزاحمت کی پھر وہ بھی ماں اور بہن کا طرف دار ہو گیا۔ گاؤں تو وہ لوگ چھوڑ ہی چکے تھے اب انہیں کس بات کا ڈر تھا۔ یاسمین پر مظالم کی بارش کر دی گئی۔ روکھی سوکھی کھا کر وہ سارا دن گدھے کی طرح کام کرتی۔ پھر شوہر کی مار کھا کر سو رہتی۔ سسر کا سلوک تو پہلے دن ہی سے اچھا نہیں تھا۔ جب اس نے دوسروں کو بھی ہمنوا دیکھا تو اور شیر ہو گیا۔ وہ ظالم بڈھا شوہر کے سامنے یاسمین کو پیٹتا اور گالیاں دیتا۔ ماں باپ کی عزت پر چپ چاپ قربان ہو جانے والی انمول بیٹی کو سسرال والوں نے جہنم میں جھونک دیا۔

کچھ عرصہ یوں ہی گزرا پھر حالات نے ایک اور کروٹ بدلی ایک روز یاسمین کو اس کے شوہر نے اتنا مارا کہ اس کا ہاتھ ٹوٹ گیا۔ یہ گھر والوں کے لیے پریشانی کی بات تھی۔ اب گھر کا کام کاج کون کرتا۔ اس خیال کے پیش نظر اس کا شوہر اسے اپنے تانگے پر بٹھا کر ہڈیاں جوڑنے والے کے پاس لے گیا۔ ہاتھ بندھوا کر جب وہ واپس آ رہی تھی دفعتاً اس کی نگاہ ایک شخص پر پڑی۔ وہ بخت خاں تھا۔ اس کے خوابوں کا شہزادہ اس کے بچپن کا ہمجولی۔ گرد میں اٹا ہوا وہ ایک سڑک پار کر رہا تھا۔ یاسمین تانگے کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ ایک لمحے کے لیے دونوں کی نگاہیں ملیں اور کائنات کی حرکت جیسے تھم گئی۔ دوسرے ہی لمحے یاسمین نے اپنا چہرہ چادر میں چھپا لیا...... لیکن جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ بخت خاں اسے دیکھ چکا تھا۔ وہ تیزی سے مڑا اور تانگے کے پیچھے ہولیا۔ اس کی نگاہیں یاسمین کے سراپا پر جم کر رہ گئی تھیں اور وہ مقناطیس کی طرح تانگے کے ساتھ کھنچا چلا جا رہا تھا...... کبھی تیز چلتے اور کبھی بھاگتے ہوئے اس نے تعاقب جاری رکھا اور آخر یاسمین کا گھر دیکھ لیا۔

یہاں سے کہانی نے ایک نیا موڑ لیا۔ بخت خاں نے بہت جلد اندازہ لگا لیا کہ اس گھر میں یاسمین کے ساتھ کیا سلوک ہو رہا ہے۔ وہ اکثر ان کے گھر کے گرد منڈلاتا رہتا۔ یاسمین اسے اپنی چھت پر سے دیکھتی اور کانپ جاتی۔ وہ جانتی تھی بخت خاں کی یہاں موجودگی اس کے گھر والوں سے زیادہ دیر چھپی نہ رہ سکے گی اور ایک روز ایسا ہی ہوا...... یاسمین کی ساس نے اپنی بیٹی سے کہا میں نے آج منشی مرجان کے بیٹے بخت خاں کو گلی میں کھڑے دیکھا ہے۔ بیٹی نے جواب دیا کہ اسے بھی کل یہی شک ہوا تھا جیسے بخت خاں گلی میں کھڑا ہے۔ وہ دن تو یاسمین کے لیے قیامت ہی ثابت ہوا۔ ساس اور نند نے اسے مل کر اتنا مارا کہ وہ بے ہوش ہو گئی۔ اسے ہوش آیا تو اس کی ساس تانگے کے اڈے پر اپنے بیٹے کو اطلاع دینے جا چکی تھی۔

یاسمین جانتی تھی بخت خاں ابھی گلی میں ہو گا (وہاں اس نے ایک کریانہ فروش سے دوستی گانٹھ رکھی تھی) وہ جانتی تھی اس کے شوہر گل حسن کو پتہ چلا تو وہ آگ بگولا ہو کر یہاں پہنچ جائے گا۔ اس نے کوشش کی کہ کسی طرح بخت خاں کو خبردار کر دے لیکن اس کی نند نے اسے کمرے میں بند کر کے باہر سے کنڈی لگا دی۔ اس سے بدترین مجرموں کا سلوک کیا جا رہا تھا۔ حالانکہ وہ بخت خاں کو ہوشیار کرنا نہیں چاہتی تھی صرف اپنے شوہر کو بچانا چاہتی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ گل حسن اسے مار کر سلاخوں کے پیچھے چلا جائے یا پھانسی کے تختے پر جا کھڑا ہو، آخر وہ اس کا شوہر تھا لیکن وہ کچھ نہ کر سکی۔

بعد ازاں جب وہ ہوش میں آئی تو اسے پتہ چلا کہ گلی میں سخت جھگڑا ہوا تھا۔ اس کے شوہر نے اپنے کچھ تانگہ بان ساتھیوں کے ساتھ مل کر بخت خاں کو بری طرح مارا تھا۔ وہ تو شاید اسے جان سے ہی مار ڈالتے لیکن عین اس وقت جب گل حسن اس کو بندوق کے بٹ مار رہا تھا۔ بندوق کھل گئی اور گولیاں نیچے گر گئیں۔ اس سے پہلے کہ گل حسن بندوق دوبارہ لوڈ کرتا کچھ محلے داروں نے ہمت سے کام لیا اور نیچے گرے ہوئے بخت خاں کو موقعے سے بھگا دیا۔

اس روز یاسمین کو کچھ نہیں کہا گیا کیونکہ اگر شوہر اسے مارتا تو محلے دار سمجھتے کہ اس معاملے میں وہ بھی قصور وار ہے۔ بس سارے گھر والے سرخ سرخ آنکھوں سے اسے گھورتے رہے۔ چند روز بعد شوہر اور سسر نے مل کر دل کی بھڑاس نکالی اور یاسمین کے ٹوٹے بازو کی پرواہ کیے بغیر اسے خوب پیٹا گیا......

اس رات مار کھا کر وہ ایک تاریک کوٹھڑی میں پڑی اپنی بدنصیبی پر آنسو بہا رہی تھی کہ اچانک دروازے پر آہٹ ہوئی۔ اس نے جلدی سے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ اس کے سامنے بخت خاں کھڑا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر بھونچکا رہ گئی۔ بخت خاں دلیری سے اندر گھس آیا۔ اس نے

کہا یاسمین میں دیکھ رہا ہوں اس گھر میں تیرا کیا حشر ہو رہا ہے۔ تمہارا باپ اور تمہارے بھائی یہ سب کچھ برداشت کر سکتے ہوں گے میں نہیں کر سکتا۔ میں تمہیں اس قید سے رہائی دلانے آیا ہوں۔ جواب میں یاسمین نے اسے بری طرح ڈانٹ دیا۔ اس نے کہا اگر اس کے دل میں اس کے لیے تھوڑی سی بھی ہمدردی ہے تو وہ یہاں سے چلا جائے اور کبھی واپس نہ آئے لیکن وہ کوئی فلمی ہیرو نہیں تھا اور نہ یہ فلمی کہانی تھی۔ بخت خاں نے کہا۔

''یاسمین! میں تمہیں اس دوزخ میں چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ تم میرے ساتھ جاؤ گی یا میں بھی تمہارے ساتھ مروں گا۔''

یاسمین نے اس کے بہت ہاتھ جوڑے، منتیں کیں اور بمشکل اسے واپس بھیجا۔ بخت خاں نے یاسمین کی حالتِ زار گاؤں جا کر اس کے والدین سے بیان کی۔ اس کی نیت بھلائی کی تھی لیکن بدنامی اس کے حصے میں آئی۔ یاسمین کا والد اور بڑا بھائی اسے دیکھنے کے لیے یہاں شہر پہنچے۔ یاسمین کے سسرال والے ان سے اخلاق کے ساتھ پیش آئے۔ ایک رات انہیں مہمان رکھا اور اگلے روز کہہ کر واپس بھیج دیا کہ آئندہ وہ یہاں نہ آئیں کیونکہ ان کے رشتے دار اس میل جول کو اچھی نظر سے نہیں دیکھیں گے، زخم ابھی تازہ ہیں کہیں کسی کے منہ سے کوئی بات نہ نکل جائے۔ اس ایک رات میں یاسمین کے سسرال والوں نے اس کے والد کے کان اتنی مہارت سے بھرے کہ وہ اپنی بیٹی کے لیے ہی پرایا ہو گیا۔ انسے یہ سمجھنے پر مجبور کر دیا گیا کہ بخت خاں نے ابھی تک یاسمین کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ وہ اسے ورغلا کر اس کا گھر برباد کرنے کے چکر میں ہے۔ بخت خاں کا حوالہ ایسا تھا کہ یاسمین کے والد اور بھائی کو فوراً یقین آ گیا۔ انہوں نے یاسمین سے بات کرنا بھی گوارا نہ کیا اور اسے روتا چھوڑ کر علی الصبح واپس چلے گئے۔

یاسمین کے گرد کھینچی ہوئی دیواریں اور بلند اور مضبوط ہو گئی تھیں وہ ان دیواروں کے اندر ہر روز جیتی اور ہر روز مرتی تھی اور ان دیواروں سے باہر بخت خاں موجود تھا۔ اس کی حوصلہ مند نگاہیں اور توانا بازو کچھ کر گزرنے کو بے قرار تھے۔ اس نے شہر ہی میں لکڑیوں کے ایک ٹال پر مزدوری شروع کر دی تھی، وہ جوان اور دلیر تھا بہت جلد اس نے شہر میں قدم جما لیے...... ایک روز وہ ایک کوٹھی میں لکڑیاں ڈالنے گیا تو کوٹھی کے سیٹھ سے اس کا جھگڑا ہو گیا۔ بخت خاں نے نتائج سے بے پرواہ ہو کر بد تمیز سیٹھ کو بری طرح پیٹ ڈالا۔ اس کے دو ملازم آگے بڑھے تو ان کی بھی ٹھکائی کر دی۔ اس واقعے نے بخت خاں کو گلی محلے میں مشہور کر دیا۔ کئی نوجوان اس کی دوستی کا دم بھرنے لگے۔ بخت خاں اب گاؤں تو جا نہیں سکتا تھا وہاں یاسمین

کے والدین ہی اس کے دشمن نہیں تھے پورا گاؤں اس پر تھو تھو کر رہا تھا۔ اس نے بہتر سمجھا کہ گاؤں جا کر لوگوں کی ملامتی نظروں کا سامنا کرنے کی بجائے وہ یہیں چھپا رہے۔

دوسری طرف یاسمین کا شوہر بھی اس بات سے آگاہ ہو چکا تھا کہ بخت خاں اسی شہر میں موجود ہے۔ وہ اس کے خون کا پیاسا ہو رہا تھا اور اسے ختم کر دینا چاہتا تھا۔ یاسمین ہر صبح یہ دھڑکا لے کر جاگتی تھی کہ آج کا سورج بخت خاں کو قبر اور اس کے شوہر کو جیل میں پہنچا دے گا......

قارئین یہ وہ حالات تھے جو یاسمین نے مجھے بتائے اور انہی حالات میں گل حسن شراب کے نشے میں دھت تھانے کے سامنے سے گانا گاتا ہوا پکڑا گیا تھا۔ اگر معاملے کو سرسری نظر سے دیکھا جاتا تو کہا جا سکتا تھا کہ گھریلو پریشانی نے گل حسن کو نشے اور آوارہ گردی پر مجبور کر دیا تھا۔ یہ بھی کہا جا سکتا تھا کہ بخت خاں چونکہ دوبارہ گل حسن کے محلے میں نہیں آیا تھا اس لیے یہ صرف یاسمین کا شبہ تھا کہ گل حسن بخت خاں کو قتل کرنا چاہتا ہے...... لیکن میں اس معاملے کو گہری نظر سے دیکھنے پر مجبور تھا۔ میں اس شخص کو کیسے فراموش کر سکتا تھا جو ایک رات پہلے مجھ سے زور آزمائی کر کے فرار ہو گیا تھا۔ حالات صاف طور پر ایک واردات کی طرف اشارہ کر رہے تھے اور وہ واردات تھی بخت خاں کا قتل۔ جہلم کنارے کے خوبصورت گاؤں سے شروع ہونے والی اس طویل کہانی کا انجام سمجھ میں آ رہا تھا۔ بکھری ہوئی کڑیاں خود بخود مربوط ہو رہی تھیں۔ احمد علی اور اس کا بیٹا بخت خاں کا قصہ پاک کر دینا چاہتے تھے لیکن چند ہفتے قبل گل حسن محلے میں اس سے دست و گریبان ہو چکا تھا سب لوگ جانتے تھے کہ گل حسن نے بخت خاں کو کتے کی موت مارنے کی قسم کھائی تھی۔ اب اگر بخت خاں قتل ہو جاتا تو سب سے پہلے گل حسن پر ہی شک کیا جاتا۔ اس نے ایک منصوبہ بنایا بخت خاں کو قتل کرنے کا کام اس نے اپنے کسی جگری دوست یا کرائے کے بدمعاش کو سونپا۔ جس وقت گل حسن تھانے میں گرفتار ہوا وہ بدمعاش اس کے گھر میں موجود تھا اور اپنے ''مشن'' پر روانہ ہونے کی تیاری کر رہا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ روانہ ہوتا میں وہاں جا پہنچا۔ چونکہ وہ مجرم تھا اس لیے مجھے دیکھ کر اس نے بھاگنے کی کوشش کی۔ بعد کے واقعات آپ جانتے ہی ہیں۔

میں لڑکی سے کافی دیر مختلف پہلوؤں پر بات کرتا رہا۔ واپس آنے سے پہلے میں نے آخری سوال پوچھتے ہوئے اس سے کہا۔

''جہاں مجھے یہ سب کچھ بتایا ہے اب یہ بھی بتا دو کہ کل رات تمہارے گھر سے فرار ہونے والا شخص کون تھا؟''

یاسمین نے کہا۔" تھانیدار جی! میں اس کا نام نہیں جانتی لیکن وہ ہمارے گاؤں کا ہی رہنے والا ہے۔ اس کے چہرے پر ناک کے قریب چاقو کا ایک گہرا زخم ہے جو آنکھ تک چلا گیا ہے۔ وہ صرف ایک آنکھ سے ہی دیکھ سکتا ہے وہ بڑا خطرناک شخص ہے۔ گاؤں میں لوگ اس سے بہت دبتے ہیں۔"

میں نے پوچھا۔" کیا گل حسن سے اس کی دوستی ہے؟"

یاسمین نے کہا" بالکل نہیں اس سے پہلے میں نے کبھی دونوں کو اکٹھے نہیں دیکھا۔ وہ پرسوں یہاں آیا تھا اور تب سے ہمارے گھر میں ہے۔ میرا شوہر اور وہ چپکے چپکے باتیں کرتے رہے ہیں۔ کل میں نے دروازے سے کان لگا کر سننے کی کوشش کی تھی۔ وہ بار بار کسی سیٹھ کا ذکر کر رہے تھے۔ ایک دو بار انہوں نے بخت خاں کا نام بھی لیا۔ بہت جلد مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ بخت خاں کو قتل کرنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ میں رونے دھونے کے علاوہ اور کیا کر سکتی تھی......اور وہ میں اب تک کر رہی ہوں۔"

☆======☆======☆

جب میں تھانے پہنچا دوپہر ہو چکی تھی۔ احمد علی خاں عرف بابا گولی حوالات کے فرش پر منہ کھولے سو رہا تھا۔ اس کی بہو نے گراں قدر معلومات فراہم کی تھیں۔ میں نے سب سے پہلے بخت خاں کو تھانے بلانے کا فیصلہ کیا۔ کوئی ایک گھنٹے بعد وہ میرے سامنے کھڑا تھا۔ پھٹے پرانے کپڑوں میں اس کا مضبوط جسم سونے کی طرح دمک رہا تھا۔ وہ ایک دراز قد خوبصورت پٹھان تھا۔ میں نے دیکھتے ہی اندازہ لگا لیا کہ وہ ایک سچا کھرا، بے خوف شخص ہے۔

اس نے اب تک کوئی جرم نہیں کیا تھا ہاں جرم کا نشانہ ضرور بننے والا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اسے حالات سے باخبر کر کے ہوشیار رہنے کا مشورہ دوں لیکن پوچھ گچھ کے دوران ایک ایسی بات معلوم ہوئی جس نے مجھے چوکنا کر دیا اور مجھے اندازہ ہوا کہ بخت خاں کو صرف ہوشیار کرنے کی ضرورت ہی نہیں اس کی حفاظت بھی ضروری ہے وہ میری توقع سے زیادہ خطرے میں تھا۔

پوچھ تاچھ کے دوران اچانک میرے ذہن میں ایک سوال آیا تھا اور بڑا اچھا ہوا کہ یہ سوال میرے ذہن میں آ گیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ تمہارے گاؤں کا وہ شخص کون ہے جس کی ایک آنکھ چاقو کے وار سے ضائع ہو چکی ہے۔ اس ذکر پر بخت خاں بری طرح چونک گیا الٹا مجھ سے پوچھنے لگا۔

"جناب! آپ کو وہ کہاں ملا ہے؟"

میں نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔" صرف میرے سوال کا جواب دو۔"

اس نے کہا۔" اس کا نام دلاور ہے جی! نہایت غصیلا اور کینہ پرور شخص ہے۔ کسی کے خلاف دل میں کوئی بات بٹھا لے تو نکالتا نہیں بدلہ لے کر چھوڑتا ہے۔ آج سے کوئی ایک سال پہلے گاؤں میں اس نے ایک راہ چلتی لڑکی کو مذاق کیا۔ لڑکی نے اسے تھپڑ دے مارا۔ دلاور نے بدتمیزی کی کوشش کی میں موقع پر موجود تھا خاموش نہ رہ سکا۔ آگے بڑھ کر میں نے دلاور کا گریبان پکڑ لیا۔ لوگوں نے بیچ بچاؤ کرا دیا دلاور نہایت خاموشی کے ساتھ وہاں سے چلا گیا۔ میرے بعض دوستوں نے کہا کہ اب اس شخص سے ہوشیار رہنا، تمہیں نقصان پہنچانے کی کوشش ضرور کرے گا لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ دلاور بعد میں کئی بار مجھ سے ملا۔ لگتا تھا وہ اس دن کا واقعہ بھول چکا ہے۔ پھر بھی کبھی کبھی مجھے اس کی آنکھوں میں نفرت کی جھلک نظر آتی تھی۔ میں سوچتا تھا شاید یہ میرا وہم ہے کوئی چار ماہ پہلے کی بات ہے اس نے اسی لڑکی کے گھر کی دیوار پھاندی، رات کا وقت تھا سب سوئے ہوئے تھے۔ اس نے لڑکی کو خنجر دکھایا اور اس کی عزت لوٹ لی۔ صبح لڑکی کے گھر والوں نے اسے چارپائی پر بے ہوش پایا۔ دلاور گاؤں سے فرار ہو گیا اور کوشش کے باوجود اس کا سراغ نہیں ملا۔ اب آپ کی زبانی اس کا نام سن کر مجھے خیال آ رہا ہے کہ کوئی خاص بات ہے۔"

"ہاں!" میں نے کہا۔" بہت خاص بات ہے، وہ شخص تمہیں جان سے مارنے کے لیے یہاں پہنچ چکا ہے۔ اب اپنا انتظام کر لو۔"

بخت خاں حیرانی سے میری طرف دیکھنے لگا...... کچھ ضروری ہدایات دے کر میں نے اسے واپس بھیج دیا۔ ذہن ایک بار پھر اس کیس کی گتھیاں سلجھانے لگا۔ اس سے پہلے میں مطمئن تھا کہ گل حسن کی گرفتاری کے بعد واردات ٹل جائے گی کیونکہ اس کی منصوبہ بندی ناکام ہو چکی تھی۔ اس وقت میرا خیال تھا کہ گل حسن نے جس شخص کو استعمال کیا ہے وہ اس کا کوئی دوست یا کرائے کا قاتل ہے لیکن اب یہ انکشاف ہوا تھا کہ وہ شخص خود بھی بخت خاں کا دیرینہ دشمن ہے اور اسے قتل کرنے کی شدید خواہش اس کے اندر موجود ہے۔ اس کا مطلب تھا گل حسن کی گرفتاری کے باوجود اس پر کسی بھی وقت حملہ ہو سکتا ہے۔

جیسا کہ بعد میں پتہ چلا گل حسن جانتا تھا کہ دلاور خان کی بخت خاں سے پرانی عداوت ہے اور موقعہ ملنے پر وہ اس کی جان سے کھیل جائے گا۔ اتفاقاً اسے دلاور خاں کا وہ ٹھکانہ بھی معلوم تھا جہاں وہ لڑکی کی آبروریزی کے بعد چھپا ہوا تھا۔ ایک روز گل حسن اس کے ٹھکانے پر پہنچا اور اسے بتایا کہ بخت خاں آج کل شہر میں موجود ہے۔ اس نے دلاور سے کہا کہ

تمہارے لیے اپنے دشمن سے بدلہ لینے کا یہ بہت اچھا موقع ہے۔ وہ شہر میں لکڑی کے ایک ٹال پر کام کرتا ہے اور رات کو تنہا وہاں سوتا ہے۔

دلاور خود بھی بخت خاں سے اپنا حساب چکانا چاہتا تھا۔ دراصل وہ ایک دو ہفتے میں ملک چھوڑ کر جا رہا تھا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب لوگ کویت دوبئی وغیرہ جانے کی بجائے محنت مزدوری کے لیے ایران کا رخ کیا کرتے تھے۔ دلاور کے کچھ دوست ''ابادان'' میں موجود تھے انہوں نے وہاں اسے اپنے پاس بلا لیا تھا۔ دلاور نے سوچا بخت خاں سے اپنی بے عزتی کا بدلہ چکانے کا یہ آخری موقعہ ہے کیوں نہ اس سے فائدہ اٹھایا جائے۔ وہ فوراً گل حسن کے ساتھ شہر چلا آیا اور دونوں دو روز تک اس منصوبے کی تفصیلات طے کرتے رہے۔ گل حسن چاہتا تھا کہ قتل اس طرح کیا جائے کہ کسی اور شخص کا کام نظر آئے اتفاقاً کچھ روز پہلے بخت خاں کا ایک کوٹھی کے سیٹھ سے جھگڑا ہوا تھا۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے اس نے سیٹھ اور سیٹھ کے آدمیوں کو بری طرح پیٹا تھا۔ یہ واقعہ قتل کی تفتیش کو غلط راستے پر ڈال سکتا تھا۔ گل حسن چاہتا تھا کہ بخت خاں کو بندوق یا ریوالور کی بجائے کلہاڑی سے قتل کیا جائے دراصل اس سیٹھ کا ایک موالی ملازم تھا جو ہر وقت کندھے پر کلہاڑی رکھتا تھا۔ بخت خاں کے ساتھ لڑائی میں بھی وہ موالی پیش پیش رہا تھا۔ لاش پر کلہاڑی کے زخم پائے جاتے تو یقیناً پولیس کا دھیان سیٹھ اور اس کے ملازمین کی طرف جاتا۔ مزید احتیاط کی خاطر گل حسن نے فیصلہ کیا کہ قتل سے ایک دن پہلے یا قتل کی رات وہ کسی بہانے پولیس کو اپنی گرفتاری دے دے گا۔ یوں اس پر شک پڑنے کا امکان بالکل ختم ہو جائے گا...... اور یہی احتیاط گل حسن کی سب سے بڑی غلطی ثابت ہوئی۔ میں نے اس کی ناقص اداکاری پہچان لی اور شک میں پڑ گیا (یہاں میں یہ بتا دوں کہ یاسمین نے دلاور اپنے شوہر کی گفتگو میں جس سیٹھ کا ذکر سنا تھا یہ وہی سیٹھ تھا جس سے بخت خاں کا جھگڑا ہوا تھا)

اب حل طلب مسئلہ یہ تھا کہ وہ ایک آنکھ والا خطرناک شخص دلاور کہاں تھا۔ جب تک وہ آزاد تھا بخت خاں کسی بھی لمحے جان سے ہاتھ دھو سکتا تھا۔ خوش قسمتی سے اسی شام گل حسن کو ہوش آ گئی۔ ڈاکٹر نے کہا کہ میں اس سے مختصر بات کر سکتا ہوں۔ میں گل حسن سے ملا اور سخت رویہ اختیار کرتے ہوئے اسے بتایا کہ اس کے والدین، بہن اور بیوی سب تھانے میں ہیں۔ اگر وہ نہیں چاہتا کہ ان سے بھی اس کی طرح سلوک ہو تو وہ دلاور کا پتہ بتا دے۔ میرے تیوروں سے گل حسن مجھے کوئی نہایت سفاک قسم کا خر دماغ تھانیدار سمجھ رہا تھا۔ یہ بھی اسے معلوم تھا کہ میری مار نے اسے جان کے لالے ڈال دیے تھے (حالانکہ یہ سب کچھ حادثاتی

طور پر ہوا تھا) اس نے جلد ہی میرے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ یوں بھی بیمار شخص میں قوتِ مزاحمت کم ہوتی ہے۔ اس نے مجھے دلاور کا پتہ لکھوایا اور میں ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اس کی طرف روانہ ہو گیا لیکن اس سے پہلے میں نے سادہ کپڑوں میں ملبوس دو مسلح ہیڈ کانسٹیبلوں کو...... دلاور کا حلیہ بتا دیا تھا اور انہیں ہدایت کی تھی کہ اس قسم کے کسی بھی شخص کو وہاں دیکھ کر فوراً گرفتار کر لیں۔

جہلم سے چند میل دور ''دینے'' کا قصبہ ہے۔ یہاں ان دنوں مسز اقبال نامی ایک ادھیڑ عمر ڈاکٹر تھی۔ گل حسن کی اطلاع کے مطابق دلاور اسی ڈاکٹر کی کوٹھی میں ملازم تھا۔ میں مسز اقبال کی بنگلہ نما کوٹھی پر پہنچا تو رات کے ساڑھے نو بج چکے تھے۔ یہاں مجھے ہر چہرہ پریشان دکھائی دیا۔ مسز اقبال سے گفتگو کے بعد مجھے پتہ چلا کہ دلاور خاں جو رحمت خاں کے فرضی نام سے اس کوٹھی میں ملازمت کر رہا تھا کوئی ڈیڑھ گھنٹہ پہلے اپنی مالکہ کی ''موریس'' گاڑی لے کر فرار ہو گیا ہے۔ پتہ چلا کہ مسز اقبال کا ڈرائیور موجود نہیں تھا۔ رحمت نے مسز اقبال سے چابی مانگی کہ وہ گاڑی کو گیراج میں کھڑا کر دیتا ہے۔ چونکہ وہ ایک دو دفعہ پہلے بھی ایسا کر چکا تھا، اس لیے مسز اقبال نے چابی دے دی دلاور گاڑی لے کر نکل گیا۔ مجھے جس خبر نے چونکایا وہ ایک خانساماں نے دی۔ اس نے بتایا کہ جاتے وقت رحمت (دلاور) نے پتلون قمیض پہن رکھی تھی (یہ پرانی پتلون قمیض اسے صاحب نے دی تھی) اور اس کے پاس ریوالور بھی تھا۔ اس نے اس سے پوچھا کہ کہاں جا رہا ہے اس نے کہا کہ ایک جگہ پھڈا ہے بس ذرا رعب وغیرہ ڈالنا ہے۔

صورت حال پریشان کن تھی۔ اگر دلاور بخت خاں کا قصہ تمام کرنے گیا تھا تو اسے اپنے مقصد میں کامیابی ہو سکتی تھی۔ وہ جس حلیے میں روانہ ہوا تھا وہ بالکل نیا تھا وہاں پر موجود میرے کانسٹیبل کار سے اترنے والے ایک خوش پوش شخص کو ٹال کے اندر داخل ہونے سے کیونکر روک سکتے تھے۔ خطرے کا شدید احساس مجھے ہوا اور میں بھاگتا ہوا مسز اقبال کی کوٹھی سے باہر آیا۔ موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور حتی الامکان رفتار سے شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔ ٹھیک پچیس منٹ بعد میں موٹر سائیکل بڑے ڈاکخانے کی سڑک پر موڑ رہا تھا۔

اس وقت رات کے ساڑھے دس بج چکے تھے۔ یہ متوسط علاقہ خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا۔ سردی بھی کچھ زیادہ تھی لوگ اپنے اپنے گھروں میں دبکے سو رہے تھے۔ ڈاکخانے کے سامنے پکی گلی میں ایک کمزور سی اسٹریٹ لائٹ اندھیرا دور کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ میں نے یہ دیکھ کر خدا کا شکر ادا کیا کہ گلی میں کوئی کار موجود نہیں۔ اس کا مطلب تھا دلاور ادھر نہیں

آیا۔ جونہی موٹرسائیکل رکی، مونگ پھلی والی ایک ریڑھی کے قریب کھڑا میرا کانسٹیبل تیزی سے میرے پاس آگیا۔ اس نے رپورٹ دیتے ہوئے کہا کہ سب ٹھیک ہے، پھر اچانک جیسے اسے کچھ یاد آیا بولا۔ ''بس ابھی آپ کے آگے آگے عینک والے ایک بابو صاحب گلی میں گئے تھے......''

اس سے آگے میں نے کچھ نہیں سنا اور ریوالور نکال کر ٹال کی طرف بھاگا۔ یقیناً دلاور خاں نے احتیاط کے طور پر اپنی کار کسی دوسری گلی میں کھڑی کر دی تھی۔ میں بھاگتا ہوا خود کو ملامت کر رہا تھا کہ میرا ذہن پہلے اس طرف کیوں نہیں گیا میں اطمینان کے ساتھ ہیڈ کانسٹیبل سے رپورٹ لیتا رہا تھا یہ چند لمحوں کی تاخیر بخت خاں کے لیے جان لیوا ثابت ہو سکتی تھی۔

جب میں ٹال کے سامنے پہنچا، دونوں کانسٹیبل بھی وہاں پہنچ گئے۔ میں نے انہیں انگلی سے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ ٹال کا دروازہ کوئی نہیں تھا۔ میں دبے پاؤں اندر چلا گیا اس وقت مجھے دستک کی مدھم آواز سنائی دی۔ جواب میں ایک جھلائی ہوئی آواز آئی۔

''میں کہتا ہوں جب تک بولو گے نہیں میں دروازہ نہیں کھولوں گا۔ کون ہو تم؟''

میں نے پہچان یہ آواز بخت خاں کی تھی۔

''میں دشمن نہیں دوست ہوں۔'' جواب میں ایک بھاری آواز سنائی دی۔

''تمہارا نام کیا ہے؟'' بخت خاں نے بے خوف لہجے میں پوچھا۔

جواب میں ٹھک ٹھک کی تیز آواز آنے لگی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ باہر والا شخص غصے میں دروازہ توڑنے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ شخص یقیناً دلاور خاں تھا۔ وہ غالباً اس چھوٹے سے کمرے کے دروازے پر زور آزمائی کر رہا تھا جو لکڑیوں کے ڈھیر کے پیچھے نظر آ رہا تھا۔ میں لکڑیوں کی آڑ لیتا تیزی سے کمرے کے سامنے پہنچا۔ وہ دلاور خاں ہی تھا اور غصے میں پاگل ہو رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں وزنی لکڑی تھی اور وہ پے در پے اسے دروازے کے بالائی تختوں پر مار رہا تھا۔

''ہینڈز اپ!'' میں ریوالور سیدھا کر کے گرجا۔

دلاور نے تیزی سے گھوم کر مجھے دیکھا، پھر حسب سابق وہ تیر کی طرح میری طرف آیا۔ میری انگلی لبلبی پر تھی لیکن میں اسے گولی مارنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے اس کی ٹانگ کو نشانہ بنایا۔ جیسا کہ بعد میں پتہ چلا کہ گولی اس کی پنڈلی کو چھیلتی ہوئی گزر گئی تھی۔ اس نے لکڑی کا بھرپور وار میرے سر پر کیا۔ میں تیزی سے نیچے جھکا۔ پھر میری زوردار لات اس کے سینے پر پڑی وہ اچھل کر لکڑی تولنے والے ترازو پر گرا۔ قریب ہی لکڑیاں پھاڑنے والا بڑا ہتھوڑا پڑ

تھا اس نے لپک کر وہ ہتھوڑا اٹھا لیا مگر وہ اس کی توقع سے زیادہ وزنی ثابت ہوا۔ وہ پھرتی سے مجھ پر حملہ نہ کر سکا۔ اس کے ہتھوڑا اٹھاتے اٹھاتے میں نے دائیں ہاتھ کی مٹھی بند کی پھر میرا بھرپور مکہ اس کے چہرے سے ٹکرایا۔ اس نے چہرہ بچانے کی کوشش کی لیکن یہ گل حسن کے گھر کا صحن نہیں تھا اس دفعہ نشانہ خطا نہیں گیا۔ ضرب عین اس کی ٹھوڑی پر پڑی تھی۔ سر جھٹکے سے دائیں طرف گھوما عینک جو اس نے آنکھ کا نقص چھپانے کے لیے پہن رکھی تھی اچھل کر دور جا گری وہ کٹے ہوئے درخت کی طرح دھڑام سے زمین پر آ رہا۔ اس سے پہلے کہ وہ پھر اٹھنے کی کوشش کرتا۔ میرے دونوں کانسٹیبلوں نے اسے جکڑ لیا۔ بخت خاں ہاتھ میں لاٹھی تھامے چند گز کے فاصلے پر حیران کھڑا تھا۔ کمرے سے باہر نہ آ کر اس نے عقل مندی کا ثبوت دیا تھا، یہ اس کی بزدلی ہرگز نہیں تھی۔ ایک سمجھدار شخص کو اس موقع پر ایسا ہی کرنا چاہیے تھا۔ میں نے اسے ہوشیار رہنے کی ہدایت کر رکھی تھی اور وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ کمرے سے باہر ایک شخص ہے یا ایک......درجن۔

☆======☆======☆

بخت خاں بچ گیا......اور گل حسن مر گیا۔ مگر وہ تھانے میں لگنے والی چوٹ سے نہیں مرا ہسپتال میں ہی ایک روز اسے اس کے کسی تانگہ بان دوست نے نشے کی گولیاں لا کر دیں۔ اس نے نشہ کیا اور سگریٹ پینے لگا مدہوشی میں سگریٹ بستر پر جا گرا۔ بستر کے ساتھ ہی گل حسن بھی جل گیا۔ اسے شدید زخمی حالت میں ہسپتال کے شعبہ حادثات پہنچایا گیا جہاں اس نے دم توڑ دیا۔

گل حسن کے غصیلے باپ کو اعانتِ جرم کے الزام میں جیل جانا پڑا۔ دلاور خاں پر اغوا آبروریزی اور اقدام قتل کی دفعات کے تحت مقدمے چلے......اس کہانی کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے۔ یاسمین نے پولیس کو اس لیے بیان دیا تھا تاکہ اس کا شوہر ارتکاب جرم سے بچ جائے لیکن اس بیان نے اس کے باپ اور دونوں بھائیوں کو بھی قتل کے مقدمہ میں پھنسوا دیا۔ جس شوہر کے لیے اس نے اتنی بڑی قربانی دی تھی وہ تو مر ہی گیا تھا اب اس کے باپ اور بھائی بھی اس کے دشمن تھے۔ ان کے لیے وہ جیتے جی مر گئی تھی۔ شاید وہ جیل سے باہر ہوتے تو اسے قتل ہی کر ڈالتے۔ وہ اس دنیا میں بے سہارا اور تنہا ہو گئی۔ اس نے سب کو چاہا تھا لیکن اسے سب نے نفرت دی تھی۔ نفرتوں کی ماری ہوئی یہ بے سہارا عورت شاید کسی کنوئیں میں کود جاتی لیکن بخت خاں کے مضبوط بازو اس کے ارادوں میں حائل ہو گئے۔ اس نے اسے شہر ہی میں ایک کوٹھی میں ملازمت دلا دی۔

......یاسمین نے کسی امیر گھر کے برتن مانجھنے شروع کر دیے اور بخت خاں ٹال پر لکڑیاں پھاڑتا رہا...... پھر ایک صبح کوٹھی والے اپنی منحنی ملازمہ سے محروم ہو گئے اور ٹال والا اپنے جفاکش مزدور سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ وہ دونوں ایک نئی زندگی شروع کرنے کے لیے کسی نامعلوم مقام کی طرف روانہ ہو گئے تھے۔

☆======☆======☆

غنڈہ، سڑک اور لڑکی

وہ اپنی طرز کا بے مثال شاطر تھا۔ ذاتی مفاد کے لیے اُس نے سینکڑوں زندگیوں کو داؤ پر لگا دیا۔ ایسے شخص پر قابو پانے کے لیے نواز خاں جیسے نڈر کی ضرورت تھی۔

پٹنہ کے ایک تھانے کا واقعہ ہے۔ دروازے کے عین سامنے ایک بس رکی۔ بس کی چھت پر مسافروں کا سامان رسے سے بندھا ہوا تھا۔ بس رکتے ہی کنڈیکٹر چھلانگ لگا کر نیچے اترا۔ اس کے ساتھ ہی چند مسافر بھی جلدی سے نیچے آ گئے۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھا چق کے پیچھے سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ بس سے اترنے والوں کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں ایک شخص صاف طور پر زخمی تھا اور خون اس کے سر سے بہہ کر سارے لباس کو رنگین کر چکا تھا۔ کنڈیکٹر کی ایک آنکھ بھی نیلی ہو رہی تھی۔ صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ بس والوں کے ساتھ کوئی گڑ بڑ ہوئی ہے۔ تھوڑی دیر بعد ڈرائیور اور بس کے قریباً چالیس مسافر میرے دروازے کے سامنے جمع ہو گئے۔ ان میں ایک مسافر کسی عدالت کا رجسٹرار تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کی طرف سے بات کرتے ہوئے یہ اطلاع دی کہ تھانے سے قریباً دو میل کے فاصلے پر اس بس کو لوٹ لیا گیا ہے۔ یہ واقعہ ہائی وے پر پیش آیا تھا۔ نامعلوم افراد نے سب مسافروں کی گھڑیاں نقدی اور دوسری قیمتی اشیاء چھین لی تھیں اور ایک مسافر کو شدید زخمی کرنے کے علاوہ ایک لڑکے کو بھی اغواء کر لیا تھا۔

یہ اطلاع میرے لیے بے حد تشویشناک تھی۔ پچھلے ایک برس سے میرے تھانے کے علاقے میں ایک بھی ڈاکہ نہیں پڑا تھا اور افسران اس بات پر میری تعریف بھی کر چکے تھے۔ میں نے فوری طور پر ہیڈ کوارٹر فون کر کے ناکہ بندی کی درخواست کی۔ اس کے بعد بس کا تفصیلی معائنہ کیا اور مسافروں کے بیان قلمبند کرنے شروع کیے۔ پہلے تو میں یہی سمجھتا رہا کہ شدید زخمی ہونے والا شخص وہی ہے جس کا سر پھٹا ہوا ہے اور لباس پر خون کے دھبے ہیں۔ مگر بیانات سے پتہ چلا کہ وہ زخمی تو ہسپتال میں پڑا ہے اور اس کے بچنے کی امید کم ہی ہے۔

رجسٹرار سندھو نے کہا۔ ''انسپکٹر! ظالموں نے اس کے پیٹ میں کرپان ماری ہے اور

رائفل کے بٹ مار مار کر بیچارے کی کئی ہڈیاں توڑ ڈالی ہیں۔ ہم اسے سول ہسپتال میں داخل کرانے کے بعد ہی آپ کی طرف آئے ہیں۔''

ایک دوسرے مسافر نے بتایا۔ ''وہ اغوا ہونے والے لڑکے کا باپ یا چچا وغیرہ ہے۔ جب مسلح آدمیوں نے لڑکے کو اٹھانے کی کوشش کی تو وہ تڑپ کر ان کے سامنے آ گیا۔ اس نے ایک شخص کے ہاتھ سے رائفل چھیننے کی کوشش کی مگر کالی پگڑی والے نے......''

''ٹھہرو......'' میں نے مسافر کو ٹوکا۔ ''اس طرح کچھ پتہ نہیں چلے گا۔ یہ واقعہ شروع سے بتاؤ۔''

رجسٹرار سندھو نے کہا۔ ''میں بتاتا ہوں انسپکٹر! ہماری بس ''وارانا سی'' سے مظفر پور کے لیے صبح چھ بجے چلی تھی۔ راستے میں مندر سٹاپ سے وہ شخص اپنے لڑکے کے ساتھ بس میں سوار ہوا۔ باپ بیٹا مسلمان کاشت کار لگتے تھے۔ دونوں نے میلی سی دھوتیاں پہن رکھی تھیں۔ لڑکے نے ایک پھٹے پرانے کمبل کی بکل مار رکھی تھی۔ باپ کے ہاتھ میں ایک گٹھڑی تھی اور لڑکے نے دو مرغیاں سنبھال رکھی تھیں۔ وہ پچھلی سیٹوں پر بیٹھ گئے۔ ڈیڑھ گھنٹے کا سفر سکون سے کٹا پھر ایک جگہ سے چار پانچ مشٹنڈے بس میں سوار ہو گئے وہ لباس سے شہری لگتے تھے۔ بس میں بیٹھتے ہی انہوں نے شور شرابہ شروع کر دیا۔ ان میں سے ایک دو نے پی بھی رکھی تھی۔ بڑی واہیات باتیں کر رہے تھے۔ درمیانی سیٹوں پر ایک پارسن لیڈی بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ باتوں باتوں میں اسے چھیڑنے لگے پھر ان میں سے ایک لمبا تڑنگا سکھ اٹھ کر ڈرائیور کی طرف چلا گیا۔ اس کے سر پر کالی پگڑی تھی۔ وہ ڈرائیور کے پاس جھک کر کچھ بولتا رہا۔ ہم یہی سمجھے کہ راستے وغیرہ کے بارے میں پوچھ رہا ہے۔ مگر پھر اچانک اس نے ڈرائیور کا گریبان پکڑ لیا اور کرپان اس کی گردن پر رکھ دی۔ بس لہرانے لگی۔ مسافروں کی چیخیں نکل گئیں۔ چند دلیر آدمیوں نے کرپان والے کو روکنا چاہا تو اس کے ساتھیوں میں سے دو نے پستول نکال لیے اور سب مسافروں کو ننگی گالیاں دینے لگے۔ یہ بیچارا جس کا سر پھٹا ہوا ہے ایک ڈاکو سے الجھ پڑا۔ بس بیچارے کی کم بختی آ گئی۔ اس کے سر پر پستول کا دستہ مارا گیا۔ یہ نیچے گر گیا تو ٹھڈے مار مار کر نیم جان کر دیا گیا۔ ڈرائیور کی گردن پر کرپان رکھی تھی۔ اسے بس کچے میں اتارنا پڑی۔ درختوں میں جا کر ڈاکو اور شیر ہو گئے۔ انہوں نے تمام مسافروں سے نقدی اور گھڑیاں وغیرہ چھین لیں۔ دو عورتوں کے کانوں سے بالیاں وغیرہ بھی اتروا لیں۔ پھر وہ اس لڑکے کی طرف بڑھے اور اسے ساتھ لے جانے کے لیے کھینچنے لگے۔ وہ لڑکا خوف سے پیلا پڑ گیا۔ اس کے سرپرست نے ان کا ہاتھ روکنا چاہا انہوں نے اس کے پیٹ میں ٹانگیں ماریں اور اٹھا

کر پچھلی سیٹوں پر پٹخ دیا۔ پھر کالی پگڑی والے سکھ نے لڑکے کو کندھے پر لادا اور بس کے دروازے کی طرف بڑھا۔ لڑکے کا سرپرست بھاگ کر پھر سکھ کی ٹانگ سے لپٹ گیا۔ اس کی چیخ و پکار سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ایک دوسرے کو پہلے سے جانتے ہیں اور ان کی دشمنی نئی نہیں ہے۔ سکھ کے ساتھی لڑکے کے سرپرست کو پیٹنے لگے مگر اس نے سکھ کی ٹانگیں نہیں چھوڑیں اور اس کے ساتھ گھسٹتا بس سے نیچے جا گرا۔ وہ زور زور سے مدد کے لیے بھی پکار رہا تھا۔ کالی پگڑی والے نے خطرناک لہجے میں کہا۔ ''چھوڑ دے ٹانگیں نہیں تو جان سے مار دوں گا۔''
لیکن اس نے سکھ کو نہیں چھوڑا۔ سکھ نے ہاتھ گھمایا اور کرپان بے دریغ اس کی پسلیوں میں گھونپ دی۔ وہ شخص پھر بھی سکھ کو نہیں چھوڑ رہا تھا۔ سکھ کا ایک ساتھی آگے آیا اور اس نے رائفل کو نالی کی طرف سے پکڑ کر لڑکے کے سرپرست کو بے دریغ پیٹنا شروع کر دیا۔ وہ بڑا خوفناک منظر تھا۔ وہ اسے اسی جگہ جان سے مار دینا چاہتے تھے۔ گولی صرف اس لیے نہیں چلا رہے تھے کہ اردگرد کھیتوں میں کام کرنے والے ہوشیار نہ ہو جائیں۔ ہماری طرف اسلحہ اٹھا ہوا تھا۔ ہم بالکل بے بس تھے۔ آخر لڑکے کے سرپرست نے بے سدھ ہو کر کالی پگڑی والے سکھ کی ٹانگیں چھوڑ دیں اور وہ لوگ بھاگتے ہوئے درختوں میں گم ہو گئے۔

اغوا اور ڈکیتی کی رپورٹ درج کرنے کے بعد میں اس شخص کو دیکھنے ہسپتال روانہ ہوا۔ جس نے اس واردات میں سب سے زیادہ نقصان اٹھایا تھا۔ ہسپتال والوں نے بتایا کہ زخمی کی حالت مخدوش ہے اور وہ بیان دینے کے قابل نہیں۔ وہ ہنگامی وارڈ میں تھا۔ میں نے اس کی صورت دیکھی۔ اسے خون اور گلوکوز لگا ہوا تھا۔ عمر 45 سال کے لگ بھگ تھی۔ اس نے داڑھی رکھی ہوئی تھی اور ماتھے پر محراب تھا۔ دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ مسلمان ہے۔ شکل و صورت سے شریف اور صلح پسند آدمی نظر آتا تھا۔ معلوم نہیں اس کی دشمنی کس سے اور کیوں پیدا ہوئی تھی۔ بس کے مسافروں میں سے کوئی ایک بھی مجرموں کو پہچان نہیں سکا تھا۔ نہ ہی وہ مضروب اور اس مغوی لڑکے کو پہچانتے تھے۔ یعنی اس وقت تک سب اندھیرے میں تھا۔ جب تک زخمی ہوش میں نہ آتا کوئی رائے قائم کرنا بہت مشکل تھا۔ میں نے بڑے ڈاکٹر سے ملاقات کی۔ اس نے بتایا کہ زخم گہرا ہے۔ کرپان دائیں پسلیوں کے اندر قریباً تین انچ تک گئی ہے۔ پھیپھڑے پر زخم آئے ہیں۔ اس کے علاوہ رائفل کی ضربوں سے نچلا جبڑا اور دونوں بازوؤں کی ہڈیاں کئی جگہ سے ٹوٹ گئی ہیں۔ ڈاکٹر نے کہا کہ اگلے بارہ گھنٹوں تک مریض کا ہوش میں آنا بہت مشکل ہے اور اگر ایسا ہو بھی گیا تو وہ بیان دینے کے قابل نہیں ہو گا۔ میں نے ڈاکٹر سے ان اشیاء کے بارے پوچھا جو زخمی کے لباس سے برآمد ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر نے

مجھے اپنے معاون کے ساتھ ہسپتال کے سٹور میں بھیج دیا۔ یہاں ایک الماری میں زخمی کا خون آلود دھوتی کرتہ اور دیگر اشیاء رکھی تھیں۔ دھوتی کرتہ بوسیدہ تھا اور اس میں پسینے کی مہک رچی بسی تھی۔ کُرتے کی جیب سے بس کے دو ٹکٹ نکلے تھے۔ تھوڑی سی نقدی تھی۔ ایک پنج سورۃ اور ایک چھوٹا سا جیبی چاقو تھا۔ میں نے یہ ساری چیزیں اپنی تحویل میں لے لیں۔ اس کے بعد ایک فوٹو گرافر کو بلوایا اور زخمی کی دو تصویریں اتروالیں۔

ان کاموں سے فارغ ہو کر میں ہسپتال سے واپس تھانے پہنچا۔ تھانے میں زخمی کی گٹھڑی موجود تھی اور وہ مرغیاں بھی تھیں جو مغوی لڑکے کے ہاتھوں سے نکل کر بس میں رہ گئی تھیں۔ میرے لیے اہم چیز گٹھڑی تھی۔ میں نے اسے احتیاط سے کھولا۔ اس میں کپڑے تھے، گڑ کی ایک پوٹلی تھی، تھوڑا سا تمباکو اور ستو تھے۔ کپڑوں میں سے تین جوڑے مردانہ تھے جن کے بارے میں اندازہ لگایا کہ یہ لڑکے اور اس کے سرپرست کے ہیں۔ جبکہ تین جوڑے کسی عورت کے تھے۔ میں نے بہت کوشش کی لیکن گٹھڑی میں سے لڑکے اور اس کے سرپرست کے نام پتے کا کوئی کھوج نہیں ملا...... اب آ جا کے ''مندر سٹاپ'' والا سراغ ہی رہ جاتا تھا۔ باپ بیٹا یہاں سے بس میں سوار ہوئے تھے۔

میں نے اگلے روز علی الصبح بلال شاہ کو ساتھ لیا اور سرکاری جیپ پر پٹنہ سے مندر سٹاپ کی طرف روانہ ہوا۔ یہ جگہ شہر سے کوئی تیس میل کے فاصلے پر تھی۔ جیپ میں ہمارے ساتھ رجسٹرار سندھو بھی تھا۔ یہ بنگالی پٹنہ ہی کا رہنے والا تھا اور ہمارے ساتھ بہت تعاون کر رہا تھا۔ راستے میں سندھو سے مسلسل گفتگو ہوتی رہی۔ میرے پوچھنے پر سندھو نے بتایا کہ لڑکے کی عمر تیرہ چودہ سال ہو گی یا ہو سکتا ہے اس سے کچھ کم زیادہ ہو۔ اس نے بادامی رنگ کا میلا سا کھیس لپیٹ رکھا تھا۔ چہرے اور ہاتھوں پر کالک لگی ہوئی تھی۔ لگتا تھا شہر میں موٹر مکینکی کرتا ہے۔ اگر اس کے سر پر استرا نہ پھیرا ہوتا اور وہ نہا دھو کر اچھے کپڑے پہن لیتا تو خاصا خوبصورت نظر آتا۔

میں نے سندھو سے پوچھا۔ ''تمہارا اپنا کیا اندازہ ہے۔ لڑکے کو کیوں اغوا کیا گیا ہے؟''

وہ الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''انسپکٹر! میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ کوئی پرانی دشمنی لگتی ہے۔ وہ باپ بیٹے کو سنگین گالیاں دے رہے تھے۔ لڑکا ان سے بہت ڈرا ہوا تھا اور اس کے حلق سے آواز تک نہیں نکل رہی تھی۔ ہاں باپ نے کافی دلیری دکھائی۔ وہ آخر وقت تک اغوا کرنے والوں سے لڑتا رہا۔ مار کھاتا رہا اور چیختا چلاتا بھی رہا۔ وہ بار بار کہہ رہا تھا۔ ''ہمارا کیا قصور

ہے؟ ہم نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟'' ایک مشٹنڈے نے قہقہہ لگایا اور گالی دے کر کہا۔

''تم نے کچھ نہیں بگاڑا لیکن تمہاری کچھ لگتی نے تو بگاڑا ہے ناں...... کلیجہ چھلنی کر دیا ہے ہمارا۔''

سندھو کا بتایا ہوا یہ جملہ خاصا اہم تھا کسی اور نے اپنے بیان میں یہ بات نہیں بتائی تھی یا شاید بدحواسی میں کسی کو یاد ہی نہ رہا ہو۔ سندھو بولا۔ ''ہو سکتا ہے وہ غنڈے کسی عورت کے چکر میں ہوں اور اسے قابو کرنے کے لیے انہوں نے لڑکے کو اغوا کر لیا ہو۔''

میں نے کہا۔ ''تمہارا مطلب ہے کہ یہ لڑکا اس عورت کا بھائی یا بیٹا وغیرہ ہوگا۔''

''اندازہ تو یہی کہتا ہے جی......''

میرا دھیان ان کپڑوں کی طرف چلا گیا جو زخمی کی گٹھڑی سے برآمد ہوئے تھے۔ ان میں زنانہ لباس بھی تھے لیکن کوئی عورت لڑکے اور اس کے سرپرست کے ساتھ موجود نہیں تھی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے لڑکا، لڑکے کا سرپرست اور وہ عورت مجرموں کے خوف سے بھاگے تھے لیکن راستے میں انہوں نے عورت کو کہیں چھپا دیا یا کسی کی پناہ میں دے دیا تھا اور خود مظفر پور کی طرف جا رہے تھے کہ پکڑے گئے۔

بہرحال کئی امکانات ہو سکتے تھے۔ میں جلد از جلد مندر سٹاپ پہنچنا چاہتا تھا۔ اس علاقے کا تھانیدار تیواری سنگھ میرا بڑا گہرا شناسا تھا۔ امید تھی وہ بھرپور تعاون کرے گا۔ ہم دوپہر کے وقت مندر سٹاپ پہنچے اور سیدھے تیواری کے تھانے کا رخ کیا۔ تیواری سنگھ خوش اخلاقی سے ملا چائے وغیرہ سے فارغ ہو کر میں نے اسے اپنی آمد کا مقصد بتایا اور مدد چاہی۔ میں نے اسے زخمی کی وہ تصویریں بھی دکھائیں جو ہسپتال میں کھینچی گئی تھیں۔ تھانیدار نے اسی وقت ایک ادھیڑ عمر ہندو کوچوان کو قریبی گاؤں سے تھانے بلا بھیجا۔ اس شخص کا نام رام دیا تھا۔ تھانیدار تیواری نے بتایا کہ رام دیا مندر سٹاپ کے تانگہ اڈے کا سب سے پرانا کوچوان ہے۔ قریبی دیہات سے جتنے بھی تانگے، چھکڑے وغیرہ سٹاپ پر آتے ہیں یہ ان سب کے مالکوں سے واقف ہے بلکہ ان کے دلوں کے حال بھی جانتا ہے۔ تیواری نے رام دیا سے کہا کہ وہ سب کوچوانوں کو اڈے پر اکٹھا کرے ہم ایک دو گھنٹے میں وہاں پہنچ رہے ہیں۔ رام دیا نے پریشانی سے پوچھا۔

''خیر تو ہے بابو جی!''

تیواری نے کہا۔ ''خیر ہی ہے۔ کوچوانوں سے کچھ سواریوں کے بارے میں پوچھنا ہے۔ یہ سواریاں کل صبح مندر سٹاپ سے مظفر پور جانے والی بس میں سوار ہوئی تھیں۔''

دیا رام نے کہا۔ ''سواریوں کا حلیہ وغیرہ؟''

تیواری نے میری دی ہوئی دونوں تصویریں دیا رام کے سامنے کر دیں۔ دیا رام کچھ دیر غور سے تصویریں دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں بلا کی ذہانت تھی۔ اچانک بولا۔ ''بابو جی! اس شخص کے ساتھ ایک گورا چٹا بالک بھی تھا ناں، بادامی رنگ کے کھیس والا۔ اس نے نسواری چپل پہن رکھی تھی۔''

''ہاں...... ہاں......'' میں نے بے اختیار کہا۔

''اور ایک گٹھڑی بھی تھی ان کے پاس۔''

''بالکل'' بلال شاہ نے دل و جان سے اقرار کیا۔

''میں نے انہیں کل اڈے پر دیکھا تھا۔ میرے بیٹے چھوٹو نے ان سے بات بھی کی تھی۔ میرا کھیال ہے بابو صاحب! ہمیں سارے کوچوانوں کو بلانے کی جرورت ناہیں۔ میں اپنے بیٹے چھوٹو کو بلا لیتا ہوں، وہی ہم کو ان کے بارے بتا دے گا۔''

میں دیا رام کی یادداشت پر حیران ہوا۔ وہ تصویریں دیکھ کر اس نے نہ صرف زخمی کو پہچان لیا تھا بلکہ یہ بھی بتا دیا تھا کہ اس کے ساتھی لڑکے نے بادامی کھیس اور نسواری چپل پہن رکھی تھی۔ انسپکٹر تیواری کو دیا رام پر مکمل بھروسہ تھا۔ اس نے دیا رام کو بھیجا اور وہ آدھ گھنٹے بعد اپنے بیٹے چھوٹو رام کو لے کر تھانے آ گیا۔ چھوٹو رام بھی باپ کی طرح گدرائے ہوئے جسم کا گول مٹول شخص تھا۔ وہ تھانے بلائے جانے سے قطعی پریشان نہیں تھا۔ لگتا تھا انسپکٹر تیواری سے دونوں کوچوانوں کی گاڑھی چھنتی ہے اور وہ وقتاً فوقتاً اسے خبریں لا کر دیتے رہتے ہیں۔

چھوٹو رام نے کہا۔ ''جناب! وہ باپ بیٹا کسی تانگے یا چھکڑے پر نہیں آئے تھے بلکہ بیس کوس پیدل چل کر ناری پور سے پکی سڑک تک پہنچے تھے۔ انہوں نے مجھ سے بس کا سمے پوچھا تھا۔ میں نے کہا تھا۔ ''پہلی بس تو صبح چار بجے نکل گئی ہے۔ دوجی بس آٹھ بجے آئے گی اور دوپہر ڈیڑھ بجے مجفر پور پہنچائے گی۔ وہ دونوں مجفر پور جانا چاہتے تھے وہاں ان کا کوئی رشتے دار رہتا ہے۔ وہ بہت تھکے ہوئے تھے خاص طور پر لڑکے کا تو برا حال تھا۔ جوتا اس کے پاؤں میں کاٹ رہا تھا اور ایڑی زخمی ہو گئی تھی۔ ویسے وہ کچھ عجیب سا لڑکا تھا۔ چپ چاپ اور سہما ہوا۔ جیسے کوئی اس کے پیچھے لگا ہوا ہو۔''

میں نے پوچھا۔ ''تمہیں یقین ہے کہ ان کے ساتھ کوئی تیسرا نہیں تھا۔ میرا مطلب ہے کوئی لڑکی یا عورت۔''

''نہیں حجور! وہ میرے سامنے اڈے پر پہنچے تھے اور میرے سامنے ہی لاری میں بیٹھے

تھے۔ کرم دین، اشوک اور رمجان علی چھکڑا بان گواہ ہیں اس بات کے۔''

اپنی طویل گفتگو میں چھوٹو رام نے صرف ایک کام کی بات بتائی تھی اور وہ یہ کہ لڑکا اور زخمی آپس میں باپ بیٹا تھے اور ان کا تعلق ناری پور سے تھا...... ناری پور کسی گاؤں کا نام نہیں تھا بلکہ ''دارا ناسی'' کے نواح میں ایک پورا علاقہ تھا جس میں پندرہ بیس گاؤں اور کئی قصبے شامل تھے یہاں پچھلے دنوں ہندو مسلم فسادات بھی ہوئے تھے اور ان کی خبریں اخباروں کی زینت بنی رہی تھیں۔ کسی ایڈریس کے بغیر مغوی لڑکے کے گاؤں یا قصبے تک پہنچنا مشکل تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ اس مشکل کو حل کیا جا سکتا ہے۔ ہر تھانے میں پولیس کے مخبر ہوتے ہیں اور اگر وہ دل لگا کر کوشش کریں تو گھر سے غائب ہو جانے والے کسی شخص کو ڈھونڈ لینا ان کے لیے مشکل نہیں ہوتا۔ مگر اس سرکھپائی کی نوبت تو تب آتی جب زخمی کوئی بیان نہ دے سکتا اور مجھے امید تھی کہ وہ بیان دے سکے گا۔ اسی روز میں اور بلال شاہ مندر سٹاپ سے واپس شہر آ گئے۔

اگلے روز میرا اسب انسپکٹر سارا دن کوشش کرتا رہا کہ کسی طرح زخمی سے اس کا نام پتہ پوچھ سکے مگر ڈاکٹروں نے اسے اپنے مریض تک نہیں جانے دیا۔ ان کا خیال تھا کہ مریض کی حالت اس قابل نہیں۔ رات گئے میں خود ہسپتال پہنچا اور انچارج ڈاکٹر سے کہہ سن کر زخمی سے بات کرنے کی اجازت لے لی۔ زخمی کے پاس جا کر احساس ہوا کہ ڈاکٹر ٹھیک ہی کہتے تھے۔ وہ ابھی تک نیم بے ہوش تھا۔ اس کا چہرہ سوج چکا تھا اور سانس آسانی سے نہیں آتی تھی۔ پہلے میں نے سوچا کہ واپس لوٹ جاؤں لیکن پھر دل میں آئی کہ اب آیا ہوں تو بات کر ہی لی جائے اور یہ فیصلہ کر کے میں نے ٹھیک ہی کیا کیونکہ وہ رات زخمی کی آخری رات تھی۔ اگلے روز علی الصبح وہ جان بحق ہو گیا۔ میں نے چہرہ اس کے چہرے کے پاس کیا اور کندھے کو ذرا سا ہلا کر کہا۔

''سنو میں انسپکٹر نواز خاں ہوں۔ تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔ ہندو غنڈے تمہارے بچے کو اٹھا لے گئے ہیں۔ میں اسے ڈھونڈ نکالوں گا مگر اس کے لیے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ تم میری بات سن رہے ہو ناں؟''

اس نے اپنی پوری کوشش کے ساتھ آنکھیں کھولیں اور دھندلائی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ مگر تادیر نہیں دیکھ سکا اور پلکیں بھاری ہو کر نیچے گر گئیں۔ میں نے کہا۔

''تم حملہ آوروں کے نام بتا سکتے ہو۔'' اس کے نیلگوں ہونٹوں میں جنبش پیدا ہوئی۔ میں نے کان اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ وہ کسی کا نام لے رہا تھا۔ بے پناہ کوشش کے باوجود میں یہ نام نہیں سن سکا۔ تفتیش کرنے والے کے لیے یہ بہت بے بسی کا لمحہ ہوتا ہے۔ مظلوم اس

کے سامنے ہوتا ہے ظالم کا نام مظلوم کے ہونٹوں پر ہوتا ہے لیکن جسم میں اتنی توانائی نہیں ہوتی کہ وہ قانون کی مدد کر سکے۔ صرف دو تین لفظوں کی بات ہوتی ہے۔ مگر ساری زندگی کروڑوں الفاظ بولنے والا شخص اپنی زندگی کے یہ اہم ترین الفاظ ادا کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ ایسے موقعوں پر تحریر سے کام لیا جاتا ہے۔ میرا دھیان بھی اس طرف گیا لیکن ایک تو زخمی کے دونوں ہاتھ پلستروں میں جکڑے ہوئے تھے، دوسرے وہ پڑھا لکھا بھی دکھائی نہیں دیتا تھا...... مجبوری ہی مجبوری تھی۔ پہلے سوال کا جواب حاصل کرنے میں ناکام رہنے کے بعد میں نے دوسرا سوال کیا۔ میں نے پوچھا۔

''تم ناری پور کے کس گاؤں سے آئے ہو؟''

دو تین بار سوال دہرایا تو بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ اس کے لب ایک بار پھر ہلنے لگے۔ میں نے کان پھر اس کے ہونٹوں سے لگایا۔ بار بار ایک مدھم سرگوشی کانوں تک پہنچ رہی تھی لیکن سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ میں نے اس کے ہونٹوں کی طرف دیکھا۔ ہر بار جب وہ اپنے گاؤں کا نام بتانے لگتا تھا اس کے دونوں ہونٹ ایک دوسرے سے مل جاتے تھے۔ یہ بڑی باریک سی بات تھی لیکن اتفاقاً نظر میں آ گئی۔ اس بات کا نظر میں آنا بعد میں میرے لیے مددگار ثابت ہوا۔ ہونٹوں کے ملنے سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ جس گاؤں کا نام لے رہا ہے اس کا پہلا حرف ب، پ یا م ہے اردو کے تمام حروف میں سے یہی تین حرف ہیں جنہیں ادا کرتے ہوئے ہونٹ آپس میں مل جاتے ہیں۔ اس نکتے کو ذہن میں رکھنے کے بعد میں نے ایک بار پھر زخمی کی سرگوشیاں سمجھنے کی کوشش کی اور ایک بار پھر ناکام ہوا۔ مجھے محسوس ہوا کہ فی الوقت زخمی سے کچھ بھی معلوم کرنا ممکن نہیں میں نے اس سے تسلی تشفی کی چند باتیں کیں اور کہا کہ وہ بے فکر رہے۔ اس کا بیٹا جہاں بھی ہے ہم ڈھونڈ نکالیں گے۔ وہ بس جلد سے جلد ٹھیک ہونے کی کوشش کرے۔ اس نے بھرپور کوشش کے ساتھ دوبارہ اپنی پلکیں اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ یہ نظریں مجھے ہمیشہ یاد رہیں گی۔ ان نظروں میں آنسو تھے، التجائیں تھیں۔ درد کا سمندر تھا اور یہ خاموش گزارش تھی۔

''دیکھو، میں تمہارا مسلمان بھائی ہوں، مفلس اور مجبور ہوں، مجھ پر ظلم ہوا ہے، بہت بڑا ظلم ہوا ہے، میری مدد کرو۔ بے رحم دشمنوں کے خلاف میری مدد کرو۔'' زخمی زیادہ دیر میری طرف نہیں دیکھ سکا۔ اس کی ناتوانی پلکوں کا بوجھ اٹھانے سے قاصر تھی۔ آنکھیں پھر بند ہو گئیں۔ میں بوجھل دل کے ساتھ اس کے پاس سے اٹھ آیا۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ میں اس نیک صورت شخص کو آخری بار دیکھ چکا ہوں...... جیسا کہ میں نے بتایا ہے اگلے روز علی الصبح زخمی

نے دم توڑ دیا۔ ضروری کارروائی کے بعد اس کی لاش ہسپتال کے مردہ خانے میں رکھ دی گئی۔
اب یہ معاملہ "قتل کیس" بننے کے بعد زیادہ اہم ہو چکا تھا۔ میں نے فوری طور پر ناری پور جانے کا فیصلہ کیا۔ ایک سب انسپکٹر کو چارج دینے کے بعد میں نے عملے کے دو آدمی ساتھ لیے اور پٹنہ سے براستہ غازی پور، ناری پور روانہ ہو گیا۔ ناری پور، پٹنہ، بھاگلپور کے علاقے کچھ زیادہ خوشحال نہیں تھے۔ ان دنوں تو ویسے بھی بنگال میں قحط کی سی کیفیت تھی۔ اس بھوک ننگ کا اثر ان علاقوں میں بھی تھا۔ کمزور لوگ، لاغر مویشی، بھوکے ننگے بچے اور خشک زمینیں، ناری پور میں مجھے دور تک یہی مناظر نظر آئے۔ مسلمانوں کی حالت زیادہ پتلی تھی۔ ناری پور میں تو جیسے انہیں سانپ سونگھا ہوا تھا۔ بھوک اور غربت کی مار تو پڑ ہی رہی تھی۔ ہندو اکثریت نے بھی ہر طرح سے ان کا ناطقہ بند کر رکھا تھا۔ مسلمان راہ گیر ہماری سرکاری جیپ کو سہم کر دیکھتے اور راستے سے فوراً ہٹ جاتے۔ گلیوں، بازاروں اور کھیتوں کھلیانوں میں کہیں مجھے کوئی مسلمان عورت نظر نہیں آئی۔ صاف محسوس ہو رہا تھا کہ چند ہفتے پہلے ہونے والے ہندو مسلم فساد کے اثرات ابھی یہاں باقی ہیں۔ ہم ایک طویل کچے راستے پر سفر کرنے کے بعد شام چھ بجے ناری پور کے تھانے میں پہنچے۔ یہاں کا انسپکٹر ایک فربہ اندام ہندو روپ رائے تھا۔ روپ رائے پر "روپ" تو نام کو نہیں تھا بس گوشت ہی گوشت چڑھا ہوا تھا، اس بدحال علاقے میں ایسے موٹے تازے شخص کو دیکھ کر حیرانی ہوتی تھی۔ یوں لگ رہا تھا اس علاقے کی بدحالی اور بھوک کا ذمہ دار یہی شخص ہے۔ بلال شاہ، روپ رائے کو دیکھ کر خوش ہوا۔ وجہ صاف ظاہر تھی۔ روپ رائے کھانے پینے کا شوقین لگتا تھا اور ایسے شخص کا مہمان بن کر بلال شاہ کو ہمیشہ مسرت ہوتی تھی۔

روپ رائے ہماری آمد پر حیران ہوا۔ تاہم جب میں نے اسے اپنا مکمل تعارف کرایا اور آمد کی وجہ بیان کی تو اس کی الجھن کم ہو گئی۔ اس نے ہماری آؤ بھگت کی اور تھانے کے دو صاف ستھرے کمروں میں ہمارے بستر لگا دیئے گئے۔ رات ہم چین سے سوئے۔ صرف رجسٹرار سندھو کو مشکل پیش آئی۔ کہیں سے ایک موٹی سی چھپکلی اس کے بستر پر آ گری۔ سندھو نے اسے مار بھگایا لیکن وہ پھر "ہم بستر" ہونے کے لیے آ گئی۔ سندھو اور چھپکلی میں ایک گھنٹہ آنکھ مچولی ہوتی رہی۔ آخر سندھو نے ہار مان لی دوسرے کمرے میں لیمپ جلا کر بیٹھ گیا اور حدیث کی ایک کتاب پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔ باقی رات اس نے یہی کتاب پڑھنے میں گزار دی۔ سندھو ایک کھلے ذہن کا شخص تھا۔ مطالعے کا بہت شوقین تھا اور ہر مذہب و فرقے کی کتابیں ذوق وشوق سے پڑھتا تھا۔ اس زمانے میں ایسے لوگ کم کم ہی دیکھنے میں آتے

تھے۔ جب بلال شاہ کو پتہ چلا کہ رات سندھو صاحب کے بستر پر ایک بہت خاص قسم کی چھپکلی آن گری تھی تو اس کا رنگ فق ہو گیا۔ میں سمجھ گیا کہ اب وہ آئندہ دو تین راتیں جاگ کر ہی گزارے گا۔ علی الصبح روپ رائے ایک موٹی سی فائل لے کر ہمارے پاس آ گیا۔ اس نے کہا۔
"انسپکٹر نواز! میں نے قریباً ساری چوکیوں میں پتہ کر لیا ہے۔ پچھلے پندرہ بیس روز میں کہیں بھی کسی باپ بیٹے کی گمشدگی کی رپورٹ درج نہیں ہوئی۔ نہ ہی کسی مخبر نے ایسی اطلاع دی ہے۔ یہاں رپورٹ کرانے کا رواج بہت کم ہے اور گمشدگی وغیرہ کی رپورٹ تو کوئی درج کراتا ہی نہیں ہے۔ لوگ خود ہی اپنے معاملے نپٹانا چاہتے ہیں یا پھر عاملوں اور تعویذ گنڈے والوں کا سہارا لیتے ہیں۔"
میں نے دل میں سوچا۔ "انسپکٹر روپ رائے جب تجھ جیسے پاپی وردی پہن کر بیٹھے ہوں تو کون رخ کرے گا تھانوں کا۔"
میں نے انسپکٹر روپ رائے سے پوچھا۔ "یہ فائل کیسی ہے؟"
وہ بولا۔ "تم نے ہی تو کہا تھا لانے کو۔ اس میں پورے پٹنہ اور وارانا سی کے دیہات قصبات اور گلیوں کی تفصیل ہے۔ ناری پور کے دیہات کا بھی ذکر ہے اس میں۔"
میں نے کہا۔ "اتنی لمبی چوڑی تفصیل کی ضرورت تو مجھے نہیں تھی۔ میں تو صرف قریبی دیہات کے نام دیکھنا چاہتا تھا۔"
اس نے تھوڑی سی ورق گردانی کی اور ایک صفحہ میرے سامنے کر دیا۔ یہاں انگریزی کے ٹائپ حرف میں دیہات اور قصبوں کے نام لکھے تھے۔ اس فہرست میں صرف دو نام میرے مطلب کے تھے۔ ایک گاؤں کا نام "میلی" اور ایک قصبے کا نام باز شاہی تھا۔ میں نے تفتیش کا کام انہی دو ناموں سے شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ نام میم اور ب سے شروع ہوتے تھے۔ دو مخبران دیہات میں بھیجے گئے۔ صرف ڈیڑھ گھنٹے بعد میں یہ خوش کن اطلاع سن رہا تھا کہ میلی گاؤں میں ایک اہم سراغ ہاتھ آ گیا ہے......
یہ سراغ ایک دبلے پتلے شخص کی صورت میں تھا۔ اس کا نام حسن دین تھا اور یہ "میلی" گاؤں میں سبزی فروخت کرتا تھا۔ حسن دین کو تین سپاہیوں نے یوں دبوچ رکھا تھا جیسے وہ کوئی خطرناک مجرم ہو۔ جوان کی گرفت سے نکل کر بھاگ جائے گا۔ میں نے سپاہیوں سے کہا کہ وہ اتنے پریشان نہ ہوں۔ کمزور سا بندہ ہے۔ اسے چھوڑ دیں اور ذرا سیدھے کھڑے ہونے کا موقع دیں۔ میرے کہنے پر حسن دین کو چھوڑ دیا گیا۔ میرے اشارے پر وہ سمٹا سمٹایا سا ایک

کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے بوسیدہ کُرتے کے نیچے کھلی موری کا پائجامہ پہن رکھا تھا۔ آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی اور زرد تھیں۔ سپاہیوں نے بتایا کہ یہ نصر اللہ کا دوست ہے۔

میں نے پوچھا۔ ”کون نصر اللہ؟“

ہیڈ کانسٹیبل بولا۔ ”وہی شخص جناب! جس کی تصویر آپ نے دکھائی تھی اور جس کا بیٹا اغوا ہوا ہے۔“

میرے دل میں امید کی کرن طلوع ہوئی۔ میں نے فالتو آدمیوں کو کمرے سے باہر بھیج دیا اور بڑے تحمل کے ساتھ حسن دین سے پوچھ گچھ شروع کی۔ حسن دین نے عاجزی سے کہا۔

”جناب عالی! میرا نصر اللہ سے کوئی یارانہ نہیں تھا۔ معمولی بول چال تھی۔ محلے داروں نے خواہ مخواہ مجھ پر الزام لگایا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”بھلے مانس اس میں ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔ تیرا یارانہ بھی ہوتا تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ نصر اللہ نے کوئی جرم تو نہیں کیا۔“

”تو پھر...... پھر آپ اس کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہیں؟“

میں نے جھوٹ کا سہارا لیا۔ ”اسے ایک حادثہ پیش آ گیا ہے اس کے وارثوں کو اطلاع دینا ضروری تھا۔“

”کیا ہوا اسے؟“ حسن دین نے پریشانی سے پوچھا۔ اس کی پریشانی اس بات کا ثبوت تھی کہ نصر اللہ سے اس کی گہری جان پہچان ہے۔

میں نے کہا۔ ”حادثے کے بارے میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے یہ بتاؤ کہ اس کا کوئی عزیز رشتے دار یہاں ہے؟“

”نہیں جناب! کوئی بھی نہیں جو ایک دو تھے وہ بھی یہاں سے چلے گئے۔“

میں نے صاف طور پر محسوس کیا کہ حسن دین کچھ چھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں نے کہا ”تم نصر اللہ کے پڑوسی ہو۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ نصر اللہ یہاں سے کب اور کن حالات میں گیا اور اس کے ساتھ دوسرے لوگ کون تھے؟“

حسن دین نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ”جناب عالی! مجھے کچھ زیادہ پتہ نہیں۔ نصر اللہ کہتا تھا کہ مظفر پور میں اس کے کسی رشتہ دار کی شادی ہے وہاں جا رہا ہے۔ اپنی بیٹی ثریا کے ساتھ وہ پچھلے بدھ یہاں سے نکلا تھا۔ جاتے ہوئے مجھ سے نہیں ملا۔ اس لیے معلوم نہیں وہ کب روانہ ہوا اور اس کے ساتھ کون تھا؟“

میں نے کہا۔ ”اس کا لڑکا بھی تو ساتھ تھا۔“

”لل...... لڑکا...... جج...... جی ہاں۔“ حسن دین ہکلا کر چپ ہو گیا۔ وہ صاف طور پر بات چھپا رہا تھا۔

انسپکٹر روپ رائے نے اسے ڈانٹ کر کہا۔ ”زیادہ ہوشیار بننے کی کوشش نہ کر۔ جو پوچھا جا رہا ہے صاف صاف بتا۔“ حسن دین ایک بار پھر ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔

میں نے کہا۔ ”دیکھو حسن دین...... چار روز پہلے پٹنہ میں نصر اللہ نامعلوم افراد کے ہاتھوں قتل ہو چکا ہے۔ اس کے بیٹے کو اغوا کر لیا گیا ہے۔ ہمیں مجرموں کی تلاش ہے، یہ تلاش تب ہی کامیاب ہو گی جب تم ہماری مدد کرو گے۔“

نصر اللہ کے قتل کا سن کر حسن دین کا رنگ بالکل زرد پڑ گیا۔ وہ کانپتے لرزتے ہونٹوں سے بولا۔ ”مم...... مجھے کچھ معلوم نہیں جناب عالی! میں جو جانتا تھا آپ کو بتا دیا ہے مجھ پر رحم کریں سرکار! میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔“

حسن دین کی حالت پتلی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ ایسے میں اس سے پوچھ گچھ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ میں نے انسپکٹر روپ رائے سے کہا۔ ”رائے صاحب! میرا خیال ہے ہمیں خود گاؤں چلنا چاہیے۔ نصر اللہ کو جاننے والے اور بھی بہت لوگ ہوں گے وہاں سے اصل بات کا پتہ چل ہی جائے گا۔“

روپ رائے نے حسن دین کو چند کھٹی میٹھی گالیاں دیں اور تھانے سے رخصت کر دیا۔ وہ کمرے سے یوں نکلا جیسے یہاں اسے پھانسی لگایا جانے والا تھا۔ دوپہر کا شہنشاہی کھانا کھانے کے بعد جب بلال شاہ کو گُوکی (غنودگی) چڑھنے والی تھی میں نے اس سے کہا کہ ہم ”میلی“ جا رہے ہیں۔ شام تک آ جائیں گے فکرمند نہ ہونا۔“

وہ زور سے بولا۔ ”کیا کہا؟ کہاں جا رہے ہیں؟“

میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کے دائیں کان سے روئی نکالی اور کہا۔ ”جناب شاہ صاحب! ہم میلی جا رہے ہیں۔“

دراصل اس نے کان میں دوا ڈال کر اوپر سے روئی ٹھونسی ہوئی تھی۔ بایاں کان تو اس کا ویسے ہی عرصے سے کام نہیں کرتا تھا۔ اسے ایک ہنگامے میں چوٹ لگ گئی تھی اور الٹی سیدھی دوائیں ڈال کر اس نے کان کا بیڑا غرق کر لیا تھا۔ میں نے روئی دوبارہ اس کے کان میں ٹھونسی اور خدا حافظ کہہ کر انسپکٹر روپ رائے کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ سندھو بھی ہمارے ساتھ تھا۔ وہ نوجوان آدمی تھا اور خاصا جوشیلا بھی۔ ورنہ اسے کیا ضرورت پڑی تھی اس بدحال علاقے میں ہمارے ساتھ مارا مارا پھرنے کی۔ وہ اپنی گواہی کو انجام تک پہنچانے کے لیے ہمارے ساتھ فی

سبیل اللہ تعاون کر رہا تھا۔ ہم گھوڑوں پر سوار نامی پور کے تھانے سے میلی گاؤں کی طرف روانہ ہوئے۔ راستہ کچا تھا۔ دونوں طرف خستہ حال جھونپڑے اور اجڑے بجڑے کھیت نظر آتے تھے۔ مرد وزن اور بچے تھانیدار روپ رائے کو دیکھتے تو جھک جھک کر سلام کرتے۔ راستے میں میں نے ایک گھڑ سوار اے ایس آئی کو دیکھا۔ اس نے ایک ملزم کے دونوں ہاتھ رسی میں جکڑ رکھے تھے اور رسی گھوڑے کی زین سے باندھ رکھی تھی۔ ملزم کی جواں سال بیوی تین بچوں کے ساتھ اپنے مصیبت زدہ شوہر کے پیچھے پیچھے پاؤں گھسیٹتی آ رہی تھی اور منتیں سماجتیں کر رہی تھی کہ اس کے شوہر کو چھوڑ دیا جائے۔ انسپکٹر روپ رائے کو دیکھ کر اے ایس آئی نے گھوڑے سے کود کر سیلوٹ کیا اور رپورٹ دی۔ اس کے بعد دوبارہ سوار ہو کر آگے بڑھ گیا۔ عورت کی آہ وزاری تادیر میرے کانوں میں گونجتی رہی۔

قریباً چار میل سفر کر کے ہم میلی گاؤں پہنچ گئے۔ ہماری آمد کی اطلاع پہلے ہی پہنچ چکی تھی۔ پورا گاؤں ہوشیار باش دکھائی دیتا تھا۔ مکھیا کے گھر سے باہر چارپائیاں ڈال دی گئی تھیں اور برچھی بردار ہندو مہاشے چوکس کھڑے تھے۔ وہ لوگ جن سے پوچھ گچھ کی جانی تھی ہمارے آنے سے پہلے ہی موجود تھے اور زمین پر اکڑوں بیٹھے تھے۔ ہم چارپائیوں پر براجمان ہو گئے۔ قریب ہی دو صاف شفاف گھڑے رکھے تھے اور ان کے گرد سرخ صافیاں لپٹی ہوئی تھیں۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا ان میں ہمارے لیے ٹھنڈا دودھ تھا۔ مختلف رسموں سے فارغ ہو کر میں نے نصر اللہ کے خاص جان پہچان والوں سے پوچھ گچھ شروع کی۔ ان میں پانچ چھ مسلمان اور تین ہندو تھے۔ ان سب نے یہی بتایا کہ مظفر پور میں نصر اللہ کے کسی عزیز کی شادی تھی اور وہ وہاں جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ ان لوگوں نے ایک اور انکشاف بھی کیا اور وہ یہ کہ نصر اللہ کا کوئی بیٹا نہیں تھا اور نہ ہی کوئی لڑکا گاؤں سے اس کے ساتھ گیا ہے۔ یہ بہت الجھانے والی بات تھی۔ اگر نصر اللہ کا کوئی بیٹا نہیں تھا تو اغوا ہونے والا لڑکا کون تھا۔ مجھے یاد آیا کہ تھانے میں پوچھ گچھ کے دوران حسن دین بھی لڑکے کے ذکر پر چونکا تھا۔ اس نے بڑا گول مول سا جواب دے کر اس ذکر سے جان چھڑا لی تھی۔ مجھے یہ بھی احساس ہو رہا تھا کہ حسن دین سبزی فروش ان سب لوگوں سے زیادہ جانتا ہے جو اس وقت میرے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں......

رات ہم نے ''میلی'' ہی میں گزارنے کا پروگرام بنایا۔ مکھیا نے اپنی حویلی کا ایک حصہ ہمارے لیے خالی کر دیا۔ شام کے کھانے میں پورے گاؤں نے پورا پورا زور لگا دیا۔ ہم کل چھ آدمی تھے لیکن نظر اٹھا کر دیکھا تو سامنے تیس آدمیوں کا کھانا سجا ہوا تھا۔ مرغی مچھلی سے لے کر

تیتر بٹیر تک اور فروٹ سے لے کر شراب کباب تک سب کچھ دستر خوان پر حاضر تھا اور ابھی مزید لایا جا رہا تھا۔ لگتا تھا علاقے میں روپ رائے سے بڑی محبت کی جاتی ہے۔ اسے آپ ''زبردستی کی محبت'' بھی کہہ سکتے ہیں۔ مجھے بلال شاہ کی بدنصیبی پر افسوس ہونے لگا۔ یہ دستر خوان ہوتا اور بلال شاہ ہوتا تو کوئی نہ کوئی ریکارڈ ضرور ٹوٹ جاتا۔ کھا پی کر روپ رائے تو مقامی لوگوں کی شکایات سننے بیٹھ گیا اور میں چہل قدمی کے لیے کھیتوں کی طرف نکل گیا۔ ایک مقامی کانسٹیبل کے علاوہ سندھو بھی میرے ساتھ تھا۔ راستے میں مَیں نے سندھو سے سرگوشی کی۔

''یار! کسی طرح حسن دین سے ایک ملاقات ہونی چاہیے لیکن ایسے ہو کہ کسی کو پتہ نہ چلے۔''

سندھو کی آنکھیں چمک اٹھیں بولا۔ ''ابھی راستے میں اس کانسٹیبل نے مجھے حسن دین کا گھر دکھایا تھا۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو میں رات کسی وقت حسن دین کو آپ کا پیغام پہنچا دیتا ہوں۔''

''کیسا پیغام؟''

''یہی کہ وہ کسی وقت خاموشی سے ناری پور تھانے پہنچ جائے۔''

''نہیں...... یہ مناسب نہیں۔ وہ پہلے ہی بہت ڈرا ہوا ہے۔''

سندھو نے میری ہاں میں ہاں ملائی۔ اچانک میرے ذہن میں ایک بات آئی۔ میں نے کہا۔ ''کیوں نہ ہم ابھی اس سے ملیں...... تم کسی بہانے اس کانسٹیبل کو واپس تھانے کوئی چیز لانے بھیج دو۔ اس کے واپس آنے تک ہم حسن دین کے گھر گھس چکے ہوں گے۔''

میری بات سندھو کی سمجھ میں آ گئی۔ وہ کچھ دیر خاموشی سے چلتا رہا...... پھر کراہ کر زمین پر بیٹھ گیا۔ کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''کچھ نہیں نواز صاحب! یہ جوتی بہت کاٹ رہی ہے۔''

میں نے مسکرا کر کہا۔ ''نئی ہے ناں۔ جوتی اور بیوی میں یہی فرق ہوتا ہے۔ جوتی نئی کاٹتی ہے اور بیوی پرانی۔''

''آپ مذاق کر رہے ہیں نواز صاحب! مجھ سے چلا نہیں جا رہا۔''

میں نے سنجیدگی سے اس کا پاؤں ٹٹولا۔ پھر کانسٹیبل سے کہا۔ ''سنجے! جاؤ تھانے سے کوئی چپل لے آؤ اس کے لیے، ہم یہیں کھڑے ہیں۔ ذرا جلدی آنا۔''

کانسٹیبل نے اٹین شین ہو کر ''جی اچھا'' کہا اور تیزی سے واپس مڑا۔ پیچھے سے سندھو

نے ہانک لگائی۔ ”بھائی صاحب! یہ جوتی تو لیتے جاؤ۔“ کانسٹیبل واپس آیا اور جوتی لے کر اندھیرے میں روپوش ہو گیا۔ اس کے جاتے ہی میں اور سندھو اٹھے اور تیز قدموں سے آبادی کی طرف چل دیے۔ حسن دین کا گھر گاؤں کی ایک بیرونی گلی میں تھا۔ گھر کیا تھا کچا پکا جھونپڑا تھا۔ دروازے پر ایک مریل سی گدھی بندھی ہوئی تھی۔ بیرونی دیوار خستہ حالت میں تھی۔ میں نے گلی میں آگے پیچھے دیکھا۔ کوئی تیسرا شخص دکھائی نہیں دیا۔ موقع مناسب تھا۔ میں نے دروازے پر دستک دی۔ چند لمحے بعد ایک ڈری ہوئی مردانہ آواز آئی۔ ”کون ہے؟“ میں پہچان گیا یہ حسن دین ہی تھا۔ میں نے نرمی سے کہا۔ ”حسن دین میں ہوں انسپکٹر نواز خاں! دروازہ کھولو۔“ دوسری طرف حسن دین کی سٹی گم ہو چکی تھی۔ وہ چند لمحے کچھ بھی نہ بول سکا۔ مجھے خدشہ لاحق ہوا کہ وہ کسی طرف کی دیوار پھاند کر بھاگ ہی نہ جائے۔ بہر حال یہ نوبت نہیں آئی۔ آہٹ ہوئی اور حسن دین نے کپکپاتے ہاتھوں سے کنڈی کھول دی۔ میں اور سندھو ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اندر گھس گئے۔ سندھو نے کنڈی دوبارہ چڑھا دی۔ صحن میں ایک طرف دکان کی بچی کھچی سبزی ٹوکروں میں پڑی تھی۔ اندر ایک کمرے میں مدھم روشنی ہو رہی تھی۔ یہاں حسن دین کی بیوی مرغی کی طرح اپنے دو بچوں کو پروں میں سمیٹے بیٹھی تھی۔ نہ جانے ہمارے اس طرح اندر گھس آنے سے اس نیک بخت کے دل پر کیا بیت رہی تھی۔ غالباً اس چار دیواری میں اگر کوئی قیمتی چیز تھی تو اس کی جوانی ہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ حسن دین اتنا خوفزدہ نظر آ رہا تھا۔ میں نے محبت سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اپنے ساتھ چلاتا ہوا دوسرے کمرے میں لے آیا۔ دس پندرہ منٹ کی سخت کوشش کے بعد میں اس کا بے پناہ خوف کم کرنے میں کامیاب ہوا۔ دھیرے دھیرے میں نے اسے اعتماد میں لے کر زبان کھولنے پر آمادہ کر لیا۔ حسن دین سے میرا سب سے اہم سوال یہی تھا کہ وہ لڑکا کون تھا جو نصر اللہ کے ساتھ گیا اور نامعلوم افراد کے ہاتھوں اغوا ہوا۔

جواب میں حسن دین بولا۔ ”آپ کو غلط فہمی ہو رہی ہے جناب! نصر اللہ کے ساتھ کوئی لڑکا نہیں تھا اور نہ ہی وہ یہاں سے کسی لڑکے کو لے کر گیا تھا۔“

میں نے سندھو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ شخص اس بس میں موجود تھا۔ وہ لڑکا اس کے سامنے اغوا ہوا تھا۔“

حسن دین نے تھوک نگل کر ادھر ادھر دیکھا، جیسے راز فاش ہونے سے ڈر رہا ہو پھر پھنسی پھنسی آواز میں بولا۔ ”وہ لڑکا نہیں تھا جناب...... وہ نصر اللہ کی بیٹی ثریا تھی۔“

یہ انکشاف ہم دونوں کے لیے دھماکہ خیز تھا۔ میں حیرت سے حسن دین کی طرف دیکھنے

لگا۔ مجھے فوراً کوچوان چھوٹو رام کی یہ بات یاد آئی کہ وہ عجیب سا لڑکا تھا۔ سمٹا سمٹایا اور سہما ہوا۔ سندھو نے بھی بتایا تھا کہ اغوا کے وقت لڑکے پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا تھا اور وہ معمولی سی چیخ و پکار بھی نہ کر سکا تھا...... تو اس کا مطلب یہ تھا کہ نصر اللہ اپنی بیٹی کو لڑکے کے روپ میں یہاں سے نکال کر لے جا رہا تھا لیکن کیوں...... کیوں وہ اتنا مجبور ہو گیا تھا کہ گھر بار چھوڑ کر، بیٹی کا سر منڈوا کر اور اسے مردانہ لباس میں چھپا کر یہاں سے بھاگ رہا تھا۔ کیا یہ ہندو مسلم فساد کا شاخسانہ تھا یا کوئی اور بات تھی۔ اب یہ بات بھی میری سمجھ میں آ رہی تھی کہ واردات کے وقت نصر اللہ نے غنڈوں کی اتنی شدید مزاحمت کیوں کی تھی اور انہیں روکنے کی کوشش میں جان کیوں ہارا تھا۔ وہ غنڈے اس کی عزت کو اس کے سامنے اٹھا کر لے جا رہے تھے۔ اپنی بچی کو درندوں کے قبضے سے محفوظ رکھنے کے لیے اس نے جان کی بازی لگا دی تھی۔ بسترِ مرگ پر نصر اللہ کی فریادی نظریں مجھے یاد آئیں اور ذہن میں انگارے سے بھرنے لگے۔

میں نے حسن دین سے کہا۔ ”حسن! اگر تمہاری اطلاع کو درست مان لیا جائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ نصر اللہ نے ایسا کیوں کیا۔ وہ کس کے خوف سے گاؤں چھوڑ کر بھاگا تھا؟“

حسن دین کی آنکھوں میں ایک بار پھر خوف کے تاریک سائے رقص کرنے لگے۔ وہ بولا۔ ”میں کچھ نہیں جانتا صاحب جی! جو مجھے معلوم تھا آپ کو بتا دیا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”یہ بات تو تم نے پہلے بھی کہی تھی اور اس کے بعد تم نے ثریا والا انکشاف کیا ہے...... دیکھو حسن...... یہ بات اپنے ذہن میں بٹھا لو کہ میں تمہیں دکھ دینے نہیں، تمہارا دکھ بانٹنے آیا ہوں جو کچھ تم مجھے بتاؤ گے میرے سینے میں محفوظ رہے گا۔“ حسن دین کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔ میں نے اس سے نگاہ ملاتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا نصر اللہ ہندوؤں کے ڈر سے بھاگا تھا؟“

میرے سوال نے حسن دین کے ضبط کا بند توڑ دیا۔ اس کی آنکھوں سے لگاتار آنسو بہنے لگے۔ ”ہاں صاحب جی! وہ انہی ظالموں کے خوف سے بھاگا تھا...... ان لوگوں نے ہمارے گھر جلا دیے۔ ہمارے مردوں کو برچھیوں سے چھیدا اور ہماری عورتوں کو اٹھا کر لے گئے۔ کون سا ظلم ہے جو ان لوگوں نے ہم پر نہیں توڑا۔ ہم تو شاید پیدا ہی دکھ اٹھانے کے لیے ہوئے ہیں۔ مشکل سے چند مہینے گزرتے ہیں کہ فساد کی آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ ہر دفعہ ہماری بربادی کا کوئی نہ کوئی بہانہ بن جاتا ہے۔“ حسن دین ہچکیوں سے رونے لگا۔

میں نے اسے دلاسہ دیتے ہوئے پوچھا۔ ”اس دفعہ کیا بات ہوئی تھی؟“

”کچھ معلوم نہیں جی! پچھلے سات آٹھ ماہ سے تو بالکل سکون تھا۔ ہم خوش تھے کہ شاید

زندگی آسان ہو جائے گی۔ مگر ایک دم پھر آگ بھڑک اٹھی۔ سنا ہے سلطان پور گاؤں میں ہندو جاٹوں کے لڑکے نے مسلمان درزی کی بیٹی کو سرِ راہ چھیڑا۔ لڑکی نے گھر جا کر شکایت کی۔ بس اسی سے بات بڑھ گئی۔ رات کو آٹھ دس غنڈے آئے اور درزی کی بیٹی کو اس کی ایک سہیلی سمیت اٹھا کر لے گئے۔ یہ خبر گاؤں میں پھیلی تو مسلمان لاٹھیاں کلہاڑیاں لے کر نکل آئے اور انہوں نے جاٹوں کے دو گھروں کو آگ لگا دی۔ اس آگ کی چنگاریاں پورے ناری پور میں پھیل گئیں اور جگہ جگہ فساد بھڑک اٹھا۔ مسلمانوں کی اکثریت صرف تین چار دیہات میں ہے باقی ہر جگہ ہندو زیادہ ہیں۔ وہ غصے میں بھر کر مسلمانوں پر جھپٹ پڑے۔ ایک رات میں کم از کم بیس آدمی مارے گئے جبکہ زخمیوں کا کوئی حساب ہی نہیں۔ مسلمانوں کے سو سے زائد گھر نذرِ آتش کر دیے گئے جبکہ کئی لڑکیاں اٹھالی گئیں۔ تین لڑکیاں تو صرف ''میلی'' سے ہی اٹھائی گئی تھیں۔ ان میں دو کی برہنہ لاشیں اگلے روز شمشان گھاٹ سے ملی تھیں۔ اس فساد میں گاؤں کے مکھیا کا بیٹا راجن بھی زخمی ہوا۔ اس کی ٹانگوں کے درمیان خنجر لگا تھا اور جسم کا نازک حصہ کٹ گیا تھا۔ فساد کے بعد نصر اللہ کے ایک ہندو پڑوسی نے یہ بات پھیلا دی کہ راجن کو چھرا مارنے والا نصر اللہ تھا۔ دراصل اس شخص کا کھیت نصر اللہ کے کھیت کے ساتھ تھا۔ ان میں دیر سے عداوت چلی آ رہی تھی۔ اس شخص نے موقع غنیمت جان کر نصر اللہ کو ایک جھوٹے معاملہ میں الجھا دیا۔ ہندوؤں کو بھڑکانے کے لیے تو بس چنگاری کی ضرورت تھی۔ وہ نصر اللہ کی جان کے درپے ہو گئے۔ گاؤں میں بظاہر امن امان ہو چکا تھا لیکن اندر ہی اندر مکھیا کے غنڈے نصر اللہ کو ٹھکانے لگانے کا پروگرام بنا رہے تھے۔ نصر اللہ ان حالات سے بہت خوفزدہ تھا۔ ایک بیٹی کے سوا اس کا اس دنیا میں اور کوئی نہیں تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ یہ بیٹی بھی بلوائیوں کا نشانہ بن جائے۔ خیر خواہ اسے مشورے دے رہے تھے کہ وہ ''میلی'' چھوڑ کر ''سلطان پور'' چلا جائے یا پھر پٹنہ کی طرف نکل جائے۔ ان مشوروں کو مان کر وہ چپکے چپکے جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ گاؤں سے نکلنا تو زیادہ مشکل نہیں تھا لیکن یہ پورا علاقہ فساد زدہ تھا۔ جوان بیٹی کے ساتھ اس علاقے میں سے بخیر و عافیت نکل جانا دشوار تھا۔ نصر اللہ نے بیٹی کے بال منڈوا کر اسے لڑکے کا روپ دیا اور راتوں رات گاؤں چھوڑ کر چلا گیا۔ اس کا ارادہ مظفر پور جانے کا تھا۔ وہ گھر کو تالا لگا کر گیا تھا اور اس امید پر گیا تھا کہ حالات ٹھیک ہو گئے تو واپس لوٹ آئے گا لیکن اس کی قسمت میں واپس آنا نہیں تھا۔ حسن دین نے گلوگیر آواز میں کہا۔ ''میں قسم کھا سکتا ہوں جناب عالی...... نصر اللہ کا قتل مکھیا نے کیا ہے یا بدری دادا نے۔''

میں نے پوچھا۔ ''یہ بدری دادا کون ہے؟''

حسن دین حیران نظر آنے لگا جیسے سمجھ نہ پا رہا ہو کہ ایک پولیس انسپکٹر ہونے کے باوجود میں بدری دادا سے کیونکر ناواقف ہوں۔ میں نے اس کی حیرت دور کرنے کے لیے کہا۔

''حسن دین! میں کل ہی پٹنہ سے آیا ہوں۔ مجھے یہاں کے سرکردہ لوگوں کے بارے زیادہ معلوم نہیں۔''

حسن دین نے کہا۔ ''جناب! دادا بدری پرشاد وہ شخص ہے جو اس علاقے کے مسلمانوں کو بلا کی طرح چمٹا ہوا ہے۔ زندہ آدمی کو الٹا لٹکا کر قصابوں سے اس کی چمڑی اتروا لینا بدری کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ اس کے غنڈے پورے علاقے میں دندناتے پھرتے ہیں اور کسی کا جان و مال ان سے محفوظ نہیں۔ مسلمان تو مسلمان نچلی ذات کے ہندو بھی ان کے ظلم سے پناہ مانگتے ہیں۔ یہ تازہ فساد جو یہاں ہوا ہے اس میں سو فیصد بدری پرشاد کا ہاتھ ہے۔ وہ جب اور جہاں چاہے آگ لگوا سکتا ہے۔''

اچانک حسن دین کو احساس ہوا کہ وہ جذبات کی رو میں مجھے ضرورت سے زیادہ بتا گیا ہے اس کے مدقوق چہرے پر تاریک سائے لہرا گئے۔ اس نے زمین پر بیٹھ کر میرے پاؤں پکڑ لیے۔

''تھانیدار صاحب! آپ کو خدا رسول کا واسطہ۔ یہ باتیں بس اپنے تک ہی رکھنا ورنہ میرے اور میرے بچوں کا خون آپ کے سر ہوگا۔''

میں نے اسے تسلی تشفی دی اور سندھو نے اس کی بغلوں میں ہاتھ دے کر بڑی مشکل سے اسے دوبارہ کرسی پر بٹھایا۔ میں نے اس سے بدری پرشاد کا پتہ پوچھا۔ حسن دین نے اس کے قصبے کا نام رنگی بتایا اور بتایا کہ وہ فساد کے دوران ہی پٹنہ چلا گیا تھا تاکہ اس پر کشت و خون کا الزام نہ آ سکے اور اب تک پٹنہ میں ہی ہے۔ حسن دین بہت کام کی باتیں بتا رہا تھا لیکن میں اس کے پاس زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ وجہ یہی تھی کہ ہم دونوں کانسٹیبل کو چکر دے کر یہاں آئے تھے اور یقینی بات تھی کہ کانسٹیبل ہمیں ہر جگہ ڈھونڈتا پھر رہا ہوگا۔ اگر بات انسپکٹر روپ رائے تک پہنچ جاتی تو ہماری باقاعدہ تلاش شروع ہو سکتی تھی۔ لہٰذا میں نے حسن دین سے کہا کہ وہ دو تین روز بعد موقع نکال کر چپکے سے پٹنہ آئے وہاں اطمینان سے بات کریں گے۔

ہم جس خاموشی سے حسن دین کے گھر میں گھسے تھے۔ اسی خاموشی سے باہر نکل آئے۔ تھانے کے راستے ہی میں کانسٹیبل سے ملاقات ہو گئی وہ سندھو کے لیے چپل اٹھائے نہ جانے کب سے چکراتا پھر رہا تھا اور اب ہماری گمشدگی کی اطلاع روپ رائے کو دینے جا رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر اس نے اطمینان کی طویل سانس لی۔ دراصل فسادات کی وجہ سے یہ علاقہ بہت

غیر محفوظ ہو چکا تھا۔ اگر ہم کچھ دیر اور نہ ملتے تو یقیناً گاؤں میں کھلبلی مچ جاتی۔

☆======☆======☆

رات ''میلی'' میں گزارنے کے بعد اگلے روز علی الصبح ہم واپس ناری پور روانہ ہو گئے۔ ہم سہ پہر کے وقت ناری پور پہنچ سکے۔ بلال شاہ ہماری وجہ سے بے حد پریشان تھا۔ اس کی پریشانی کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا تھا کہ سہ پہر کے ڈھائی بجے تھے اور وہ جاگ رہا تھا۔ یہ وقت بلال شاہ کے قیلولے کا ہوتا تھا۔ دوپہر کو لمبی لسی پی کر لمبی تان کر سونا اس کے لیے اتنا ہی ضروری تھا جتنا کوئی خیال کر سکتا تھا۔ دوپہر کو وہ جہاں کہیں اور جس حال میں بھی ہوتا تھا آناً فاناً سونے کے لیے تیار ہو جاتا تھا۔ دو تین مرتبہ امرتسر سے جالندھر آتے ہوئے اس نے بس میں قیلولہ کر لیا تھا اور چندی گڑھ پہنچ گیا تھا۔ بلال شاہ کو جاگتے دیکھ کر مجھے حیرانی ہوئی۔ میں نے حال احوال پوچھا۔ رات بھر انتظار کرنے والی بیوی کی طرح پہلے تو اس نے جلی کٹی سنائیں پھر غصہ تھوک دیا۔ اس کے رویئے سے مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ مجھے بتانے کے لیے اس کے پاس کوئی اہم اطلاع ہے اور اس کے قیلولہ نہ کرنے کی ایک وجہ یہ اطلاع بھی ہے۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ بلال شاہ مجھے علیحدہ کمرے میں لے آیا اور بولا۔

''خان صاحب! جب سے مجھے کم سنائی دینا شروع ہوا ہے تھوڑا سا فائدہ بھی ہو گیا ہے۔ باتیں کرنے والے میری طرف سے بےفکر رہتے ہیں اور کئی باتیں ایسی بھی میرے کانوں تک پہنچ جاتی ہیں جو اس سے پہلے نہیں پہنچتی تھیں۔''

میں نے کہا۔ ''تمہیں کم سنائی دینے لگا ہے، مگر اس وقت تو تم بڑے آرام سے میری باتیں سن رہے ہو۔''

وہ شرارت سے مسکرانے لگا۔ ''بس جی وقت وقت کی بات ہوتی ہے۔ خیر چھوڑیئے ان باتوں کو۔ کل رات میں اسی کمرے میں لیٹا ہوا تھا۔ ساتھ والے کمرے میں صبح کی ڈیوٹی والا سب انسپکٹر اور اس کے ساتھی باتیں کر رہے تھے۔ سارے ہی ہندو تھے۔ ان کی باتوں سے مجھے اندازہ ہوا ہے کہ ناری پور کی پولیس غیر جانبدار نہیں ہے۔ عملے میں زیادہ تر ہندو ہیں اور یہ اندر خانے ہندو بلوائیوں سے ملے ہوئے ہیں۔ رات ہندو اے ایس آئی نے تھانے کی دو سرکاری بندوقیں اپنے من پسند غنڈوں کو دی ہیں۔ کاغذوں میں یہ بتایا گیا ہے کہ بندوقیں خراب تھیں اور مرمت کے لیے بھیجی ہوئی ہیں۔ رات عملے کی باتوں سے مجھے اندازہ ہوا ہے کہ علاقے کا امن و امان وقتی ہے اور ہو سکتا ہے کہ چند دنوں یا ہفتوں بعد پھر فساد پھوٹ پڑے۔''

بلال شاہ کی اطلاعات واقعی بہت اہم تھیں۔ مجھے پہلے ہی شبہ ہو رہا تھا کہ روپ رائے جیسا تھانیدار انصاف سے کام نہیں لے سکتا۔ وہ اوپر اوپر سے بھائی چارے کی باتیں کرتا تھا لیکن اندر سے مسلمانوں کو رگڑا دینے میں مصروف تھا۔ وہ بےچارے پہلے ہی پسے ہوئے تھے اب اور بے دست و پا ہو گئے تھے۔ وہ تھانہ جس نے ان کی حفاظت کرنا تھی ان کے خلاف بلوائیوں کو ہتھیار دے رہا تھا۔ یہ ظلم معمولی نہیں تھا۔

اسی روز میں اپنے عملے کے ساتھ ناری پور سے پٹنہ واپس آ گیا۔ سارا دن سفر کرنے کے بعد ہم رات ساڑھے گیارہ بجے تھانے پہنچے۔ یہاں ابھی تک ''مغوی لڑکے'' یعنی ثریا کا کوئی کھوج نہیں ملا تھا۔ میرے قائم مقام سب انسپکٹر نے کئی جگہ چھاپے مارے تھے لیکن ناکام رہا تھا۔ میں نے صبح ہوتے ہی بدری دادا کی تلاش شروع کرا دی۔ حسن دین کے مطابق یہ شخص اس وقت پٹنہ میں تھا اور پٹنہ کوئی اتنا بڑا بھی نہیں تھا کہ آدمی سمندر میں قطرے کی طرح گم ہو جائے۔ کوشش کر کے بدری جیسے شخص کا کھوج لگایا جا سکتا تھا۔ میں نے چاروں طرف اپنے مخبر دوڑائے۔ دوسرے تھانوں کے مخبروں سے بھی مدد لی اور بدری کی تلاش شروع کر دی۔ جلد ہی ایک ایسے سیٹھ کا کھوج مل گیا جس کے پاس کبھی کبھی بدری قیام کیا کرتا تھا۔ میں نے ایک ہوشیار اے ایس آئی کے ذریعے اس سیٹھ کی اچھی طرح ٹوہ لی لیکن کوئی ایسا ثبوت نہیں ملا جس سے پتہ چلتا کہ بدری اس دفعہ بھی سیٹھ کے پاس ٹھہرا ہوا ہے۔ اسی دوران ''میلی'' سے حسن دین بھی چھپتا چھپاتا پٹنہ میرے پاس پہنچ گیا۔ میں نے اسے مہمان کی طرح عزت دی اور ہر طرح اس کی دل جوئی کی۔ رات کو تنہائی میں میں نے اس سے دیر تک بات چیت کی۔ حسن دین نے کہا۔

''جناب! میں پرسوں سلطان پور گیا تھا۔ اس لڑکے کی ضمانت ہو گئی ہے۔ جس نے درزی کی لڑکی کو اٹھایا تھا۔''

یاد رہے کہ سلطان پور وہی گاؤں ہے جہاں سے فساد شروع ہوا تھا۔ میں نے حسن دین سے پوچھا۔ ''تم جاٹوں کے لڑکے کی بات کر رہے ہو ناں؟''

''جی ہاں'' حسن دین نے جواب دیا۔ ''فساد کی جڑ تو یہی لڑکا ہے۔ پہلے اس نے لڑکی کو چھیڑا پھر ساتھی لے کر آیا اور ایک سہیلی سمیت اسے اٹھا کر لے گیا۔ دونوں لڑکیاں پورے دو روز ان شیطانوں کے پاس رہیں۔ اب ایک مہینہ بھی پورا نہیں ہوا کہ وہ ضمانت پر رہا ہو کر گھر آ گیا۔ پورے سلطان پور میں گردن اکڑا کر چلتا پھرتا ہے اور ٹھٹھے کرتا ہے۔ ذرا سوچیں آپ، ان لڑکیوں کے وارثوں پر کیا گزرتی ہو گی۔ ایسی باتوں سے ہی تو فساد شروع ہوتے

ہیں۔“

میں نے پوچھا۔ ”تمہارا خیال ہے کہ پھر گڑبڑ ہو سکتی ہے؟“

اس کی آنکھوں میں خوف لہرا گیا۔ ”بالکل جناب! یہی حالت رہی تو کسی وقت پھر خون خرابہ ہو جائے گا۔ آگ بجھی نہیں ہے۔ بس سمجھیں کہ ٹھنڈی پڑی ہوئی ہے......“

میں نے پوچھا۔ ”کیا نام ہے اس ہندو لڑکے کا؟“

”گوپال جی! بڑا خرانٹ لڑکا ہے۔ تھوڑا بہت پڑھا لکھا بھی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”ایک کام کرو حسن دین! سلطان پور چلے جاؤ اور اس گوپال پر نظر رکھو۔ میرا مطلب ہے کہ ہمیں پتہ چلتا رہے وہ کہاں آتا جاتا ہے کیا ایسا کر سکتے ہو؟“

وہ بولا۔ ”سلطان پور میں میرا بہنوئی رہتا ہے۔ کھیتی باڑی کرتا ہے۔ آج کل اس نے سبزیاں لگائی ہوئی ہیں۔ میں دوسرے تیسرے روز جاتا ہوں اور خچر پر سبزی لاد کر لے آتا ہوں۔ کبھی دل چاہے تو رات اس کے گھر بھی رہ لیتا ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”یہ تو بڑی مناسب بات ہے۔ تم یہ کام آسانی سے کر سکتے ہو۔ سلطان پور چلے جاؤ اور کسی بہانے چند روز کے لیے بہنوئی کے پاس ہی ٹک رہو۔“

حسن دین خوفزدہ نظر آتا تھا مگر میری ہلاشیری پر وہ آمادہ ہو گیا۔ میں نے اگلے روز صبح سویرے اسے واپس ناری پور بھیج دیا۔ احتیاط کے طور پر میں نے ایک ہوشیار کانسٹیبل کو دیہاتی لباس میں اس کے ساتھ کر دیا۔

☆======☆======☆

یہ قریباً چار روز بعد کی بات ہے۔ شام کا وقت تھا۔ بادل چھائے تھے اور دوپہر سے بونداباندی ہو رہی تھی۔ میں تھانے میں ایک سائل کی شکایت سن رہا تھا کہ میرا کانسٹیبل ہانپتا ہوا اندر داخل ہوا۔ یہ وہی کانسٹیبل تھا جسے میں نے حسن دین کے ساتھ سلطان پور بھیج رکھا تھا۔ میں نے سائل کو باہر بھیج کر کانسٹیبل عطا محمد کو پاس بٹھایا۔ وہ بولا۔

”جناب! میں اور حسن دین گوپال کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں پہنچے ہیں۔ وہ آج صبح سویرے سلطان پور سے چلا۔ کوئی چار میل پیدل چل کر پکی سڑک تک پہنچا اور وہاں سے لاری میں بیٹھ کر پٹنہ آیا ہے۔ ہم سلطان پور سے اس کے ساتھ لگے رہے ہیں۔ تھوڑی دیر پہلے وہ لاری اڈے سے پیدل چل کر کرشن چوک پہنچا ہے اور اب وہاں ایک جوا خانے میں موجود ہے۔“ کانسٹیبل نے یہ سب کچھ ایک ہی سانس میں بتا دیا۔

میں نے اس سے پوچھا۔ ”حسن دین کہاں ہے؟“

کانسٹیبل نے کہا۔ ”میں اسے کرشن چوک ہی چھوڑ آیا ہوں۔“

میں نے فوراً کپڑے بدلے اور سادہ لباس میں کانسٹیبل کے ساتھ کرشن چوک کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہ شہر کا ایک بدنام علاقہ تھا۔ جوا خانے، شراب خانے اور رنڈیوں کے اڈے کثرت سے تھے۔ ہم نے جیپ کرشن چوک سے کچھ فاصلے پر چھوڑ دی اور پیدل ہی چل پڑے۔ چوک میں زبردست گہما گہمی تھی۔ حلوائیوں، پان فروشوں اور کبابیوں کی اَن گنت دکانیں تھیں۔ کانسٹیبل مجھے ایک تنگ بازار میں لے گیا۔ میں نے سر پر ایک بڑا رومال سا ڈال رکھا تھا اور اس کوشش میں تھا کہ میرا چہرہ کم سے کم نظر آئے۔ جرائم پیشہ لوگوں کے علاقے میں پولیس والے کا پہچانا جانا مشکل نہیں ہوتا۔ ہم ایک ہوٹل کی سیڑھیاں چڑھ کر ہال کمرے میں داخل ہو گئے اور کونے کی ایک میز پر بیٹھ گئے۔ اس میز پر حسن دین پہلے سے موجود تھا۔ وہ کسی کبوتری کی طرح سہا ہوا تھا۔ اس ماحول میں حسن دین جیسا شخص سہنے کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتا تھا۔ چاروں طرف شور و غل برپا تھا۔ یوں لگتا تھا شہر بھر کے لفنگے اور اوباش یہاں جمع ہو گئے ہیں۔ گراموفون پر زور شور سے ہندی اور بنگالی گانے بج رہے تھے۔ ان گانوں کی آواز میں ہر شخص چیخ چیخ کر باتیں کر رہا تھا۔ فضا میں دھواں تھا اور شراب کی بو پھیلی ہوئی تھی۔

کانسٹیبل عطا محمد نے ایک میز پر بیٹھے سانولے سلونے نوجوان کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ یہی گوپال ہے۔ میں نے غور سے اس غنڈے کو دیکھا۔ وہ شلوار قمیض میں تھا۔ جسم مضبوط اور صورت سے خباثت ٹپکتی تھی۔ اسی بدبخت نے درزی کی بیٹی کو اٹھایا تھا اور دو دن اس کی عزت سے کھیلتا رہا تھا۔ یہ کوئی چھوٹا جرم نہیں تھا لیکن اگر تیس آدمیوں کے قتل کو ذہن میں رکھا جاتا تو یہ جرم اور بھی سنگین اور ناقابل معافی ہو جاتا تھا۔ گوپال ہنس ہنس کر اپنے ساتھیوں سے باتیں کر رہا تھا۔ پتہ نہیں وہ کیا باتیں کر رہے تھے لیکن مجھے یوں لگا کہ وہ اسی مجبور و بے کس لڑکی کی باتیں کر رہے ہیں۔ اس کے اغوا اس کی بے حرمتی اور بدحالی کی باتیں۔ میری آنکھوں میں انگارے سے بھرنے لگے۔

ہم نے سینکڑوں مرتبہ عورتوں کے ساتھ ہونے والی زیادتی اور درندگی کے واقعات سنے ہیں۔ کچھ لوگ ان واقعات کو سن کر دل میں درد محسوس کرتے ہیں اور بہت سے لوگ صرف اپنے چہرے سے افسوس کا اظہار کرتے ہیں۔ اس دکھ کی گہرائی تک کوئی نہیں پہنچتا جو زیادتی کا شکار ہونے والی عورت کے حصے میں آتا ہے۔ ایک پولیس انسپکٹر کے طور پر میں سینکڑوں ایسی عورتوں سے ملا ہوں اور ان کے جذبات کا اندازہ لگایا ہے۔ اگر دیکھنے والی آنکھ ہو تو وہ ایسی عورت کو دیکھ کر خون کے آنسو رونے لگتی ہے۔ اگر کبھی آپ کے لیے لڑائی بھڑائی کا موقع آیا

ہو اور آپ سے طاقتور دشمن نے آپ کو نیچے دبا لیا ہو اور کسی صورت بھی آپ کو نیچے سے نکلنے نہ دے رہا ہو تو اس وقت آپ کی کیا حالت ہوتی ہے۔ ذرا گہرائی میں جا کر اس گھٹن اور تڑپن کو اپنے خیال میں لائیں۔ میں اس حالت کا تصور کرتا ہوں تو زیادتی کا شکار ہونے والی عورت کی بیچارگی آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے، اور دل رونے لگتا ہے...... بات سے بات نکل آئی میں ذکر کر رہا تھا گوپال کا جو نشے میں مست خوش گپیوں میں مصروف تھا۔ گپیں لگاتے لگاتے اچانک گوپال چونک گیا۔ وہ اندرونی دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اسی دروازے سے وہ راستہ نکلتا تھا جو نیچے تہہ خانے میں جوئے کی بیٹھک تک جاتا تھا۔ چند لمحے بعد اس دروازے سے ایک لحیم شحیم شخص برآمد ہوا۔ اس نے ماتھے پر بڑا سا تلک لگا رکھا تھا۔ دائیں کان میں سونے کی مرکی تھی۔ وہ سفید براق دھوتی کرتے میں ملبوس تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور غنڈہ نما شخص تھا۔ اس غنڈے کو میں فوراً پہچان گیا۔ یہ کرشن چوک ہی کا رہنے والا تھا اور میرے اندازے کے مطابق جوا خانے کا مالک بھی یہی تھا، لیکن سونے کی مرکی والا لحیم شحیم شخص کون تھا۔ یہ بات فوری طور پر میری سمجھ میں نہیں آئی۔ سب حاضرین غور سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے اور کئی ایک اس کے احترام میں کھڑے بھی ہو گئے تھے۔ کھڑا ہونے والوں میں گوپال اور اس کے ساتھی بھی شامل تھے۔ مرکی والا شاہانہ چال چلتا اوپر جانے والی سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ گوپال کو دیکھ کر وہ ٹھٹکا۔ گوپال نے جلدی سے آگے بڑھ کر نمستے کیا۔ مرکی والا اس سے باتیں کرنے لگا۔ پھر اسے ساتھ ہی لے کر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ دو مسلح غنڈے باڈی گارڈز کی طرح ان کے پیچھے پیچھے تھے۔ یہ سب لوگ چلے گئے تو میں نے قریبی میز پر بیٹھے ہوئے شخص سے پوچھا۔

"یار یہ سفید دھوتی قمیض والا کون تھا؟"

وہ غنڈوں کے خاص لہجے میں بولا۔ "کوئی باہر کا بندا ہے پیارے...... بدری دادا کہتے ہیں اسے۔"

میں حیران رہ گیا جس بدری دادا کی تلاش میں ہم نے پورا پٹنہ کھنگال ڈالا تھا وہ اس غیر معروف جوئے خانے میں چھپا بیٹھا تھا۔ اس کا کھوج بھی کیسے عجیب طریقے سے لگا تھا۔ ہم گوپال کا تعاقب کر رہے تھے اور پہنچ گئے بدری دادا تک۔ یہ ایک نہایت اہم کامیابی تھی۔ گوپال وہ لڑکا تھا جس کی وجہ سے ناری پور کا ہندو مسلم فساد شروع ہوا تھا اور گوپال کا تعلق بدری پرشاد سے تھا۔ اس سے یہ مطلب بھی لیا جا سکتا تھا کہ وہ ہندو مسلم فساد بدری پرشاد نے ہی شروع کرایا ہو۔ اگر یہ کام بدری پرشاد یعنی بدری دادا کا تھا تو اس سے وہ کیا مقصد حاصل

کرنا چاہتا تھا؟ بہت سے سوال میرے ذہن میں کلبلا رہے تھے اور ان میں سب سے اہم سوال یہ تھا کہ کیا حسن دین کا یہ اندیشہ درست ہے کہ نصر اللہ کے قتل اور ثریا کے اغوا کا ذمے دار یہی بدری دادا ہے۔ میں نے اس میز پر کانسٹیبل اور حسن دین کے ساتھ بیٹھ کر دو سگریٹ پھونکے اور بدری دادا سے ملنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ فیصلہ بالکل اچانک تھا اور میرے دونوں ساتھیوں میں سے کسی کو میری نیت کا علم نہیں تھا۔ میں نے کانسٹیبل سے کہا "تم دونوں یہیں بیٹھو میں ابھی کچھ دیر میں آتا ہوں۔"

سیڑھیاں چڑھ کر میں بالائی منزل پر پہنچا۔ میں نے بدری دادا اور اس کے ساتھیوں کو ایک نیم تاریک راہداری میں مڑتے دیکھا تھا۔ میں نے بھی اس راہداری میں قدم رکھے اور دائیں بائیں دیکھتا آگے بڑھنے لگا۔ دونوں طرف کمروں کے دروازے تھے۔ کسی کسی دروازے میں شیشہ بھی لگا ہوا تھا۔ کسی کمرے سے کوئی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ دفعتاً میرے سامنے ایک کمرے کا دروازہ کھلا اور دو آدمی میرے سامنے آن کھڑے ہوئے۔ ان میں سے ایک بدری دادا کے پیچھے چلنے والا مسلح غنڈہ تھا اور دوسرا گوپال۔ ان دونوں نے کڑی نظروں سے مجھے گھورا پھر رائفل بردار غنڈہ بولا۔ "کیا لینے آئے ہو؟"

اس کے سوال سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس راہداری میں داخلہ ممنوع ہے اور یہاں گھسنے والے کو شک کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ میں نے سنبھل کر کہا۔ "میں بدری دادا سے ملنے آیا ہوں جمشید پور سے۔"

"کس نے بھیجا ہے تمہیں؟" گوپال نے پوچھا۔

"میں خود ملنا چاہتا ہوں۔"

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"نواز خاں۔"

گوپال نے مجھے سرتاپا گھورا۔ میں ایک سڑک چھاپ بابو کے حلیے میں تھا۔ لہجہ بھی ایسا ہی بنا رکھا تھا۔ گوپال نے خشک لہجے میں کہا۔ "سیدھی طرح نام پتہ بتا تیرے جیسے آوارہ گردوں کے لیے وقت نہیں ہوتا بدری دادا کے پاس۔"

میں نے کہا۔ "منہ سنبھال کر بات کر استاد...... اتنا گیا گزرا نہیں ہوں میں۔"

مسلح غنڈے کو اب مجھ پر شبہ ہو چکا تھا۔ اس نے غرا کر کہا۔ "تلاشی دو۔"

"تلاشی کس بات کی؟" میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

گوپال بجلی کی طرح تڑپا اور اس نے گریبان پکڑ کر مجھے دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ اتنی ہی

تیزی کے ساتھ دوسرے شخص کا ہاتھ میری جیکٹ کے نیچے ریوالور پر آیا۔ میں ان دونوں کی پھرتی کا قائل ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھتا۔ میری پھٹی پرانی جیکٹ ریوالور کے بوجھ سے آزاد ہو چکی تھی۔ میں اب بھی حرکت میں نہ آتا تو پھر مار پڑنی یقینی تھی۔ ایسے جوا خانوں میں معمولی معمولی باتوں پر جھگڑا ہونا اور چاقو چل جانے روزمرّہ کی بات ہوتی ہے۔ میں نے پشت دیوار سے لگا کر ایک زوردار ٹانگ مسلح غنڈے کے سینے پر رسید کی۔ وہ دو تین فٹ اچھل کر سیڑھیوں پر گرا اور لکڑی کی ریلنگ توڑتا ہوا بارہ فٹ نیچے میزوں پر جا گرا۔ مجھے لوگوں کے چیخنے اور برتن ٹوٹنے کی زوردار آوازیں سنائی دیں۔ گوپال میرے اس شدید حملے کے سحر میں گرفتار ہو کر ایک سیکنڈ کے لیے اپنی طرف سے غافل ہو گیا۔ یہ غفلت اسے خاصی مہنگی پڑی۔ میں نے اس کا گریبان پکڑا اور اپنی طرف کھینچ کر ایک تباہ کن ٹکر اس کے منہ پر ماری۔ وہ تکلیف کی شدت سے کراہ کر رہ گیا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا اس ٹکر نے اسے دو دانتوں سے محروم کر دیا تھا۔ اس نے اپنا گھٹنا میرے پیٹ میں مارا میں نے جھلا کر اسے بڑی بے رحمی سے دھکا دیا۔ وہ چکنے فرش پر پھسلتا ہوا کھٹاک سے دیوار کے ساتھ ٹکرایا۔ لڑکھڑا کر گرا۔ ایک ہراساں نظر مجھ پر ڈالی اور کسی کو پکارتا ہوا دوسری طرف بھاگا۔ میں راہداری کے درمیان پریشان کھڑا تھا۔ نیچے ہال کمرے سے چیخ و پکار کی آوازیں آ رہی تھیں اور کچھ لوگ سیڑھیوں پر بھاگتے ہوئے آ رہے تھے۔ وہ ایک سیکنڈ کے اندر اندر راہداری تک پہنچنے والے تھے۔ دوسری طرف گوپال کی دھاڑیں سنائی دے رہی تھیں وہ اپنے ساتھیوں کو بلا رہا تھا۔ دفعتاً میرے پہلو میں ایک دروازہ دھماکے سے کھلا اور کسی نے بازو پکڑ کر پھرتی سے مجھے اندر کھینچ لیا۔ اگلے ہی لمحے دروازہ بند ہو چکا تھا۔ میں نے کمرے کی مدھم روشنی میں دیکھا، مجھے اندر لانے والی ایک جواں سال عورت تھی۔ وہ ساڑھی میں تھی۔ ماتھے پر تلک تھا، لمبے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے مجھے اس کی صورت کچھ جانی پہچانی لگی۔ وہ مجھے کھینچتی ہوئی ایک پچھلے کمرے میں لے آئی اور دھکیل کر بیڈ پر بٹھا دیا۔

"کون ہو تم؟" میں نے اپنے ہونٹوں سے خون پونچھتے ہوئے کہا۔

"بڑی جلدی بھول گئے ہو۔" اس نے شکوہ آمیز انداز میں جواب دیا۔

میں نے اس کی صورت پر غور کیا اور ایک دم اس کا نام میرے ذہن میں آ گیا وہ سمیتا تھی۔ قریباً دو برس پہلے سمیتا ایک بلیک میلر غنڈے کے چنگل میں پھنسی ہوئی تھی۔ وہ غنڈہ سمیتا کو تو برباد کر ہی چکا تھا اب اس کے ذریعے اس کی چھوٹی بہن کو بھی قابو کرنا چاہتا تھا۔ میں نے سمیتا کی مدد کی تھی اور بلیک میلر کو آہنی سلاخوں کے پیچھے پہنچایا تھا۔ یہ واقعہ انبالہ میں پیش

آیا تھا۔ آج اتنے عرصے بعد سمیتا کو پٹنہ میں دیکھ کر میں حیران رہ گیا لیکن کچھ زیادہ حیران بھی نہیں ہوا۔ سمیتا ایک ایسی عورت تھی جو اپنی آزاد خیالی کی وجہ سے مشہور تھی اور شہر شہر گھوم کر گھاٹ گھاٹ کا پانی پی چکی تھی...... میرے خیالوں کا سلسلہ راہداری سے آنے والی آوازوں نے توڑا۔ وہاں بھاگ دوڑ ہو رہی تھی گوپال اور بدری دادا کے دوسرے کارندے مجھے تلاش کر رہے تھے۔ میں ان سے ڈر کر اس کمرے میں دبکنا نہیں چاہتا تھا۔ لہٰذا سمیتا کو ایک طرف ہٹا کر دروازے کی طرف بڑھا تو وہ تیزی سے پھر میرے سامنے آ گئی۔

"نہیں نواز صاحب!" وہ فیصلہ کن لہجے میں بولی۔ "میں آپ کو باہر نہیں جانے دوں گی۔ آپ نہیں جانتے آپ نے کن لوگوں سے جھگڑا کیا ہے۔ یہ بہت خطرناک غنڈے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "میرا کام ہی خطرناک غنڈوں کو سیدھا کرنا ہے، تم پیچھے ہٹو۔"

اس نے میرے دونوں کندھے مضبوطی سے تھام لیے۔ "نہیں نواز صاحب! میں آپ کو نہیں جانے دوں گی۔ یہ بدری دادا کے لوگ ہیں اور بدری دادا آدمی کو مکھی کی طرح مار دیتا ہے۔ میں آپ کو سب کچھ بتا دیتی ہوں، پلیز آپ اس وقت باہر نہ جائیں۔" سمیتا کی آنکھوں میں خوف اور لہجے میں التجا تھی۔ میں نے زیادہ ہٹ دھرمی مناسب نہیں سمجھی اور سمیتا کی گرفت میں اپنا بدن ڈھیلا چھوڑ دیا۔ وہ مجھے پھر کھینچتی ہوئی پچھلے کمرے میں لے آئی۔ درمیانی دروازے پر پردہ کھینچ کر وہ کھڑکی کی طرف بڑھی اور کھڑکی کی جھری میں سے راہداری میں جھانکنے لگی۔ راہداری سے مسلسل دھڑ دھڑ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ لگتا تھا بدری دادا کے غنڈے کمروں کے دروازے کھٹکھٹا رہے ہیں۔ میں نے میز سے پھل کاٹنے والی چھری اٹھا کر جیکٹ میں چھپا لی اور مسہری پر نیم دراز ہو کر سمیتا کی مصروفیت دیکھنے لگا۔ چند لمحے بعد کسی نے اس کے کمرے کا دروازہ بھی کھٹکھٹایا۔ سمیتا نے تھوڑے سے پٹ کھول کر کسی سے چند باتیں کیں اور دروازہ دوبارہ بند کر دیا۔ میرے پاس آ کر بولی۔

"بہتر ہوا آپ باہر نہیں گئے۔ آپ کے ساتھ عملہ بھی نہیں تھا اور وہ کم از کم پندرہ آدمی تھے۔ سارے کے سارے مسلح، بدری دادا بھی ان میں شامل تھا۔ وہ غصے سے لال بھبھوکا ہو رہا ہے۔ جس شخص کو ٹانگ مار کر آپ نے نیچے ہال میں گرایا تھا اس کا کولہا ٹوٹ گیا ہے۔ بدری کے آدمی اسے رکشے میں ڈال کر ہسپتال لے گئے ہیں۔"

"میں اب سگریٹ پی سکتا ہوں۔" میں نے سمیتا کی اطلاعات کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

"پی لیں۔ میں خود بھی پیتی ہوں۔ اس لیے ڈر کی بات نہیں۔" میں نے سگریٹ سلگا لی۔

وہ میرے سامنے کرسی سنبھالتے ہوئے بولی۔ "نواز صاحب! یہ آپ کن لوگوں سے اُلجھ پڑے ہیں۔ سچ کہتی ہوں میرا دل لرز رہا ہے۔ یہ بڑے بے رحم لوگ ہیں۔"

میں نے پوچھا۔ "تم ان کے بارے کیا جانتی ہو؟"

وہ بولی۔ "اس اڈے کا مالک جیمز، بدری پرشاد کا دوست ہے، میں جیمز کے کلب میں ہندوستانی موسیقی کا پروگرام کرتی ہوں۔ یہ نائٹ کلب ہربنس روڈ پر واقع ہے۔ پچھلے دو برس میں یہی ملازمت کر رہی ہوں اس لیے ان لوگوں کے بارے سب کچھ جانتی ہوں۔"

"بدری پرشاد کے بارے تم کیا جانتی ہو؟"

"بدری دادا ناری پور کا ایک بااثر بدمعاش ہے۔ وہاں کے تھانیدار بھی بدری سے پوچھ کر قدم اٹھاتے ہیں۔ بدری اپنے علاقے میں جس شخص کی زندگی حرام کرنا چاہے کر سکتا ہے۔"

سمیتا کا دعویٰ درست تھا۔ وہ بدری کے بارے خاصی معلومات رکھتی تھی۔ میں نے کہا۔ "سمیتا! چند روز پہلے میرے تھانے کے قریب ہائی وے پر ایک بس اغوا کی گئی تھی۔ اس بس میں سے ایک مسافر کو جان سے مار دیا گیا اور اس کی بیٹی کو اٹھا لیا گیا تھا۔ مجھے شبہ ہے کہ یہ کام بدری دادا کے آدمیوں کا ہے۔"

سمیتا کے چہرے پر کوئی خاص تاثر نمودار نہیں ہوا۔ بولی۔ "یہ خبر تو میں نے بھی اخبار میں دیکھی تھی لیکن میں بدری دادا کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ وہ بڑی صفائی سے کام کرنے کا عادی ہے۔"

میں نے کہا۔ "تم بھی تو بڑی صاف نظر رکھتی ہو۔"

اس نے میرے چبھتے ہوئے لہجے کو محسوس کیا اور بولی۔ "آپ سمجھ رہے ہیں کہ میں کچھ چھپا رہی ہوں۔ ایسی بات نہیں ہے۔ آپ کی مدد کر سکوں تو یہ میری خوش قسمتی ہوگی۔ میں آپ کو بدری دادا کے بارے بہت کچھ بتا سکتی ہوں...... لیکن اس کے لیے یہ جگہ اور وقت مناسب نہیں۔ سب سے پہلے تو میں آپ کو یہاں سے نکالنا چاہتی ہوں۔ اس کے بعد ہم کسی جگہ ملاقات کا وقت طے کر لیں گے اور تفصیل سے بات کریں گے۔"

اتنے میں پھر دروازے پر آہٹ سنائی دی۔ سمیتا نے مجھے سگریٹ بجھانے کی ہدایت کی اور دلکش چال چلتی دروازے کی طرف چلی گئی۔ اس کی عمر تیس سے اوپر ہو گئی تھی مگر جسم اور چہرے کی خوبصورتی برقرار تھی۔ دروازے کی درز میں مختصر گفتگو کرنے کے بعد وہ واپس آئی اور

مجھے بیس پچیس منٹ انتظار کرنے کا کہہ کر کمرے سے باہر چلی گئی۔ جاتے جاتے دروازے کو باہر سے لاک کر گئی تھی۔ اس کی واپسی قریباً ایک گھنٹے بعد ہوئی۔ میں بیٹھا ایک رسالے کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ وہ بہت جلدی میں دکھائی دیتی تھی۔ مجھے کمرے سے نکال کر راہداری میں لائی۔ پھر عمارت کی عقبی سیڑھیوں سے اتار کر ایک تنگ گلی میں لے آئی۔ یہاں ایک رکشہ اسٹارٹ کھڑا تھا۔ ہم دونوں رکشے میں بیٹھ کر کرشن چوک کی طرف بڑھ گئے۔

☆======☆======☆

سمیتا سے میری اگلی ملاقات تین روز بعد ایک ریستوران کے کیبن میں ہوئی۔ یہاں ہم اطمینان سے بات کر سکتے تھے۔ سمیتا نے انکشاف کیا کہ چند ہفتے پہلے ناری پور میں جو ہندو مسلم فساد ہوا تھا اور جس میں تیس آدمی مارے گئے تھے بدری، پرشاد نے ہی شروع کرایا تھا۔ مجھے سمیتا کے اس انکشاف پر بہت زیادہ حیرانی نہیں ہوئی۔ گوپال اور بدری پرشاد کے تعلق کا پتہ چلنے سے مجھ پر واضح ہو گیا تھا کہ یہ فساد ایک سازش کا نتیجہ ہو سکتا ہے اور اگر یہ واقعی سازش تھی تو پھر اس کا ذمے دار بدری پرشاد تھا۔ اب سمیتا بھی اپنی زبان سے اسی بات کا اعلان کر رہی تھی۔ وہ بڑی رازداری سے بولی۔

"بدری پرشاد نے اپنے چند کارندوں کو یہ ذمے داری سونپی تھی کہ وہ کسی مناسب طریقے سے فساد شروع کرا دیں۔ ان میں سے ایک کارندے کا نام گوپال تھا۔ گوپال سلطان پور نامی گاؤں کا رہنے والا ہے۔ اس نے وہاں ایک مسلمان لڑکی کو اٹھا کر بے عزت کر دیا اور یوں فساد شروع ہو گیا۔ فساد کی رات زبردست مار ماری ہوئی اور کرفیو لگنے سے پہلے پہلے تیس آدمی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ بدری پرشاد خون خرابہ شروع ہونے سے پہلے ہی یہاں جیمز کے پاس آ گیا تھا اور اب تک یہاں ٹکا ہوا ہے۔"

سمیتا پر شبہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ وہ جو کچھ بتا رہی تھی درست تھا۔ میں نے کہا "سمیتا! تمہیں اتنا کچھ معلوم ہے تو یہ بھی پتہ ہوگا کہ بدری پرشاد نے فساد کیوں شروع کرایا تھا۔ آخر اس سازش سے اس کا کوئی تو مقصد ہوگا۔"

سمیتا نے کہا۔ "نواز صاحب! میں جو باتیں زبان پر لا رہی ہوں، ان کا مطلب اپنی موت کو دعوت دینا ہے لیکن آپ کی خاطر مجھے ہر خطرہ قبول ہے۔"

میں نے مسکرا کر کہا۔ "اس کا ثبوت تو اس دن جوئے خانے میں ہی مل گیا تھا۔ میں تمہارا احسان مند ہوں سمیتا! اور یہ بھی وعدہ کرتا ہوں کہ تم پر کوئی آنچ نہیں آنے دوں گا۔"

سمیتا نے اپنی کہنیاں میز پر ٹکائیں اور آواز کو کچھ اور دبا کر بولی۔ "نواز صاحب! یہ سارا

چکر اس سڑک کا ہے جو ٹھاکر کرپارام اپنے ڈیری فارم تک نکال رہا ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "یہ کرپارام کون ہے؟"

وہ بولی۔ "آپ نے ناری پور کے "کرپا فارم" کا نام نہیں سنا؟ اسی کے مالک کا نام تو کرپارام ہے۔ دارا ناسی کے گنے چنے سیٹھوں میں سے ہے۔ اس نے بڑی سڑک سے اپنے فارم تک ایک میل لمبی پختہ سڑک نکالی ہے۔"

میں نے کہا۔ "ہاں...... سڑک کا ذکر تو میں نے بھی سنا ہے۔ کہتے ہیں جن کسانوں کی زمین خریدی گئی تھی انہوں نے بہت شور مچایا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ زمین کی قیمت بہت تھوڑی دی گئی ہے۔ ایک منتری کے دفتر کے سامنے مظاہرہ بھی ہوا تھا۔"

وہ بولی۔ "پھر کہاں گئے وہ مظاہرے اور مطالبے۔ کسانوں کو ایک دھیلا اور نہیں دیا گیا...... اور سڑک بھی بن گئی۔" سمیتا کا سوال واقعی غور طلب تھا۔ مجھے سوچ میں دیکھ کر اس نے کہا۔ "نواز صاحب! یہ سب بدری پرشاد کا کیا دھرا تھا۔ اسی نے کسانوں کو مظاہروں پر اکسایا تھا اور اسی نے انہیں ٹھنڈا کر دیا۔"

"لیکن بدری کو ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟" میں نے پوچھا۔

سمیتا بولی۔ "وہ ڈیری فارم کے سیٹھوں سے مال کھینچنا چاہتا تھا۔ اس چکر میں پورے ساٹھ ہزار روپے بنائے ہیں اس نے۔"

اب بات کچھ کچھ میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ سمیتا نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ "ڈیری فارم کے سیٹھوں نے سڑک نکالنے کے لیے ہندو کاشت کاروں سے زمین لی۔ ابھی سڑک کا کام شروع نہیں ہوا تھا کہ بدری پرشاد غریب کسانوں کا "نیتا" بن کر سامنے آ گیا۔ اس نے لوگوں کو بھڑکایا کہ ڈیری فارم کے سیٹھ تمہاری سونا اگلتی زمین کو کوڑیوں کے بھاؤ خرید رہے ہیں۔ جو قیمت وہ دے رہے ہیں، وہ نصف سے بھی کم ہے۔ ظاہر ہے کسان بدری پرشاد کی باتوں میں آ گئے۔ وہ علاقے کا مانا ہوا بدمعاش ہے اور جو چاہے کرا سکتا ہے۔ اس کے کہنے پر لوگوں نے مظاہرے شروع کر دیے اور سڑک کا کام رکوا دیا...... سیٹھوں نے بدری پرشاد کی طاقت دیکھی تو اس سے معاملہ طے کر لیا۔ بدری نے ساٹھ ہزار کے نوٹ گن کر جیب میں ڈالے اور سیٹھوں سے وعدہ کیا کہ سات یوم کے اندر اندر وہ سڑک کا کام اپنی نگرانی میں شروع کرا دے گا۔ بس یہیں سے فساد کی بنیاد پڑ گئی۔ بدری پرشاد نے کسانوں کو قابو کرنا چاہا لیکن بات اب اس کے قابو سے باہر ہو چکی تھی۔ ناری پور کے قریباً تمام قصبوں اور دیہات میں سڑک رکوانے کی باتیں ہو رہی تھیں۔ بدری کے پاس صرف سات دن تھے اور یہ دن ایک

ایک کر کے کم ہو رہے تھے۔ آخر بدری پرشاد کے شیطانی ذہن میں ایک شیطانی منصوبہ آ ہی گیا۔ ہندو کاشت کاروں کی توجہ سڑک کے معاملے سے ہٹانے کے لیے اس نے ہندوؤں کو مسلمانوں سے لڑانے کا فیصلہ کر لیا۔ بدری پرشاد کے لیے یہ بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ اس کے کارندے گوپال نے سلطان پور میں فساد کی چنگاری چھوڑی اور دیکھتے ہی دیکھتے پورا ناری پور اس چنگاری کی لپیٹ میں آ گیا۔ ایک خونی رات کے بعد علاقے میں کرفیو لگ گیا۔ ہندو مسلم سب اپنے اپنے گھروں میں بند ہو گئے اور جب ہر طرف موت کی خاموشی چھائی ہوئی تھی بدری پرشاد کی ہدایت پر سیٹھ اپنی سڑک کا کام شروع کرا رہے تھے۔"

میں سمیتا کی باتیں سن کر سناٹے میں رہ گیا۔ اس سارے معاملے میں مسلمانوں کا کوئی قصور نہیں تھا اور سب سے زیادہ مار بھی انہی کو پڑی تھی۔ بدری پرشاد نے انہیں قربانی کا بکرا بنایا تھا اور ساٹھ ہزار روپے کے لیے اَن گنت گھرانوں کو برباد کر دیا تھا۔ کئی آنگن ویران ہوئے تھے اور کئی شریف بیٹیاں اپنے وارثوں کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی تھیں...... اور یہ کھیل یہاں پر ختم نہیں ہو گیا تھا۔ ابھی بدری کی بھڑکائی ہوئی آگ سلگ رہی تھی۔ اس آگ کو شعلہ جوالا بنانے کے لیے پھر اسلحہ جمع کیا جا رہا تھا۔ سرکاری بندوقیں غائب ہو رہی تھیں اور گھروں پر نشان لگائے جا رہے تھے۔ میرا خون کھول اٹھا۔ رگ رگ میں جیسے انگارے بھرے گئے۔ اپنی طویل سروس میں مَیں نے کبھی ہندو مسلم اور سکھ عیسائی کا امتیاز نہیں کیا۔ مجھے جاننے والے اس بات کے گواہ ہیں کہ میں نے ہمیشہ انصاف کا تقاضا پورا کیا ہے۔ گناہ گار مسلمان کے مقابلے میں بے گناہ غیر مسلم کی حمایت کی ہے اور اس حمایت کو انجام تک بھی پہنچایا ہے۔ ایسا کرتے ہوئے کبھی مجھے اپنے دل کو پتھر کرنا پڑا ہے تو میں نے وہ بھی کیا ہے...... وردی پہننے کے بعد میں صرف ایک انسپکٹر رہا ہوں اور بس...... آج بھی میں ایک انسپکٹر تھا اور اپنے بھائی بندوں کی مظلومیت کی داستان سن رہا تھا۔ ظاہر ہے ان ساری باتوں کا علم کچھ اور لوگوں کو بھی ہو گا لیکن وہ خوف کے سبب اپنی زبان نہیں کھول رہے تھے اور جنہیں خوف نہیں تھا ان کی ویسے نیت خراب تھی۔ جیسے انسپکٹر روپ رائے، اس کی موٹی توند پاپ کا گھڑا تھا جس میں بدری پرشاد اور اس کے ساتھیوں کے سارے پاپ راز داری سے جمع تھے...... میرے بس میں ہوتا تو سمیتا کے پاس سے اٹھ کر سیدھا "کرشن چوک" جاتا اور ریوالور کی چھ کی چھ گولیاں بدری پرشاد کے منحوس سر میں اتار دیتا لیکن میں مجبور تھا۔ قانون کو اپنے ہاتھ میں نہیں لے سکتا تھا۔ مجھے جو کچھ کرنا تھا قانون کے دائرے میں رہ کر کرنا تھا اور قانون کے دائرے میں بدری جیسے لوگوں کا آنا ممکن نہیں تو محال ضرور تھا۔

سمیتا نے جو حالات بتائے تھے ان سے یہ بات صاف ہوگئی تھی کہ فساد کی اصل جڑ یہی بدری پرشاد ہے، وہ بدمعاشی کی گدی پر بیٹھا بڑی عیاری سے چالیں چلتا ہے اور لوگوں کو تگنی کا ناچ نچاتا ہے۔ اس کے اثر و رسوخ کو دیکھتے ہوئے میلی کے مکھیا اور تھانیدار روپ رائے جیسے لوگ اس کے ہرکارے بنے ہوئے تھے...... اب میرے سامنے دو اہم کام تھے۔ پہلا یہ کہ ثریا کا سراغ لگانا جو یقینی طور پر بدری کے غنڈوں کے پاس تھی اور دوسرے ناری پور میں نئے خون خرابے کا راستہ روکنا۔ بدری پر ہاتھ ڈالنے کا معاملہ اس کے بعد آتا تھا اور مجھے پتہ تھا یہ معاملہ اتنا آسان نہیں ہے۔ نئے خون خرابے کا راستہ روکنے کے لیے میں نے ایک تفصیلی رپورٹ ایس پی صاحب کو بھیجی اور انہیں لکھا کہ علاقے میں بظاہر امن امان ہونے کے باوجود اندر خانے کشیدگی پائی جاتی ہے اور اندیشہ ہے کہ کہیں پھر گڑبڑ نہ ہو جائے۔ لہٰذا علاقے میں سپیشل فورس بھیجی جائے اور سرگرم افراد کو گرفتار کر لیا جائے۔ اس کے علاوہ دو مسلمان لڑکیوں کی عزت لوٹنے والے غنڈے گوپال کی ضمانت منسوخ کر کے اسے سلاخوں کے پیچھے پہنچایا جائے۔ یہ رپورٹ ارسال کرنے کے بعد میں نے ثریا والے معاملے کی طرف توجہ دی۔ اسے برآمد کرنے کے لیے مجھے کوئی نہ کوئی رسک لینا تھا۔ خطرہ مول لیے بغیر یہ مسئلہ حل ہونے والا نہیں تھا۔ آخر ایک روز میں نے یہ خطرہ مول لے ہی لیا۔ رات قریباً تین بجے میں نے بڑی خاموشی کے ساتھ کرشن چوک کے ایک کوارٹر پر چھاپہ مارا اور وہاں سے کالی پگڑی والے اس سکھ کو گرفتار کر لیا جس نے بس کے اغوا میں حصہ لیا تھا اور بعد ازاں ثریا کو کندھے پر لاد کر نکل گیا تھا۔ اس سکھ کا کھوج لگانے کا سہرا ''سندھو'' کے سر تھا۔ سندھو اچھی فطرت کا آدمی تھا اور اس میں بغیر کسی لالچ کے بھلائی کرنے کا جذبہ موجود تھا۔ وہ کئی روز کرشن چوک میں گھومتا رہا تھا اور آخر کالی پگڑی والے تک پہنچ گیا تھا۔ راتوں رات ہم اس شخص کو اٹھا کر تھانے لے آئے۔ وہ بڑا اکھڑ مزاج بندہ تھا۔ بے بس ہونے کے باوجود ہمیں گالیاں دے رہا تھا۔ خاص طور پر سندھو کی ماں بہن ایک کر رہا تھا۔ جوش میں آ کر اس نے بدری پرشاد کا نام بھی لیا اور ہمیں دھمکایا کہ اسے معافی مانگ کر چھوڑا نہ گیا تو بدری ہماری وردیاں اور کھال ایک ساتھ اتروا دے گا۔ مجھے پہلے سے معلوم تھا کہ یہ شخص زبردست اکڑفوں دکھائے گا لہٰذا اس کی دھمکیوں کا ہم پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ میں نے اکیلے میں بٹھا کر پہلے تو انسانوں کی طرح سمجھایا کہ بدری کے برے دن آ گئے ہیں لہٰذا وہ بھی اکڑ چھوڑ دے اور جو کچھ ہم پوچھتے ہیں صاف صاف بتا دے۔ یہاں تک کہ اسے سلطانی گواہ بنانے کا لالچ بھی دیا۔ لیکن وہ باتوں سے ماننے والا بھوت نہیں تھا۔ میں نے اسے ''لاتوں والوں'' کے سپرد کر دیا۔ وہ رات اس درندہ

صفت شخص کے لیے بڑی بھاری ثابت ہوئی۔ اس پر تھرڈ ڈگری استعمال کی گئی اور تب تک استعمال کی گئی جب تک اس خبیث نے زبان نہیں کھول دی......

اس کا نام گوبندر سنگھ تھا۔ وہ عرصہ چار برس سے بدری پرشاد کے لیے کام کر رہا تھا۔ دو ماہ پہلے تین جنوری کی دوپہر اس نے اپنے چار ساتھیوں کے ساتھ مل کر پٹنہ کے قریب ہائی وے پر ایک مسافر بس کو لوٹا تھا اور ایک شخص کو مارنے کے بعد ثریا نامی لڑکی کو اغوا کر لیا تھا۔ گوبندر سنگھ نے کانپتے ہونٹوں کے ساتھ اور لڑکھڑاتے لہجے میں اعتراف کیا کہ اغوا کرنے کے بعد اس نے اور اس کے ساتھیوں نے تین روز تک ثریا کو خراب کیا اور پھر ایک دلال کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ بے پناہ مار کھانے کے باوجود گوبندر اس دلال کا نام پتہ نہیں بتا سکا۔ اس سے اندازہ ہوا کہ وہ دلال کے بارے واقعی کچھ نہیں جانتا۔ ملزم کو مار پڑتی ہے تو وہ اپنی جان چھڑانے کے لیے بعض دفعہ ایسے جرم بھی قبول کر لیتا ہے جو پولیس کے وہم و گمان میں نہیں ہوتے۔ گوبندر سنگھ کی زبان سے بھی ایک ایسی بات نکل گئی جس نے ہمیں بدری پرشاد کے خلاف ایک زبردست ثبوت فراہم کر دیا۔ تین چار ماہ پہلے چھاؤنی کے علاقے میں ایک بغیر نمبر پلیٹ کے کار نے ایک ٹریفک کانسٹیبل کو کچل دیا تھا۔ یہ واقعہ ایک بس سٹاپ کے قریب ہوا تھا اور کم از کم پانچ گواہ ایسے تھے جنہوں نے کار ڈرائیور کو دیکھا تھا اور دوبارہ دیکھنے پر اسے پہچان سکتے تھے...... خاصی بھاگ دوڑ کے بعد بھی پولیس مجرم کو پکڑنے میں ناکام رہی تھی اور یہ کیس ''عدم پتہ'' ہو گیا تھا...... مگر اب گوبندر سنگھ انکشاف کر رہا تھا کہ کانسٹیبل کو کچل کر ہلاک کرنے والا شخص خود بدری پرشاد تھا۔ اس وقت کار میں ناجائز اسلحہ موجود تھا اور بدری کانسٹیبل کے اشارے پر رکنے کی بجائے اسے کچل کر آگے بڑھ گیا تھا۔

گوبندر سنگھ کی زبان کھلوا کر میں نے ایک اہم کامیابی حاصل کی تھی اور اس کامیابی پر میں بہت خوش تھا لیکن یہ خوشی تادیر برقرار نہ رہ سکی۔ اسی روز دوپہر کو مجھے آرڈر ملے کہ میرا تبادلہ دار جلنگ میں کر دیا گیا ہے اور مجھے ایک ہفتے کے اندر اندر وہاں پہنچ کر چارج سنبھالنا ہے۔ یہ تبادلہ اچانک تھا بہرحال اس کا تعلق بدری پرشاد والے کیس سے نہیں تھا۔ اتفاقاً ایسا ہوا تھا کہ مجھے ایک اہم معاملے کو چھوڑ کر یہاں سے کوچ کرنا پڑ رہا تھا۔ سارے پروگرام دھرے کے دھرے رہ گئے تھے۔ تبادلہ روکنے کی درخواست فضول تھی۔ انگریز ڈپٹی کمشنر ایسے معاملوں میں بہت سخت تھا۔ میں نے اس موقع پر ان سینکڑوں ہزاروں لوگوں کے بارے میں سوچا جو مسلمان ہونے کی وجہ سے بدری پرشاد کے رحم و کرم پر تھے۔ ان گنت ظلم ہو چکے تھے اور ان گنت ظلم سہنے والے تھے۔ میرا دل چاہا کہ جانے سے پہلے ان لوگوں کے لیے کچھ کر

جاؤں۔ اگر بدری پرشاد کو جہنم واصل نہیں کر سکتا تو اسے چند برسوں کے لیے سلاخوں کے پیچھے ضرور پہنچا جاؤں...... اور میں ایسا کر بھی سکتا تھا۔ گوبندر سنگھ کے بیان کے بعد میرے لیے یہ کام ایسا ناممکن نہیں تھا۔ پولیس کانسٹیبل کا سنگدلانہ قتل ایسا معاملہ تھا جس سے بڑے افسر بھی چشم پوشی نہیں کر سکتے تھے۔ میں نے فوری طور پر ایک فیصلہ کیا اور رات ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

رات کے ڈھائی بجے تھے۔ سڑکیں اور بازار سنسان نظر آ رہے تھے بس کبھی کبھار کوئی کار یا موٹر سائیکل فراٹے بھرتی گزر جاتی تھی۔ میں اپنی چھاپہ مار پارٹی کے ساتھ سڑک سے ذرا ہٹ کر ایک بس سٹاپ کی اوٹ میں کھڑا تھا۔ مجھ سے قریباً سو گز کی دوری پر اس نائٹ کلب کی بیرونی روشنیاں چمک رہی تھیں جس کا مالک، بدری کا دوست جیمز تھا۔ بدری اس وقت کلب کے اندر تھا۔ ڈھائی بجے جونہی اس کی جیپ کلب کی پارکنگ سے نکلی ہم نے اس کا راستہ روکا اور گاڑی سے نیچے اتار لیا۔ میں وردی میں تھا۔ وہ مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھورنے لگا۔ میں نے گرفتاری کا وارنٹ اس کے سامنے اور ہتھکڑی اس کی طرف بڑھا دی۔ ہتھکڑی دیکھ کر وہ آپے سے باہر ہو گیا اور ہمیں گالیاں دینے لگا۔ میں نے جھپٹ کر اس کے بال مٹھی میں جکڑے اور سیٹ پر گرا دیا۔ میرے سب انسپکٹر اشوک نے اسے ہتھکڑی پہنا دی۔ بدری کے ساتھ ڈرائیور کے علاوہ ایک باڈی گارڈ بھی تھا۔ ان دونوں کو بھی حراست میں لے لیا گیا۔

میں نے بدری کی شناخت پریڈ کا انتظام کل ہی کر لیا تھا۔ ''کانسٹیبل قتل کیس'' کی فائل سے ان تمام افراد کے نام پتے مل گئے تھے جنہوں نے تین ماہ پہلے بدری کو کار چلاتے دیکھا تھا۔ اب مجھے صبح کا انتظار تھا۔ طلوع آفتاب سے قریباً ایک گھنٹہ قبل میں حوالات میں داخل ہوا تاکہ بدری سے اس کار کے بارے میں پوچھ گچھ کر سکوں۔ واردات میں استعمال ہونے والی کار اب بدری کے پاس موجود نہیں تھی۔ وہ اسے فروخت کر چکا تھا یا وقتی طور پر کہیں بند کر چکا تھا۔ جونہی میں حوالات میں داخل ہوا آنکھوں کے سامنے بجلی سی چمک گئی۔ بدری پرشاد نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور چیل کی طرح مجھ پر جھپٹا...... موت میرے کندھے کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ بدری پرشاد کے بائیں ہاتھ میں ایک خوفناک پھل کا چاقو تھا۔ اس نے یہ چاقو بڑی بے رحمی سے گھمایا۔ مجھ سے معمولی چوک ہوتی تو یہ چاقو دستے تک میرے سینے میں گھس جاتا۔ چند لمحوں کے لیے میں بھونچکا رہ گیا۔ لاک اپ میں چاقو کہاں سے آیا؟ گرفتاری کے وقت بدری کی مکمل جامہ تلاشی لی گئی تھی۔ یہی ہو سکتا تھا کہ میرے عملے کے کسی ہندو نے یہ چاقو بدری کو

''تحفے'' میں دیا ہو۔ بہر حال اس وقت یہ سب کچھ سوچنے کا موقع نہیں تھا۔ علاقے کا خطرناک ترین غنڈہ میرے سامنے تھا اور اس کے ہاتھوں میں کھلی ہوئی موت تھی۔ بدری کا دوسرا وار بچانے کے بعد مجھے حوصلہ ہوا اور میں نے جھپٹ کر اس کا چاقو والا بازو پکڑ لیا۔ سب انسپکٹر اشوک میرے پہلو میں تھا۔ اس نے پے در پے کئی ٹانگیں بدری کے پیٹ میں ماریں۔ وہ ذرا ڈھیلا پڑا تو میں نے پورا زور لگا کر اس کا بازو مروڑ دیا اور اس وقت تک مروڑتا رہا جب تک چاقو پکے ہوئے پھل کی طرح بدری پرشاد کے ہاتھ سے گر نہیں گیا۔ بدری کے منہ سے مغلظات کا دھارا بہہ رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ ہم سب کی بوٹیاں نوچ لیتا۔ خاص طور پر میرا تو وہ قیمہ ہی کر ڈالتا۔ اس کے تصور میں بھی نہ ہوگا کہ ایک انسپکٹر اسے ہتھکڑی لگائے گا اور یوں حوالات میں لا کر ذلیل کرے گا۔ چاقو بدری کے ہاتھ سے گر گیا تو میں نے اسے بے دریغ ٹھوکروں اور گھونسوں پر رکھ لیا۔ پورا تھانہ یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ دفعتاً بدری فرش پر پڑے چاقو کے پاس گرا اور چاقو ایک بار پھر اس کے ہاتھ میں آ گیا لیکن اس مرتبہ اس نے مجھ پر چھلانگ لگانے کی بجائے لاک اپ کے دروازے کی طرف دوڑ لگائی۔ سب انسپکٹر اشوک اس کے راستے میں تھا۔ اس نے چاقو گھما کر سب انسپکٹر کو پیچھے ہٹایا اور تیر کی طرح دروازے سے نکلتا چلا گیا۔ لاک اپ سے باہر کانسٹیبل عطا محمد نے دلیر ہو کر اس پر جھپٹا مارا لیکن اس کے ہاتھ سونے کی ایک مرکی کے سوا کچھ نہیں آیا۔ یہ مرکی بدری کے کان میں تھی اور عطا محمد کی انگلی اس مرکی میں پھنس گئی تھی۔ کان چیر کر مرکی ہاتھ میں رہ گئی اور بدری بیرونی دروازے کی طرف بھاگا۔ میں ریوالور نکال کر اس کے پیچھے لپکا۔

''رک جاؤ بدری!'' میں نے پورے زور سے چلا کر کہا۔ بدری نہیں رکا۔ میں نے اپنی وارننگ ایک بار پھر دہرائی۔ بدری اب دروازے کے قریب تھا۔ یکا یک اوپر تلے دو دھماکے ہوئے اور بدری اوندھے منہ گملوں کی قطار پر گرا۔ بدری پر فائر کرنے والا سب انسپکٹر اشوک تھا۔ ہم بھاگتے ہوئے بدری کے پاس پہنچے۔ اشوک کی پہلی گولی اس کی پسلیوں میں اور دوسری سر کے پچھلے حصے میں لگی تھی یہی گولی اس کی فوری موت کا سبب بن چکی تھی۔ بدری کو سیدھا کیا گیا تو اس کا گرد آلود منہ اَدھ کھلا تھا اور وہ آخری ہچکی لے چکا تھا۔ میں نے حیران نظروں سے اشوک کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر فرض شناسی کی چمک تھی اور آنکھوں میں میرے لیے محبت، وہ عرصہ چار سال سے میرا ماتحت تھا لیکن آج پہلی بار میں اسے اتنا سنجیدہ دیکھ رہا تھا۔ وہ اٹین شین کھڑا تھا۔ جیسے خاموشی کی زبان سے کہہ رہا ہو۔ ''انسپکٹر نواز! تم یہاں سے جا رہے ہو۔ اس بدبخت کی لاش کو میری طرف سے الوداعی تحفہ سمجھ لو۔ میں نے اس

درندے کو مار کر اپنا فرض پورا کیا ہے اور اس طوفان کا رستہ بھی روکا ہے جو اس درندے کے تمہارے ہاتھوں مرنے سے اٹھتا۔"

واقعی اشوک نے بہت حاضر دماغی کا ثبوت دیا تھا۔ بدری کو ہم دونوں میں سے کوئی بھی گولی مارنے کا اختیار رکھتا تھا۔ کیونکہ وہ قاتل تھا اور پولیس کی حراست سے بھاگ رہا تھا لیکن وہ میرے ہاتھوں مرتا تو شر پسند اسے ہندو مسلم دشمنی کا شاخسانہ قرار دے کر آسانی سے فساد بھڑکا دیتے اور اس فساد کی شدت بہت زیادہ ہوتی۔

☆======☆======☆

بعض لوگوں کو مارنا مشکل ہوتا ہے اور ان کی موت کو سنبھالنا اس سے بھی مشکل۔ بدری بھی ایسے ہی لوگوں میں تھا۔ اس کی موت پولیس کی حراست میں ہوئی تھی اور یہ موت علاقے کے امن سکون کو برباد کر سکتی تھی اور عین ممکن تھا کہ ہندو مسلم فساد ہی بھڑک اٹھے۔ میں نے فوری طور پر ایس پی صاحب سے رابطہ کر کے انہیں صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ انہوں نے تحمل سے میری بات سنی اور میری درخواست پر وہ لسٹ میرے حوالے کر دی جو میں نے چند روز پہلے انہیں ارسال کی تھی۔ اس لسٹ میں ناری پور کے ان تمام سرکردہ افراد کے نام پتے درج تھے جو ہندو مسلم دشمنی میں پیش پیش رہتے تھے اور فسادی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ اس لسٹ میں بغیر کسی امتیاز کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے نام موجود تھے۔ میں نے یہ لسٹ حاصل کرنے کے بعد ہیڈ کوارٹر سے دو ٹرک نفری لی اور فوراً ناری پور روانہ ہو گیا۔

ایک طویل سفر کے ہم ناری پور پہنچے۔ یہاں پہنچتے ہی میں نے سب سے پہلے انسپکٹر روپ رائے کو ایک کونے میں بٹھایا اور پھر برق رفتاری سے کارروائی کر کے ناری پور کے دیہات سے قریباً دو سو افراد کو حراست میں لے لیا...... جس وقت ناری پور میں بدری پرشاد کی موت کی خبر پہنچی ہم اپنا کام مکمل کر چکے تھے۔

بدری کی موت پر پہلے تو زبردست ردِعمل ہوا اور ہندو لاٹھیالوں کی ٹولیاں نعرہ زنی کرتی ہوئی گلیوں بازاروں میں نکل آئیں لیکن جلد ہی ان کا جوش و خروش ٹھنڈا پڑ گیا۔ ایک تو انہیں بھڑکانے والے سرکردہ لوگ موجود نہیں تھے، دوسرے لوگوں کو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یہ ہندو مسلم معاملہ نہیں ہے۔ بدری پرشاد کو اپنے کرتوتوں کی سزا ملی ہے اور وہ پولیس کی حراست میں ایک ہندو سب انسپکٹر کے ہاتھوں ہلاک ہوا ہے (یعنی حراست سے بھاگتے ہوئے) قریباً ایک ہفتے کے اندر اندر یہ معاملہ سرد ہو گیا اور ناری پور کے طول و عرض میں بہتری کے آثار نظر آنے لگے۔ میری مدت ملازمت بھی پوری ہو چکی تھی بلکہ ایک دو دن زائد ہی ہو چکے تھے۔

میں ناری پور اور ناری پور کے مسلمانوں کو سپردِ خدا کر کے پٹنہ سے دارجلنگ روانہ ہو گیا۔

☆======☆======☆

اس کہانی کا ایک کردار ابھی تک تاریکی میں ہے۔ یعنی وہ لڑکی جو چند ماہ پہلے لڑکے کے بھیس میں اپنے باپ کے ہمراہ پناہ کے لیے بھاگی تھی اور پٹنہ کے قریب باپ بیٹی غنڈوں کے ہتھے چڑھ گئے تھے۔ پٹنہ سے آتے ہوئے میں سب انسپکٹر اشوک کو ہدایت دے آیا تھا کہ وہ لڑکی کی تلاش جاری رکھے...... دو تین مہینے اسی طرح گزر گئے۔ آخر ایک دن لڑکی کے بارے میں اطلاع آ گئی لیکن یہ اطلاع اشوک نے نہیں سمیتا نے دی تھی۔ میں سمیتا کو اپنا ایڈریس دے آیا تھا اور وہ وقتاً فوقتاً مجھے خط لکھتی رہتی تھی۔ اس خط میں اس نے لکھا کہ ثریا کا پتہ چل گیا ہے۔ میں فوراً پٹنہ پہنچوں۔

میری ڈائری میں نوٹ ہے سن 44ء ستمبر کی دو تاریخ تھی۔ میں دارجلنگ سے پٹنہ پہنچا اور سیدھا سمیتا کے فلیٹ کا رخ کیا۔ وہ آج کل ایک متوسط علاقے میں فلیٹ لے کر رہ رہی تھی میں وہاں پہنچا تو سندھو بھی موجود تھا۔ وہ ایک طرح سے میرا اور سمیتا کا مشترکہ دوست بن چکا تھا۔ بدری پرشاد کیس میں سندھو کی کارکردگی یاد رکھنے کے قابل تھی۔ وہ گوبندر سنگھ کا سراغ نہ لگاتا تو معاملہ نہ جانے کہاں تک لٹک جاتا۔ سمیتا اور سندھو نے میرا استقبال گرم جوشی سے کیا۔ پھر مجھے ساتھ والے کمرے میں لے گئے۔ یہاں انیس بیس برس کی ایک خوش شکل لڑکی سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس کے بال زیادہ لمبے نہیں تھے اور چہرہ مرجھایا مرجھایا تھا۔ اس نے سہم کر میری طرف دیکھا۔ سمیتا نے کہا۔

"ثریا! یہی ہیں انسپکٹر نواز خاں! تمہیں ڈھونڈنے کے لیے انہوں نے دن رات کوشش کی ہے۔"

لڑکی کے ہونٹ لرزے شاید وہ سلام کرنا چاہتی تھی مگر پھر اس کے آنسو ٹپک پڑے اور وہ چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ سمیتا نے اسے بازوؤں میں بھر لیا اور ہمیں ہاتھ کے اشارے سے کہا کہ ہم باہر چلے جائیں۔ سندھو اور میں باہر آ گئے۔ لڑکی کے رونے دھونے نے سندھو کو سنجیدہ کر رکھا تھا۔ وہ اپنے ہونٹ کاٹتا ہوا صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔ اس کی باتوں سے پتہ چلا کہ ثریا کا سراغ پچھلے ہفتے ملا ہے۔ یہ سراغ سمیتا نے لگایا تھا۔ سمیتا کا تعلق چونکہ ناچ گانے سے تھا وہ نئی نوکری تلاش کرتی ہوئی ایک ایسے تھیٹر میں پہنچ گئی جہاں ناچ گانے میں رنگ بھرنے کے لیے بازارِ حسن کی بہت سی لڑکیاں بھی جمع کی گئی تھیں۔ سمیتا چونکہ مجھ سے ثریا کی کہانی سن چکی تھی اسے ایک لڑکی کے چھوٹے چھوٹے بالوں اور دیہاتی

خدوخال پر شک گزرا تھا۔ اس نے ٹوہ لی تو انکشاف ہوا کہ یہی ثریا ہے جو سندری کے نام سے یہاں کام کرتی ہے۔ سمیتا نے تھیٹر کے مالک سے بات کی......اور چار ہزار روپے میں معاملہ طے کرلیا۔ کیونکہ ثریا کو ناچ گانے میں مہارت حاصل نہیں ہو رہی تھی اور تھیٹر والا اس سے جان چھڑانا چاہتا تھا لہٰذا صرف چار ہزار روپے میں اس نے ثریا کی جان چھوڑ دی اور یوں......وہ سمیتا کے ساتھ اس فلیٹ میں آ گئی۔

ثریا کی تباہی کا سن کر میرا دل ٹکڑے ہو رہا تھا۔ ایک معصوم صورت لڑکی جو ایک برس پہلے اپنے باپ کے آنگن میں شرافت کے سات پردوں میں چھپی ہوئی تھی اور درندہ صفت لوگوں کے ہتھے چڑھ کر کنجر خانوں میں تاراج ہوئی تھی اور بازارِ حسن کے چوباروں میں نچائی گئی تھی۔ کاش میرے قلم میں اتنی طاقت ہوتی کہ اس دکھ کو بیان کر سکتا جو ثریا کی معصوم صورت دیکھ کر میری رگ رگ میں سما رہا تھا۔ شاید میرا چہرہ بہت غمزدہ ہو گیا تھا۔

سندھو نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ پریشان نہ ہوں نواز صاحب! ثریا کو اب میری ذمے داری سمجھیں۔ میں اسے سہارا دوں گا۔ میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ میں اسے سہارا دوں گا۔" اس کے لہجے میں عجب سی لرزش تھی۔ یہ لرزش اس کے پختہ عزم کو ظاہر کر رہی تھی۔

میں نے کہا۔ "میں سمجھا نہیں سندھو۔"

وہ بولا۔ "لیکن میں بہت کچھ سمجھ چکا ہوں نواز صاحب! کتابوں نے مجھے بہت کچھ سمجھایا ہے میں حق اور باطل میں پہچان کرنے لگا ہوں۔"

میں بری طرح چونک پڑا "کک......کیا تم مسلمان ہو رہے ہو؟"

وہ بولا۔ "دل تو بہت پہلے مسلم ہو چکا ہے۔ اب صرف بیعت کرنا باقی ہے۔ میں کل دہلی جا رہا ہوں۔ بڑے امام صاحب کے دستِ مبارک پر اسلام قبول کروں گا......اس کے بعد میں جو پہلا کام کروں گا وہ ثریا سے نکاح ہوگا......"

میں حیرت سے گنگ اس شخص کی طرف دیکھتا چلا جا رہا تھا جو اب سندھو نہیں تھا۔ نہ جانے کیوں اس گھڑی مجھے لگا کہ نو ماہ پہلے رات دس بجے پٹنہ کے ہسپتال میں جس جاں بلب شخص نے مجھے فریادی نظروں سے دیکھا تھا اس کی روح لاڈلی بیٹی کی طرف سے مطمئن ہو گئی ہے۔

☆======☆======☆

کھیت میں لاش

کوئی ایماندار اور باضمیر پولیس انسپکٹر کسی مجرم کو شاباش نہیں دیتا مگر نہ جانے اس مجرم میں ایسی کون سی بات تھی کہ انسپکٹر نواز جیسا پولیس آفیسر بھی اُسے شاباش دینے پر مجبور ہو گیا تھا۔

یہ کیس بڑے دلچسپ انداز میں شروع ہوا بعض اوقات بات کوئی بھی نہیں ہوتی اور لوگ بتنگڑ بنا دیتے ہیں۔ میرے تھانے والے گاؤں میں ایک لڑکی بالی تھی۔ بڑی چلتی پھرتی اور تیز طرار۔ گاؤں کے کئی لڑکوں سے اس کا ''سچا پیار'' چل رہا تھا۔ ایک روز صبح سویرے تھانے میں اطلاع پہنچی کہ بلال شاہ اس لڑکی کے ساتھ پکڑا گیا ہے۔ میرے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ بلال شاہ سے مجھے ایسی حرکت کی توقع نہیں تھی۔ بال بچے دار آدمی تھا اور دوسروں کو پرہیز گاری کی باتیں بتایا کرتا تھا۔ اس نے ایسا کیوں کیا؟ میں ابھی حیرت میں ڈوبا سوچ رہا تھا کہ گاؤں کے آٹھ دس آدمی غصے میں تپے ہوئے اندر آ گئے۔ ان میں گاؤں کے نمبردار کا بیٹا بھی تھا۔ انہوں نے آتے ساتھ ہی اعلان کیا کہ بلال شاہ نے شریفے کی لڑکی سے برا بھلا کیا ہے اور بھاگ گیا ہے۔ اس کی چیخیں سن کر مولا داد اور اس کا بھائی جوی کے کھیت میں پہنچے تو بلال شاہ انہیں دیکھ کر فرار ہو گیا۔ بالی بے ہوش ہو چکی تھی۔ اسے اٹھا کر گاؤں میں لایا گیا۔

''بالی اور بلال شاہ'' میرا سر چکرانے لگا۔ یاالٰہی یہ کیا ماجرا ہے۔ بلال شاہ کی تو اپنی لڑکی بالی کے لگ بھگ تھی۔ میں نے پوچھا۔ ''لڑکی نے کیا بیان دیا ہے۔''

نمبردار کا بیٹا بولا۔ ''وہ تو جی ابھی تک بے ہوش ہے۔ پتہ نہیں بچتی بھی ہے کہ نہیں۔'' وہ سارے کے سارے کانوں کو ہاتھ لگانے لگے۔ معاملہ بڑا نازک تھا سوچنے کی بات تھی اگر بلال شاہ نے کچھ نہیں کیا تو وہ بھاگا کیوں؟

میں نے اسی وقت کرسی چھوڑی اور لوگوں کے ساتھ شریفے کے گھر کی طرف چل نکلا۔

شریفہ ایک لمبا تڑنگا ہندو تھا اور چند ہی برس پہلے مسلمان ہوا تھا۔ مسلمان بھی کیا ہوا تھا بس نام مسلمانوں والا رکھ لیا تھا۔ پیشہ کھیت مزدوری تھا۔ ہم اس کے گھر پہنچے تو لڑکی ہوش میں آ چکی

تھی۔ ان کے گھر رونا پیٹنا مچا ہوا تھا۔ عورتیں بلال شاہ کے اگلے پچھلوں کو خاص زنانہ قسم کی گالیاں دے رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر ان کا غصہ کچھ اور تیز ہو گیا۔ لڑکی کی ماں چھاتی پر دو ہتڑ مار کر بولی۔

انصاپھ کرنا تھانیدار جی! اب انصاپھ کرنا۔ اب تیری منصبھی کا امتحان ہے۔ ہائے میری لڑکی کہیں کی نہ رہی۔''

میں نے دل میں سوچا۔ ''کہیں کی تو وہ پہلے بھی نہیں تھی پہلے کون سا کام اس نے نہیں کیا۔''

لڑکی سامنے ہی چارپائی پر لیٹی تھی۔ ابھی پوری طرح ہوش میں نہیں آئی تھی۔ ایک عورت اسے پیالے سے دودھ پلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ صحن میں تماشا دیکھنے والوں کا ہجوم تھا۔ عورتیں بچے مرد سب موجود تھے۔ سب کے چہروں پر مصنوعی افسوس اور آنکھوں میں اصلی دلچسپی تھی۔ میں نے ڈانٹ ڈپٹ کر ان کو باہر نکال دیا اور حوالدار سے کہا صحن کے دروازے کو اندر سے کنڈی لگا دے۔ لڑکی ڈری ڈری نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ لگتا تھا ابھی پھر چیخنے لگے گی۔ میں نے زیادتی کا شکار ہونے والی بہت سی عورتوں کے چہرے دیکھے تھے۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس لڑکی کے ساتھ ایسا کچھ ہوا ہے میں نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

''کیا ہوا لڑکی؟''

اس نے سہمی نظروں سے میری طرف دیکھا اور اس کے ہونٹ تھرانے لگے۔ اس کی ماں چھاتی کوٹ کر بولی۔ ''چپ کیوں ہے مرن جوگی، بولتی کیوں نہیں۔ بتا دے سب کچھ جو بیتا ہے تجھ پر۔''

لڑکی نے پہلے حیرانی سے ماں کو دیکھا پھر خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولی۔ ''تھانیدار جی! ادھر کھیت میں ہا...... ہاتھ...... ہاتھ ہے۔''

''کس کا ہاتھ؟'' میں نے حیرانی سے پوچھا۔

لڑکی کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ وہ بری طرح کانپ رہی تھی ہکلا کر بولی۔ ''پتہ نہیں جی کوئی لاش پڑی ہے ادھر آپ خود جا کر دیکھ لیں۔ اللہ دی قسمے میں جھوٹ نہیں بول رہی۔''

میرے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ یہ ایک نیا ہی مسئلہ کھڑا ہو گیا تھا۔ لڑکی کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ وہی کچھ کہہ رہی ہے جو دیکھ کر آئی ہے۔

میں نے زور دے کر پوچھا۔ ''تم نے خود دیکھی ہے لاش؟''

وہ بولی۔ ”نہیں جی! میں نے صرف ہاتھ دیکھا ہے باقی سب کچھ مٹی میں تھا۔“

میں نے کہا۔ ”بلال شاہ کا کیا معاملہ ہے؟“

”کون بلال شاہ! بلال شاہ...... تو وہاں موجود نہیں تھا۔“

بالی کی ماں چلا کر بولی۔ ”ہائے ہائے لڑکی! کیا الٹی سیدھی بک رہی ہے۔ وہ مویا مشٹنڈا تیرے ساتھ......“

”تم چپ رہو۔“ میں نے ڈانٹ کر بڑھیا کی بات کاٹی اور بالی سے کہا کہ وہ میرے ساتھ موقعے پر چلے۔ وہ تھر تھر کانپنے لگی۔

”نہیں تھانیدار جی! میں نہیں جاؤں گی۔ میں آپ کو بتا دیتی ہوں۔ بابے شفیع کے کھیت میں دوسرے بنّے کے ساتھ، آپ کو خود ہی نظر آ جائے گا سب کچھ۔“

میں نے اسی وقت حوالدار کو ساتھ لیا۔ گاؤں والے ایک جلوس کی طرح ہمارے پیچھے آ رہے تھے۔ گاؤں سے نکل کر ایک فرلانگ کے فاصلے پر بابے شفیع کا کھیت آ گیا۔ وہاں جوی لہرا رہی تھی۔ جوی کا پودا کافی اونچا ہوتا ہے۔ ہم کھیت میں داخل ہوئے تو نمبردار کے لڑکے نے ایک مقام کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ بالی یہاں بے ہوش پڑی تھی۔ وہاں مجھے ایک دو ٹوٹی چوڑیاں بھی نظر آئیں۔ لوگوں نے اشارے سے بتایا کہ بلال شاہ اس طرف سے ہو کر بھاگا تھا۔ کچی زمین پر ابھی تک بلال شاہ کے پاؤں کے نشان موجود تھے۔ میں اچھی طرح پہچان سکتا تھا۔ ہم کوئی پندرہ بیس گز آگے دوسرے کنارے پر پہنچے۔ بالی نے اس جگہ کی نشاندہی کی تھی۔ جلد ہی مجھے وہ منظر نظر آ گیا جسے دیکھ کر بالی بے ہوش ہوئی تھی۔ واقعی خوفناک منظر تھا۔ زمین کے اندر سے ایک مردانہ ہاتھ باہر نکلا ہوا تھا کلائی اور ہاتھ کے بال مٹی میں سرخ ہو رہے تھے۔ جس نے بھی یہ منظر دیکھا، سن ہو کر رہ گیا۔

میں نے لوگوں کو کھیت سے باہر نکلنے کا حکم دیا۔ اس کے بعد دو سنتریوں نے حوالدار کے ساتھ مل کر بڑی احتیاط سے لاش پر سے مٹی ہٹانی شروع کی۔ یہ کام دس منٹ میں مکمل ہوا۔ اب لاش ہمارے سامنے تھی اور اس کی بُو ہوا کے ساتھ چاروں طرف پھیل رہی تھی۔ یہ ایک تیس بتیس سالہ صحت مند جوان تھا۔ جسم زیادہ لمبا نہیں تھا مگر گٹھا ہوا تھا۔ پیلی شلوار قمیض اور بغیر بازو کا سرمئی سویٹر پہنے ہوئے تھا۔ کالے رنگ کی گرگابی تھی۔ یہ سب کچھ کھیت کی مٹی میں لتھڑا ہوا تھا۔ متوفی کے سر پر بائیں جانب دو زخم تھے۔ ایک زخم جو کنپٹی کے پاس تھا کافی سنگین تھا۔ یوں لگتا تھا کسی لاٹھی یا کند آلے سے زوردار ضرب لگائی گئی تھی۔ متوفی کی چھوٹی داڑھی بھی تھی لاش کی حالت سے ظاہر تھا کہ اسے دفنائے ہوئے 48 گھنٹے سے اوپر ہو چکے ہیں۔

ایک رات پہلے تیز بارش ہوئی تھی اور یہی وجہ تھی کہ لاش کا ہاتھ مٹی میں سے نکل آیا تھا۔ اب صورت حال پوری طرح میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ لڑکی صبح سویرے کھیت کے اس حصے میں آئی تھی۔ لاش کا ہاتھ دیکھ کر اس کی چیخیں نکل گئی تھیں۔ شومئی قسمت بلال شاہ بھی کہیں پاس ہی موجود تھا۔ وہ چیخیں سن کر لڑکی کی طرف بھاگا۔ لڑکی بے ہوش ہو چکی تھی۔ جس وقت وہ لڑکی پر جھکا ہوا اسے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہا تھا، گاؤں والوں نے دیکھ لیا۔ یہیں سارا معاملہ گڑبڑ ہو گیا۔ انہوں نے بلال شاہ پر شک کیا اور بلال شاہ اس شک کو محسوس کر کے بھاگ کھڑا ہوا...... اور خیر سے اب تک بھاگا ہوا تھا۔ مجھے ہنسی بھی آ رہی تھی اور رونا بھی۔ ہنسی بلال شاہ کی ضرورت سے زیادہ ہوشیاری پر آ رہی تھی اور رونا اس کی بیوقوفی پر۔

میں نے ضروری کارروائی کرنے کے بعد لاش اٹھوائی اور تھانے میں لے آیا۔ پورا گاؤں اکٹھا ہو گیا ایک شخص نے متوفی کو پہچان لیا۔ وہ بولا۔

”یہ راہوالی گاؤں کا رہنے والا ہے۔ اس کا نام صوفی جمیل ہے شام گڑھ میں کپڑے کی دکان کرتا ہے۔“ فوراً ہی چند آدمی رضا کارانہ طور پر راہوالی روانہ ہو گئے وہ گھوڑوں پر سوار تھے۔ کوئی دو گھنٹے بعد وہ متوفی کے وارثوں کو لے آئے۔ ان میں تین عورتیں اور چار پانچ مرد تھے۔ ایک بوڑھی عورت نے لاش کے چہرے سے کپڑا ہٹا کر دیکھا اور چیخ مار کر غش کھا گئی۔ دوسری عورتیں بھی دھاڑیں مار مار کر رونے لگیں۔

☆======☆======☆

صوفی جمیل راہوالی کے ایک معزز شخص صادق ارائیں کا بیٹا تھا۔ نمازی پرہیزگار تھا۔ صوفی اس کا نام نہیں تھا لیکن مشہور ہو گیا تھا۔ وہ کھیتی باڑی کے علاوہ نزدیکی قصبے میں کپڑے کی دکان بھی کرتا تھا۔ دکان اس کے گھر سے کوئی سات آٹھ میل کی دوری پر تھی۔ وہ ہفتے میں دو تین بار وہاں کا چکر لگاتا تھا۔ تین روز پہلے وہ منہ اندھیرے گھوڑی پر سوار دکان پر جانے کے لیے روانہ ہوا۔ چوبیس گھنٹے گزرنے کے باوجود واپس نہیں آیا تو اس کا باپ دکان پر گیا۔ دکان کے ملازم لڑکے نے اسے یہ بتا کر حیران کر دیا کہ صوفی تو ادھر پہنچا ہی نہیں۔ باپ بے حد پریشان ہوا بیٹے کو ڈھونڈ ڈھانڈ کر وہ رات کو اس امید پر گھر لوٹا کہ شاید وہ آ چکا ہو گا مگر اس کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ دو دن گھر والوں نے سخت پریشانی میں گزارے۔ اس دوران ایک قریبی گاؤں کے کھیتوں سے صوفی کی گھوڑی بھی آوارہ گھومتی ہوئی مل گئی...... گھر میں کل ہی سے رونا پیٹنا مچا ہوا تھا آج گھر والوں نے اس کا مرا ہوا چہرہ بھی دیکھ لیا۔ صوفی کے والد نے بتایا کہ صوفی نے دو شادیاں کر رکھی تھیں۔ ایک شادی بچپن میں ہو گئی تھی جبکہ دوسری اس نے اپنی

مرضی سے کی تھی۔ پہلی بیوی اس سے دو سال بڑی تھی۔ جبکہ دوسری دس سال چھوٹی تھی۔ دوسری بیوی بھی ساتھ آئی ہوئی تھی۔ میں نے پہلے اس سے سوال جواب کیے۔ اس کی عمر بمشکل بیس سال رہی ہوگی۔ خاصی خوبصورت تھی۔ رونے دھونے سے چہرہ اترا ہوا تھا میں نے محسوس کیا کہ پہلی بیوی کے مقابلے میں اسے شوہر کا زیادہ غم ہے۔ شاید اس لیے کہ وہ ابھی نئی نویلی تھی شادی کو فقط آٹھ دس مہینے ہی ہوئے تھے۔ اس کا نام عطیہ تھا۔ میں نے کہا۔

’’بی بی! تجھے کسی پر شک ہے؟‘‘

اس نے انکار میں جواب دیا لیکن اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ یہ جواب آخری نہیں ہے۔ اگر میں زور دوں تو وہ کسی نہ کسی پر شک کا اظہار کر سکتی ہے۔ میں نے کہا۔ ’’دیکھ بی بی! تُو مجھے شکل سے سمجھدار لگتی ہے میں نے تیرے شوہر کے قاتل کو ڈھونڈنا ہے۔ اس لیے ہر بات کا جواب ٹھیک ٹھیک دینا۔ گول مول جواب دینے سے کبھی کبھی بندہ خود بھی پھنس جاتا ہے۔‘‘

اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری میں نے کہا۔ ’’تیرے سسر نے بتایا ہے کہ متوفی کی دوسری شادی اپنی مرضی کی تھی۔ تُو نے اسے پسند کیا تھا یا اس نے تجھے؟‘‘

میری اس بات کے جواب میں عطیہ نے جو کچھ کہا اور اس کے کہے سے میں نے جو نتیجہ نکالا وہ یہ تھا کہ یہ شادی عطیہ کی پسند کا نتیجہ تھی۔ وہ کبھی کبھی اپنی ماں کے ساتھ کپڑا خریدنے کے لیے صوفی جمیل کی دکان پر جاتی تھی۔ صوفی کے اخلاق اور بول چال نے اسے بڑا متاثر کیا وہ اس سے محبت کرنے لگی۔ صوفی کی پہلی بیوی سے بچے تھے اور وہ ہنسی خوشی زندگی گزار رہے تھے۔ اس کے باوجود اس نے عطیہ سے شادی کی ہامی بھر لی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ چوری چھپے مل کر غیر اخلاقی اور غیر شرعی کام کریں۔ شادی کے بعد عطیہ کے اپنی سوکن سے تعلقات سوکنوں جیسے ہی تھے۔ گھر میں اکثر لڑائی جھگڑا ہو جاتا تھا اور کبھی کبھار نوبت مار کٹائی تک پہنچ جاتی تھی۔ یہ مار کٹائی زیادہ تر پہلی بیوی کے حصے میں ہی آتی تھی۔ میں نے عطیہ سے پوچھا کہیں ایسا تو نہیں کہ اس قتل میں اس کی سوکن کا ہاتھ ہو۔ وہ پہلے تو خاموش رہی پھر آنسو بہاتی ہوئی بولی۔

’’رسول بی بی کے بھائی ان کو اکثر دھمکیاں دیتے رہتے تھے چند روز پہلے انہوں نے گالی گلوچ بھی کی تھی۔‘‘

عطیہ کے بعد میں نے اس کی سوکن رسول بی بی سے بات چیت کی۔ وہ چونتیس پینتیس سال عمر کی تھی۔ اس کے چہرے پر مظلومیت اور آنکھوں میں آنے والے دنوں کا خوف تھا۔ وہ اپنے سب سے چھوٹے بچے کو جس کی عمر ڈھائی سال سے زیادہ نہیں تھی گود میں اٹھائے

ہوئے تھی۔ وہ ایک سیدھی سادی دیہاتن عورت تھی۔ اس نے وہی باتیں کیں جو اس کے دل میں تھیں۔ اس نے کہا کہ یہ عطیہ ڈائن بن کر میرے شوہر کو کھا گئی ہے۔ اس نے میرے شوہر پر تعویذ کر رکھے تھے وغیرہ وغیرہ۔

دونوں عورتوں کی باتیں سننے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ صوفی کے قتل میں اس کی دوسری شادی کا کوئی عمل دخل نہیں سوکنوں والا جھگڑا ان کے گھر میں ضرور تھا اور یہ بھی درست تھا کہ رسول بی بی کے بھائی متوفی سے لڑتے جھگڑتے رہتے تھے لیکن یہ معاملات اتنے بگڑے نہیں تھے کہ قتل تک نوبت آ جاتی...... اس سے پہلے آپ میرے ایک کیس ’’آخری بیوی‘‘ میں اس طرح کے حالات پڑھ چکے ہیں، تاہم یہ حالات بالکل مختلف نظر آ رہے تھے...... میں نے متوفی کے والد سے بھی سوالات کیے۔ اس نے کہا کہ صوفی کا بہت سے لوگوں سے لین دین تھا مگر کوئی ایسا جھگڑا نہیں تھا کہ اتنا بڑا اندھیر ہو جاتا۔ وہ بڑا ملنسار اور میل جول والا شخص تھا۔ اس کے دوست زیادہ اور دشمن کم تھے، اور جو تھے وہ بھی اس کی دینداری اور ایمانداری کو مانتے تھے۔

میں نے لاش پوسٹ مارٹم کے لیے شہر بھجوا دی اور متوفی کے گھر والوں کو بھی جانے کی اجازت دے دی۔ اس کے بعد میں نے رسول بی بی کے بھائیوں کو بلا کر ان سے بات چیت کی، اس کے علاوہ کھیت کے مالک بابے شفیع سے بھی سوال جواب ہوئے کوئی خاص نتیجہ نہیں نکلا۔

اسی روز شام کو ایک اجنبی شخص بلال شاہ کا رقعہ لے کر تھانے پہنچا۔ میں یہ جان کر حیران ہوا کہ بلال شاہ موقعہ واردات سے بھاگ کر کوئی بیس میل دور ہوشیار پور جا پہنچا تھا۔ یہ محبت نامہ اس نے وہیں سے لکھا تھا۔ اس نے قسمیں کھا کر بتایا تھا کہ وہ بالکل بے قصور ہے۔ اس کا خیال تھا کہ لڑکی کو سانپ وغیرہ نے ڈس لیا ہے۔ اس نے لکھا تھا کہ اگر لڑکی زندہ ہے تو اس سے پوچھا جائے وہ سب کچھ صاف صاف بتا دے گی......

اس کے علاوہ اس نے ایک رقعہ اپنی بیوی کے نام بھی لکھا تھا اور اسے کہا تھا کہ وہ اس کی نیلی شلوار میں نالہ ڈال کر ایک گرم چادر کے ساتھ حامل رقعہ ہذا کے ہاتھ بھیج دے۔ اسے ابھی واپس آنے میں ایک دو دن لگ جائیں گے۔

وہ بہت ڈرا ہوا نظر آتا تھا۔ میں اس کی حالت کا تصور کر کے مسکرانے پر مجبور ہو گیا۔ صبح کے وقت وہ ایک اونچی سی دھوتی پہن کر کھیتوں میں جاتا تھا۔ اسی دھوتی کے ساتھ اسے بھاگنے پر مجبور ہونا پڑا تھا اور وہ بھاگا بھی ایسا تھا کہ سیدھا ہوشیار پور جا پہنچا تھا۔ میں نے پیغام

لانے والے کو ایک جوابی رقعہ لکھ کر دیا جس میں بلال شاہ کو اطلاع دی کہ خیر سے مطلع صاف ہو گیا ہے اب وہ گھر واپس آ جائے اسے کچھ نہیں کہا جائے گا۔ میں نے لڑکی کے بے ہوش ہونے کی وجہ بتائی اور لاش کی برآمدگی کا ذکر بھی کر دیا تا کہ اسے کچھ تسلی ہو۔ میں نے اپنی گرم چادر اور شلوار قمیض، پیغام لانے والے کو دے دی اور کھانا وغیرہ کھلا کر اور کچھ روپے دے کر اسے واپس بھیج دیا۔

☆======☆======☆

تیسرے روز پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آ گئی۔ متوفی کی موت سر کے زخموں کی وجہ سے ہوئی تھی۔ کنپٹی پر آنے والا زخم جان لیوا تھا۔ متوفی کے جسم پر خراشوں کے نشان تھے اور ایک گھٹنے پر بھی گہری چوٹ تھی۔ جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ قاتل اور مقتول کے درمیان جدوجہد ہوئی ہے۔ رپورٹ کے مطابق قتل پیر کی شب بارہ اور آٹھ بجے کے درمیان ہوا تھا۔ پولیس سرجن نے ''رائے'' کے خانے میں خیال ظاہر کیا تھا کہ سر کے زخموں کے رخ اور انداز سے شبہ کیا جا سکتا ہے کہ ضارب نے آلہ قتل بائیں ہاتھ میں تھام رکھا تھا۔ عین ممکن ہے کہ وہ شخص بائیں ہاتھ سے کام کرنے کا عادی ہو۔

مکمل رپورٹ پڑھنے کے فوراً بعد میں راہوالی گاؤں روانہ ہو گیا۔ راہوالی میں اس وقت تک مقتول صوفی جمیل کا کفن دفن ہو چکا تھا۔ گھر والوں کے دماغ بھی کچھ پرسکون تھے۔ میں نے ان سے دوبارہ پوچھ گچھ شروع کی۔ عطیہ نے بتایا کہ اس کے شوہر نے جس دن دکان پر جانا ہوتا تھا وہ صبح بہت جلدی نکل جاتا تھا۔ سورج چڑھے وہ قصبے سے ہو کر واپس بھی آ جاتا تھا۔

اس قصبے کا نام شام گڑھ تھا۔ راہوالی سے شام گڑھ کوئی سات میل کی دوری پر تھا۔ گھوڑی پر یہ دو گھنٹے کی راہ تھی۔ راستہ صاف ستھرا تھا۔ اس راستے سے ایک دوسرا راستہ ہمارے گاؤں کی طرف نکلتا تھا۔ ایک ہفتہ پہلے پیر کی اس رات کو مقتول کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا تھا اسی راستے پر ہوا تھا۔ وہ اپنی دکان کی طرف جانے کی بجائے ہمارے گاؤں کی طرف مڑ گیا تھا اور کوئی دو میل فاصلہ طے کرنے کے بعد جوی کے اس کھیت تک پہنچا تھا۔ کیا وہ وہاں پہنچا تھا یا اسے لایا گیا تھا۔ اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا کہ وہ ہمارے گاؤں کی طرف آیا ہو وہاں اس کا کوئی جاننے والا تھا اور نہ اس کا کسی سے تعلق واسطہ تھا۔ شاید قتل کرنے والا یا کرنے والے اس کے پیچھے لگ گئے تھے اور وہ جان بچانے کے لیے اس طرف نکل آیا تھا لیکن وہ کون تھے؟ کوئی زمین کا تنازعہ، پیسے کا لین دین، عورت کا معاملہ کچھ بھی واضح طور پر سامنے نہیں آ رہا

تھا۔ اچانک میرے ذہن میں ایک بات آئی۔ میرے پوچھنے پر مقتول کی بیوی عطیہ نے بتایا تھا کہ صوفی کبھی کبھار پوری پانچوں نمازیں پڑھنے لگتا تھا اور کبھی نہیں بھی پڑھتا تھا لیکن ان دنوں صبح کی نماز بڑی باقاعدگی سے پڑھ رہا تھا اور کسی صورت قضا نہیں کرتا تھا۔ میں نے عطیہ سے پوچھا۔ ''اس روز صوفی کتنے بجے گھر سے نکلا تھا، ذرا سوچ کر ٹھیک بتاؤ۔''

وہ اپنی کلائی کی نئی نویلی سنہری گھڑی دیکھ کر بولی۔ ''میرا خیال ہے جی کہ اس وقت چار بجے تھے۔''

میں نے پوچھا ''تمہارا کیا خیال ہے وہ صبح کی نماز کے لیے کہاں رکا ہو گا؟''

وہ بولی۔ ''مجھے کچھ پتہ نہیں جی! پر وہ صبح کی نماز کے لیے رکے ضرور ہوں گے۔''

میں نے متوفی کے باپ سے کہا۔ ''آپ بتائیں بزرگوار! اگر وہ سوا چار بجے یہاں سے نکلا ہو تو صبح کی نماز باجماعت پڑھنے کے لیے کہاں رکا ہو گا؟''

صوفی کا باپ سوچ میں ڈوب گیا۔ کہنے لگا۔ ''تھانیدار جی! راستے میں کچھ نہیں تو دس پندرہ گاؤں تو پڑتے ہوں گے۔ تقریباً ہر گاؤں میں مسجد بھی ہے۔ کیا کہا جا سکتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''پھر بھی کوئی اندازہ لگائیں۔''

وہ دل ہی دل میں نماز کے وقت کا حساب لگا کر بولا۔ ''ہو سکتا ہے ماچھی پورہ یا سادھوکی میں رکا ہو۔'' اس کے ساتھ ہی بوڑھے کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ شاید بیٹے کی کوئی بات یاد آ گئی تھی۔

میں نے گھر والوں سے کچھ اور پوچھ گچھ کی، پھر اپنے اے ایس آئی کے ساتھ ماچھی پورہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ ماچھی پورہ کا فاصلہ وہاں سے چار میل تھا۔ دوپہر کے وقت ہم ماچھی پورہ پہنچے۔ مسجد کے امام صاحب سے ملے۔ ان سے تفصیلی بات چیت ہوئی مگر وہ صوفی جمیل کے بارے کچھ نہ بتا سکے۔ اس کے بعد ہم سادھوکی گئے۔ سادھوکی کی ساری آبادی مسلمانوں کی تھی مسجد بھی کافی بڑی تھی۔ مسجد کے امام صاحب سے ملے۔ انہوں نے فوراً ہمارے مطلب کی بات کی۔ انہوں نے بتایا کہ وہ جمیل کو اچھی طرح پہچانتے ہیں۔ انہوں نے اس کے سرمئی سویٹر اور لال مفلر کا خاص طور پر ذکر کیا۔ انہوں نے کہا۔

''یہ وہی جوان ہے نا جس کی شام گڑھ میں کپڑے کی ہٹی ہے۔'' میں نے اثبات میں جواب دیا۔ وہ بولے۔ ''وہ ہفتے میں ایک دو بار ہماری مسجد میں صبح کی نماز پڑھا کرتا ہے۔ وہ گھوڑی مسجد کے باہر باندھ دیتا تھا۔ میں نے اسے کہا تھا کہ وہ بائیں طرف والے کیکر کے ساتھ باندھا کرے۔ بڑا نیک جوان ہے پر آپ کیوں پوچھ رہے ہیں۔ وہ خیریت سے تو ہے

نا؟"

میں نے کہا۔"میں آپ کو سب کچھ بتاتا ہوں۔ پہلے آپ یہ بتائیں کہ پچھلے پیر اس نے یہاں نماز پڑھی تھی۔ میرا مطلب ہے تقریباً سات آٹھ دن پہلے۔"

مولوی صاحب سر کھجاتے ہوئے ذہن پر زور دینے لگے۔ پھر بولے۔"میرا خیال ہے وہ پیر ہی تھا...... ہاں پیر ہی تھا۔ مجھے یاد آ گیا۔ اس دن ہلکی بوندا باندی ہوئی تھی۔ اس نے گھوڑی سامنے تندور والی کے چھپر تلے باندھی تھی...... بوندا باندی ہو رہی تھی نا اس دن؟"

میرے حوالدار نے تصدیق کی کہ اس صبح دیر تک ہلکی پھوار پڑتی رہی تھی۔ اب یہ بات طے ہو گئی کہ اپنے قتل کی صبح صوفی جمیل اس مسجد تک پہنچا تھا۔ وہ راستہ جو ہمارے گاؤں کی طرف نکلتا تھا اس مسجد سے کوئی چار فرلانگ کی دوری پر تھا۔ اس کا مطلب تھا صوفی جمیل کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا وہ اس گاؤں میں پیش آیا یا اگلے چار پانچ فرلانگ کے رستے پر۔

میں نے امام صاحب سے کہا۔"محترم! بات یہ ہے کہ صوفی جمیل پیر کی رات قتل ہو گیا ہے اور اس کی لاش یہاں سے کوئی تین میل کے فاصلے پر پائی گئی ہے۔"

امام صاحب نے حیران ہو کر کہا۔"اچھا وہ لاش جو نالے پار کے کھیتوں میں ملی ہے؟"

میں نے اثبات میں جواب دیا۔ امام صاحب یہ جان کر ششدر تھے کہ یہ لاش صوفی جمیل کی تھی۔ کچھ دیر اس ناگہانی موت پر بات ہوتی رہی۔ امام صاحب اور گاؤں کے دوسرے "بڑے" حیران تھے کہ یہ کام کیسے ہوا۔ میں نے امام صاحب سے پوچھا۔

"اس رات گاؤں میں کوئی واقعہ ہوا ہو۔ میرا مطلب ہے کوئی چوری چکاری کوئی جھگڑا......؟"

امام صاحب سوالیہ نظروں سے دوسرے لوگوں کی طرف دیکھنے لگے۔ کسی کے ذہن میں ایسی بات نہیں آئی۔ ایک شخص نے عام سے لہجے میں کہا۔"بس چوہدری تلقین مرا تھا اس دن، پیر کی صبح مرا تھا اور منگل کی شام قل ہوئے تھے اس کے۔"

اس شخص کی بات نے مجھے چونکا دیا۔ گاؤں والے اپنے اپنے ذہنوں پر زور دے رہے تھے پھر ان کا اس بات پر اتفاق ہو گیا کہ "چوہدری تلقین" اس دن مرا تھا۔

"کیا ہوا تھا اسے؟" میں نے تیزی سے پوچھا۔

"نہیں نہیں پتر جی! تم غلط سمجھے ہو۔" امام صاحب نے کہا۔"یہ ایک علیحدہ معاملہ ہے، وہ نشئی تھا صبح سویرے چھپڑ کے کنڈے بیٹھا پیشاب کر رہا تھا کہ اندر جھوک کھا گیا۔ ٹھنڈا پانی تھا اکڑ کر مر گیا۔ صبح دیکھا تو لاش تیر رہی تھی۔"

امام صاحب دبی دبی آواز میں بات کر رہے تھے جیسے ڈر ہو کہ مسجد سے باہر کوئی سن نہ لے۔

میں نے پوچھا۔"یہ کس وقت کا واقعہ ہے؟"

ایک نمازی بولا۔"یہی نماز کا وقت تھا جی!"

میں نے کہا۔"امام صاحب! میں اس معاملے میں کسی طرح کی ڈھیل رکھنا نہیں چاہتا۔ آپ مجھے چوہدری تلقین اور اس کی موت کے بارے میں تفصیل سے بتائیں۔"

جواب میں امام صاحب اور دوسرے نمازیوں نے مل جل کر جو معلومات بہم پہنچائیں ان کا خلاصہ یہ ہے۔ چوہدری تلقین اچھا شخص نہیں تھا۔ ہر جوان عورت پر بری نظر ڈالتا تھا حالانکہ گھر میں تین عورتیں پہلے سے موجود تھیں۔ نشہ پانی بھی کرتا تھا کسی غریب کمزور کی عزت اس کے ہاتھ سے محفوظ نہیں تھی۔ چوہدری تلقین پانچ بھائی تھے۔ تلقین سب سے چھوٹا تھا اس کی عمر پینتالیس کے لگ بھگ تھی۔ بڑا بھائی کرم داد بہت شریف آدمی تھا۔ لوگ اس سے خوش تھے مگر اپنے بھائی کے خلاف وہ بھی کوئی بات نہیں سنتا تھا۔ اور یہی چاروں بڑے بھائیوں کی کمزوری تھی۔ وہ تلقین کو روکتے ٹوکتے تو شاید ہوں مگر کسی غریب کی بہن بیٹی کے لیے وہ آپس میں لڑائی کا خطرہ مول نہیں لیتے تھے گاؤں والے چوہدری تلقین سے بہت تنگ تھے شاید ان کی بددعائیں ہی اسے لے ڈوبی تھیں۔

مجھے یہ معاملہ پُراسرار محسوس ہونے لگا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ چوہدری کرم داد سے اس بارے میں پوچھ گچھ کرنی چاہیے۔ چوہدری تلقین کے بڑے بھائی کرم داد کو میں جانتا تھا۔ واقعی وہ ایک اچھا آدمی تھا۔ میں تین چار بار اس سے مل چکا تھا۔ وہ خاصا بارعب شخص بھی تھا۔ مسجد سے اٹھ کر ہم سیدھے کرم داد کی حویلی میں جا پہنچے۔ کرم داد نے گرمجوشی سے ہمارا استقبال کیا۔ حویلی کے احاطے میں ہی ہمارے لیے موڑھے رکھوا دیے اور چائے وغیرہ کا انتظام کیا۔ میں نے کرم داد اور اس کے بھائیوں کو وہ ساری باتیں بتائیں جو مسجد میں امام صاحب سے کہہ چکا تھا۔ چوہدری حیران ہو رہا تھا کہ میں یہ ساری باتیں اسے کیوں بتا رہا ہوں۔ انہیں چوہدری تلقین کی موت کے بارے میں کسی طرح کا کوئی شک نہیں تھا۔

میں نے پوچھا۔"چوہدری! تیرے بھائی کی موت کا واقعہ کتنے بجے ہوا تھا؟"

اس نے کہا۔"یہی کوئی ساڑھے چار پانچ کا ویلا تھا۔ کافی اندھیرا تھا ابھی۔"

میں نے کہا۔"اور میرا خیال ہے کہ صوفی جمیل کو بھی قریب قریب اسی وقت مارا گیا ہے۔"

وہ سب حیرانی سے میری طرف دیکھنے لگے کرم داد بولا۔ ''تھانیدار! تم کہنا کیا چاہتے ہو؟''

میں نے کہا۔ ''چوہدری کہیں ایسا تو نہیں کہ تمہارے بھائی کی موت اور صوفی جمیل کے قتل میں کوئی تعلق ہو۔''

وہ سارے گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ کرم داد نے مری مری آواز میں کہا۔ ''تعلق کیا ہونا ہے جی! بس اس کی آئی ہوئی تھی۔ بیمار رہتا تھا شراب اس کی دوائی بن چکی تھی۔ کچھ دن پہلے بھی صبح پیشاب کرنے نکلا تھا تو حویلی کے دروازے میں گر گیا تھا۔

میں نے کہا۔ ''آپ نے لاش کو غور سے دیکھا تھا۔ میرا مطلب ہے کوئی نشان وغیرہ تو نہیں تھا۔'' چوہدری نے انکار میں سر ہلا دیا مگر امام صاحب جو پاس ہی بیٹھے تھے اچانک کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گئے۔ میری نظروں سے ان کا یہ انداز چھپا نہیں رہا۔ مجھے شک ہوا کہ ان کا جواب چوہدری کے جواب سے مختلف تھا۔ یہ بات میں نے ذہن میں رکھ لی اور چوہدریوں سے مزید سوال جواب کرتا رہا۔ اس کے بعد میں نے حویلی سے باہر جا کر موقعہ دیکھا۔ وہ جوہڑ یا چھپڑ جس میں چوہدری تلقین گرا تھا حویلی کے باہری دروازے سے کوئی سو گز دور تھا۔ کناروں پر اونچی گھاس تھی۔ خمار زدہ شخص کنارہ ڈھونڈنے کی کوشش میں جوہڑ میں گر سکتا تھا۔ تاہم سوچنے کی بات تھی کہ جو شخص سو گز چل کر جوہڑ پر آ سکتا ہے وہ اتنا مدہوش تھا کہ پانی میں گرنے کے بعد باہر نکلنے کی کوشش بھی نہ کر سکا جبکہ جوہڑ کناروں کے پاس زیادہ گہرا بھی نہیں تھا۔ میں نے چوہدری کرم داد سے پوچھا کہ کیا وہ لوگ مجھے چوہدری تلقین کے وہ کپڑے دکھا سکتے ہیں جو اس نے پہنے ہوئے تھے۔ چوہدری نے کہا کہ ہمارے رواج کے مطابق مردے کے کپڑے جلا دیے جاتے ہیں۔

کچھ دیر بعد میں سادھوکی سے واپس آ گیا۔ بہر حال میری تفتیش کا اتنا اثر ضرور ہوا تھا کہ چوہدری اپنے بھائی کی موت کے بارے شک میں پڑ گئے تھے۔

☆======☆======☆

تھانے واپس آیا تو پتہ چلا کہ بلال شاہ اپنی جلاوطنی کے بعد واپس آ چکا ہے گاؤں پہنچ کر اس نے گاؤں والوں سے خوب خوب لڑائی کی تھی۔ خاص طور پر نمبردار کے لڑکے سے کافی تلخ کلامی ہوئی تھی۔ میں تھانے پہنچا تو وہ منہ پھلائے میرے ہی کمرے میں بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کی تیوری کچھ اور چڑھ گئی۔ سب کو برا بھلا کہنے لگا۔ دراصل اب وہ اپنے کیے پر خود ہی شرمندہ ہو رہا تھا۔ اصولاً اسے موقعہ سے بھاگنا نہیں چاہیے تھا۔ بھاگ کر وہ خواہ مخواہ گندا ہو

گیا تھا۔ حالانکہ اب سارا معاملہ صاف ہو چکا تھا پھر بھی اس کی شرمندگی نہیں جا رہی تھی۔ کھسیانی بلی کھمبا نوچے والی بات تھی۔ بہر حال میں نے سمجھا بجھا کر اسے رام کر لیا اور حوصلہ افزائی کے لیے فوراً ہی ایک کام بھی اس کے سپرد کر دیا۔ میں نے کہا کہ وہ اس وقت سادھوکی چلا جائے اور مسجد کے امام صاحب کو خاموشی کے ساتھ یہاں لے آئے۔

بلال شاہ گیا اور مغرب سے کچھ پہلے امام صاحب کو گاؤں لے آیا۔ امام صاحب نے کہا کہ وہ خود ہی یہاں آنے کا سوچ رہے تھے کیونکہ انہوں نے ایک ضروری بات کرنی ہے۔

میں نے کہا۔ ''مولوی صاحب! مجھے بھی تھوڑا بہت اندازہ ہو گیا تھا کہ آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں۔''

انہوں نے کہا۔ ''آہو پتر جی! اس وقت چوہدری پاس تھے بات میرے منہ میں آتے آتے رہ گئی۔''

میں نے کہا۔ ''تو اب فرما دیجیے۔''

انہوں نے کہا۔ ''پتر جی! میں نے چوہدری تلقین کی میت کو غسل دیا تھا، مجھے اس کے جسم پر ایک دو جگہ نشان سے نظر آئے تھے۔ اس وقت تو میں نے زیادہ غور نہیں کیا۔ پر آج دوپہر کو جب تم نے چوہدری سے اس بارے میں بات کی تو مجھے وہ نشان یاد آ گئے۔ ایک نشان تو اس کی ناف سے ذرا اوپر پسلیوں کے پاس تھا۔ گہرا نیل سا تھا۔ دوسرا نشان اس کی گردن پر تھا مگر سامنے کی طرف نہیں پچھلی طرف تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے گردن کی دائیں طرف انگوٹھا تھا اور دوسری طرف چاروں انگلیاں لگی ہوئی تھیں۔ میں نے سوچا شاید لاش کو چھپڑ سے نکالتے وقت یہ نشان پڑ گیا ہے مگر اب سوچ رہا ہوں لاش تو موت کے ڈیڑھ گھنٹے بعد نکالی گئی تھی، اس وقت نشان کیسے پڑ گیا۔''

امام صاحب کی باتیں میرے دل کو لگ رہی تھیں۔ یہ باتیں میرے شبہے کی تصدیق بھی کر رہی تھیں۔ میں نے کہا۔ ''مولوی صاحب! ذرا سوچ کر ٹھیک بتائیے کہ گردن پر انگلیوں کا نشان کس طرف تھا اور انگوٹھے کا کس طرف؟''

مولوی صاحب نے کچھ دیر سوچنے کے بعد وہی جواب دیا جو وہ اس سے پہلے دے چکے تھے۔ یعنی...... جہاں تک انہیں یاد پڑ رہا تھا انگوٹھے کا نشان دائیں طرف اور انگلیوں کا بائیں طرف تھا۔

امام صاحب کی بات سے پتہ چلتا تھا کہ متوفی کی گردن پر بائیں ہاتھ کا نشان تھا۔ پتہ نہیں کیوں میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ تلقین کی موت حادثہ نہیں قتل ہے اور صوفی کے قتل سے

اس کا گہرا تعلق ہے..... میں نے امام صاحب سے کہا کہ وہ جا کر چوہدریوں کو بھی یہ نشانوں والی بات بتا دیں تا کہ انہیں خواہ مخواہ بدگمانی نہ ہو کہ ان سے کچھ چھپایا جا رہا ہے۔ پھر میں نے انہیں شکریے کے ساتھ واپس بھیج دیا اور خود کوشش شروع کر دی کہ چوہدری تلقین اور صوفی جمیل کے درمیان کسی تعلق کا پتہ چل سکے۔ علاقے کے ایک دو باخبر افراد کو بلایا۔ اس کے علاوہ صوفی کے چند دوستوں اور اس کے والد صادق ارائیں سے بھی رابطہ قائم کیا۔ صادق ارائیں ''سادھوکی'' کے چوہدریوں کو ذاتی طور پر بھی جانتا تھا۔ اس نے کہا کہ میرے بیٹے کا ''سادھوکی'' کے چوہدریوں سے کوئی تعلق واسطہ نہیں تھا۔ صوفی کے چاروں دوستوں سے بھی ایسے کسی تعلق کا پتہ نہیں چلا۔ میرے ذہن میں ایک اور بات آئی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ صوفی جمیل نے چوہدری تلقین کو قتل ہوتے دیکھ لیا ہو اور قاتل اس کے پیچھے لگ گئے ہوں۔ وہ ان سے جان بچا کر بھاگا ہو اور انہوں نے اسے پکڑ کر ہلاک کر دیا ہو۔ یہ خیال ذہن میں آتے ہی مجھے محسوس ہوا کہ میں کسی نہ کسی سراغ تک پہنچ جاؤں گا۔ ایک ہی وقت میں، ایک ہی گاؤں میں موجود دو افراد پُراسرار طریقے سے مرے تھے۔ میں یہ مان ہی نہیں سکتا تھا کہ ان کی موت میں کوئی تعلق نہ ہو۔

میں انہی سوچوں میں گم بیٹھا تھا کہ ''سادھوکی'' کے چوہدری تھانے پہنچ گئے۔ بڑے بھائی کرم داد کے علاوہ دو چھوٹے بھائی اور ان کا ایک منشی رام لال بھی تھا۔ وہ سارے بڑے گم صم اور پریشان تھے۔ میں ان کی پریشانی کی وجہ سمجھ رہا تھا اور مجھے یہ بھی پتہ تھا وہ کیا کہنے والے ہیں۔ کرم داد نے کہا۔

''تھانیدار! تم نے ہمیں بھی شبہے میں ڈال دیا ہے اور تمہاری بات ہے بھی ٹھیک، اب مولوی قدیر نے بھی بتایا ہے کہ اس نے تلقین کے پنڈے پر کچھ نشان وغیرہ دیکھے تھے۔ اس کے علاوہ یہ منشی رام لال بھی ایک بات بتا رہا ہے۔'' پھر چوہدری نے رام لال سے کہا کہ وہ خود ہی وہ بات بتائے۔

رام لال دبلا پتلا ادھیڑ عمر شخص تھا۔ اس نے کہا۔ ''تھانیدار جی! چوہدری صاحب کی لاش پہلے میں نے ہی دیکھی تھی۔ اس وقت کافی روشنی ہو چکی تھی۔ چوہدری صاحب کے دیہانت سے ایک دن پہلے شام کے وقت میری عینک کا ایک چھوٹا سا پیچ چھپڑ کے پاس کہیں گر گیا تھا۔ میں صبح صبح حویلی سے نکل کر وہ پیچ ڈھونڈنے لگا۔ اس وقت بڑی باریک سی پھوار پڑ رہی تھی۔ مجھے دو تین جگہ گھوڑے کے سموں کے نشان نظر آئے۔ یہ نشان بالکل تازہ تھے۔ میں نے اس وقت سوچا بھی کہ یہ صبح ہی صبح چھپڑ پر کون آیا تھا۔ پھر میرا دھیان پانی کی طرف

چلا گیا اور چوہدری صاحب کی لاش دیکھ کر میں سب کچھ بھول بھال گیا.....''

منشی رام لال کی اطلاع ایک خاص طرف اشارہ کر رہی تھی۔ صوفی جمیل گھوڑی پر سوار تھا اور یہ عین ممکن تھا کہ نماز سے فارغ ہو کر وہ جوہڑ کی طرف آیا ہو۔

میں نے چوہدری کرم داد سے کہا۔ ''چوہدری! میں اپنے تجربے کی بناء پر کہہ سکتا ہوں کہ تمہارا بھائی اپنی موت نہیں مرا، اسے مارا گیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ مارنے والے نے بڑی صفائی سے کام کیا ہے اور کوئی شہادت نہیں چھوڑی۔ اب یہ سوچنا تمہارا کام ہے کہ اس کی جان کا دشمن کون ہو سکتا ہے۔ وہ سب پریشان نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ شاید انہیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کس کا نام لیں۔ چوہدری تلقین ایسا شخص تھا جسے کوئی بھی قتل کر سکتا تھا۔ پتہ نہیں کتنی بددعائیں اس کا پیچھا کر رہی تھیں۔ مگر کچھ بھی تھا جرم جرم تھا اور قاتل یا قاتلوں کا قانون کی گرفت میں آنا ضروری تھا۔ ان کے گرفت میں آنے سے ہی صوفی جمیل کی موت کا معمہ حل ہو سکتا تھا۔ میں نے صاف لہجے میں کہا۔

''چوہدری کرم داد! مجھے یقین ہے کہ تمہارے بھائی کو ڈبو کر مارا گیا ہے۔ اس کی گردن پر انگلیوں کے نشان یہ بات ظاہر کرتے ہیں کہ اس کی گردن دبا کر پانی میں غوطے دیئے گئے ہیں۔''

اپنے بھائی کی اذیت ناک موت کا تصور کر کے چوہدریوں کے چہرے مرجھانے لگے۔ کچھ بھی تھا بہرحال وہ ان کا چھوٹا بھائی تھا۔ میں نے پوچھا۔

''پچھلے ہی دنوں اس کا کسی سے کوئی جھگڑا وغیرہ تو نہیں ہوا؟''

کرم داد نفی میں سر ہلانے لگا۔ اس کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ بہت کچھ چھپا رہا ہے..... چوہدری سے ایک ڈیڑھ گھنٹہ مزید گفتگو ہوئی۔ یہ گفتگو چوہدری تلقین کے گرد ہی گھومتی رہی۔ تلقین کے ایک بھائی کا خیال تھا کہ اس کی قبر کھلوا کر پوسٹ مارٹم کروایا جائے جبکہ دوسرے بھائی ایسا کرنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ صوفی جمیل کے والد سے بھی ملے اور اس سے اکھڑی اکھڑی باتیں کرتے رہے۔ شاید انہیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کس پر شک کریں اور کس پر نہ۔ میں نے انہیں کہا کہ اگر وہ کسی پر پرچہ کرانا چاہتے ہیں تو کرا دیں مگر انہوں نے بتایا کہ وہ ابھی کچھ سوچنا چاہتے ہیں۔ اچانک میں نے ایک بات نوٹ کی اور بری طرح چونک گیا۔ چوہدری کرم داد کا بڑا بیٹا جس کا نام سراج احمد تھا بائیں ہاتھ کا استعمال کرتا تھا۔ وہ مجھے چہرے سے بھی کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ اس کے دائیں کان پر ایک لمبی سی خراش تھی اور کھرنڈ آیا ہوا تھا، جیسے چند روز پہلے چہرہ کسی دیوار یا زمین سے رگڑ کھا گیا ہو۔ ابھی تھوڑی

دیر پہلے چوہدری تلقین کی قبر کھلوانے کی بات ہوئی تھی تو سراج نے ہی زیادہ مخالفت کی تھی اوراس سے پہلے جب میں نے کرم داد سے متوفی تلقین کے کپڑے مانگے تھے تو سراج نے ہی بتایا تھا کہ انہیں آگ لگائی جا چکی ہے مجھے سراج پر کچھ شک سا ہونے لگا۔ مجھے ان لوگوں کے اندرونی معاملات کا زیادہ علم نہیں تھا لیکن قیاس کیا جا سکتا تھا کہ یہ قتل چچا بھتیجے کی کسی اندرونی دشمنی کا نتیجہ ہو؟ میں نے باتوں باتوں میں چھوٹے چوہدری سراج سے چند سوال پوچھے جن کے اس نے بظاہر تسلی بخش جواب دیے۔ میرا شک اس پر مدھم پڑنے لگا۔ میں نے ایک بار پھر چوہدری کرم داد سے کہا کہ اگر وہ کسی پر پرچہ کرانا چاہتے ہیں تو کرا دیں مگر وہ ایک روز کی مہلت چاہتے تھے۔

میں اچھی طرح جانتا تھا کہ تینوں بڑے چوہدری اندر سے بھرے ہوئے ہیں اور یہاں سے نکلتے ہی سیدھا اس شخص کی طرف جائیں گے جس پر انہیں سب سے زیادہ شک ہوگا۔ لہٰذا جونہی مجھ سے اجازت لے کر وہ تھانے سے باہر نکلے میں نے اپنے ہیڈ کانسٹیبل کو اشارہ کر دیا۔ وہ سادہ کپڑوں میں تھا اور اس کام کے لیے پہلے سے تیار تھا۔ اس نے اپنی ذاتی سائیکل نکالی اور بڑی ہوشیاری سے چوہدریوں کے تانگے کے پیچھے روانہ ہو گیا۔

اس کانسٹیبل نے اپنی رپورٹ مجھے اگلے روز صبح سویرے پہنچائی۔ وہ ساری رات اپنے فرض کی ادائیگی میں مصروف رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ چوہدری کرم داد کا تانگہ پہلے حویلی پہنچا۔ حویلی میں کرم داد کوئی دو گھنٹے تک رہا پھر وہ اپنے تانگے پر سوار ہو کر ایک طرف چل دیا۔ اس کے دو بھائی اور دو کارندے بھی ساتھ تھے۔ گاؤں سے نکل کر یہ لوگ کچے راستے پر آئے اور ماچھی پورہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس وقت رات کے نو بجے تھے اور سردی کی وجہ سے پورا علاقہ سنسان نظر آ رہا تھا۔ تانگہ ماچھی پورہ پہنچا اور سیدھا چوہدری کے گھر جا کر رکا۔ ماچھی پورہ کا چوہدری رحیم شاہ باہر آیا اور جپھی مار کر کرم داد سے ملا۔ پھر وہ سارے اندر چلے گئے۔ کچھ دیر بعد دو بکلوں والے بندے نکلے اور تیز تیز قدم اٹھاتے ایک گلی میں داخل ہو گئے۔ کانسٹیبل اپنی جگہ پر چھپا کھڑا رہا۔ دس پندرہ منٹ بعد وہی بکلوں والے بندے ایک نوجوان کو ساتھ لے کر حویلی میں داخل ہو گئے۔ نوجوان کچھ گھبرایا گھبرایا سا تھا۔ اس موقعے پر میرے کانسٹیبل نے سوچا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ حویلی کے اندر گھسنے کی وہ ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ حویلی سے باہر رہ کر کچھ پتہ نہیں چل سکتا تھا۔ اتنے میں قدرت نے اس کی مشکل آسان کر دی۔ اچانک حویلی کے اندر سے شور سنائی دیا اور پھر دو تین آدمی کسی کو پیٹتے ہوئے باہر نکلے۔ دراصل مار کھانے والا بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا مگر اس سے پہلے کہ وہ حویلی سے باہر نکلتا مارنے والے اسے پھر

کھینچ کر اندر لے گئے۔ یہ وہی نوجوان تھا۔ دس پندرہ منٹ بعد ایک بوڑھی عورت روتی ہوئی حویلی کے دروازے پر پہنچی۔ اس کے ساتھ دو مرد بھی تھے۔ وہ تینوں اندر چلے گئے۔ کافی دیر اندر رہنے کے بعد وہ باہر نکلے تو ایک مرد نے اپنی کمر پر اسی نوجوان کو اٹھا رکھا تھا جو تھوڑی دیر پہلے مار سے بچنے کے لیے بھاگا تھا۔ کانسٹیبل نے ہوشیاری سے ان کا پیچھا کیا اور گھر دیکھ لیا۔ وہ ماچھی پورہ کی لوہاروں والی گلی میں تیسرا یا چوتھا مکان تھا۔

میں نے اس روز شام تک انتظار کیا مگر چوہدری کرم داد اور اس کے بھائیوں میں سے کوئی بھی تھانے نہیں آیا۔ اس کا مطلب تھا وہ اپنے بھائی کے قاتل سے خود نبٹنا چاہ رہے تھے۔ ظاہر تھا کہ وہ جس کسی پر بھی شبہ کر رہے تھے اس کا نام تھانے میں بتانا نہیں چاہتے تھے۔ ہو سکتا تھا اس طرح ان کا کوئی اپنا راز فاش ہوتا ہے۔

اسی رات میں خود ماچھی پورہ پہنچ گیا۔ میں سادہ لباس میں تھا۔ اوپر سے چادر کی بکل مار رکھی تھی۔ میرے ساتھ وہی کانسٹیبل تھا جس نے کل رات سارا ماجرا دیکھا تھا۔ ہم کوئی دس بجے گاؤں میں داخل ہوئے پورا گاؤں سویا پڑا تھا۔ ٹھنڈی یخ ہوا میں آوارہ کتے بھی کونے کھدروں میں دبکے ہوئے تھے۔ ایک بڑے مکان کے دروازے پر پہنچ کر میرا کانسٹیبل رک گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر اپنی لاٹھی سے دستک دی۔ چوتھی پانچویں دستک پر دروازے کی دوسری جانب لالٹین کی روشنی نظر آئی اور کسی مرد نے ڈری ڈری آواز میں پوچھا کون ہے؟

میں نے کہا۔ ”میں تھانیدار ہوں نواز خاں! دروازہ کھولو۔“

غالباً وہ میری آواز پہچانتا تھا۔ بغیر حیل و حجت کے دروازہ کھول دیا۔ وہ ایک درمیانی عمر کا صحت مند شخص تھا۔ کانسٹیبل نے فوراً کہا۔

”جناب! کل یہی زخمی منڈے کو کمر پر لاد کر لایا تھا۔“

وہ سخت گھبرایا ہوا نظر آ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ”حوصلہ رکھ بھائی! تیری مدد کے لیے آئے ہیں۔ تجھے ڈرانے کے لیے نہیں.....“

وہ چونک کر بولا۔ ”آئیے.....آئیے..... جناب دھن ہمارے بھاگ کہ آپ نے قدم رکھا ہے۔“

صحن سے گزار کر وہ ہمیں ایک کشادہ کمرے میں لے آیا ساتھ والے کمرے میں عورتیں تھیں اور ان کی باتوں کی آواز آ رہی تھی۔ سامنے ہی کچے برآمدے میں چھپروں تلے آٹھ دس بھینسیں بندھی ہوئی تھیں اور ان کے گوبر کی بو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی دو اور آدمی بھی جو کچی نیند جاگ گئے تھے اندر آ گئے اور ادب سے مصافحہ کر کے ایک طرف بیٹھ گئے۔ ان تینوں میں

آ گو یعنی سیانا وہی شخص تھا جس نے دروازہ کھولا تھا۔ میرے پوچھنے پر اس نے اپنا نام سردار محمد بتایا۔ باقی دونوں میں سے ایک اس کا بہنوئی اور دوسرا بھائی تھا۔ میں نے سردار محمد سے پوچھا۔

''وہ لڑکا کہاں ہے جسے کل چوہدریوں نے مارا ہے؟''

سردار محمد آنکھوں پر صافہ رکھ کر رونے لگا۔ بولا۔ ''وہ اٹھنے کے قابل ہی کہاں ہے جی! مار مار کر اس کی ہڈیاں کھوکھلی کر دی ہیں ظالموں نے۔''

میں نے کہا۔ ''تم لڑکے کے کیا لگتے ہو؟''

وہ بولا۔ ''ہم دونوں ماموں ہیں، یہ اس کا باپ ہے۔''

میں نے کہا۔ ''تم نے رپورٹ کیوں نہیں کرائی؟''

وہ بولا۔ ''جی ہماری طاقت نہیں ہے۔''

کتنی سیدھی سادی بات کی تھی اس نے۔ دور دراز دیہات میں ''طاقت'' کے بغیر کون رپورٹ درج کرا سکتا ہے۔ وہاں رپورٹ درج کرانے کا مطلب اعلانِ جنگ کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔

میں نے کہا۔ ''بات کیا ہوئی تھی؟''

وہ بولا۔ ''جناب! آپ پوچھ رہے ہیں تو ہم آپ کی رعایا ہیں، بتانے سے انکار نہیں کر سکتے مگر اس کے بعد ہمارا والی وارث کون بنے گا؟ پچھلا تھانیدار......''

میں نے کہا۔ ''گھبراؤ نہیں اور پچھلے تھانیدار کی باتیں بھی چھوڑو، ہر ایک نے اپنی قبر میں جانا ہے۔''

وہ حیرت آمیز نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ غالباً سوچ رہا تھا کہ یہ کیسا تھانیدار ہے جو ماں، بہن کی گالیوں کی بجائے قبر حشر کی باتیں کر رہا ہے۔ آنسو پونچھ کر بولا۔

''تھانیدار صاحب! ہم بے قصورے مارے جا رہے ہیں آج کے دور میں کمزور ہونا بھی جرم ہے۔ چوہدری کرم داد کے بھائی نے ہم پر بڑا ظلم کیا ہے اور اس کی موت کے بعد اب رہی سہی کسر کرم داد خود پوری کر رہا ہے۔ کل میرے بھتیجے حسین محمد کو انہوں نے اتنا مارا ہے کہ کوئی کسی کالے چور کو کیا مارے گا۔ ہم روتے پیٹتے وہاں نہ جاتے تو شاید اسے جان سے ہی مار ڈالتے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس نے چوہدری تلقین کو پانی میں ڈبو کر مارا ہے۔ میں مسجد میں جا کر قرآن اٹھا سکتا ہوں کہ پچھلے دو ہفتے سے وہ بیچارہ گھر سے ہی نہیں نکلا۔ جب سے تلقین کے بندوں سے ہاتھا پائی ہوئی ہے، اس کی ماں نے اسے گھر میں قید رکھا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''سردار محمد! اس طرح کوئی بات میرے پلے نہیں پڑے گی۔ مجھے شروع

سے بتاؤ کہ یہ کیا واقعہ ہے اور کب شروع ہوا۔''

سردار محمد نے اپنے بہنوئی یعنی حسین محمد کے باپ سے کہا کہ وہ اپنی زبانی سب کچھ بتائے۔ حسین محمد کا باپ بالکل سیدھا سادا سکہ بند دیہاتی زمیندار تھا۔ اس نے بڑی سادگی سے کہنا شروع کیا۔

''جناب عالی! کافی پرانی بات ہے۔ میرا چھوٹا بھائی خان محمد اپنے بیٹے کے لیے میری بیٹی کا رشتہ مانگتا تھا۔ دراصل اس کی نظر اس چار ایکڑ زمین پر تھی جو میری بیٹی کے حصے آنی تھی۔ لڑکا اس کا کچھ کرتا کراتا نہیں تھا بس پکی سڑک پر سائیکلوں کی دکان ہے۔ آٹھ دس ٹوٹی پھوٹی سائیکلیں ہیں جنہیں کرائے پر چلاتا ہے۔ میں یہ رشتہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ پر وہ کہتا تھا کہ ہمارا باپ مرتے ہوئے یہ رشتہ جوڑ گیا ہے۔ آخر میں نے صاف انکار کر دیا۔ خان محمد اور اس کے بیٹے نے یہ بات دل میں رکھی اور موقعے کی اڈیک میں رہے۔ اصل میں خان محمد کا اٹھنا بیٹھنا چوہدری تلقین کے ساتھ تھا۔ اسی نے خان محمد کو یہ پٹی پڑھائی تھی کہ تم زبردستی یہ رشتہ کر لو۔ دو مہینے پہلے ''سادھوکی'' میں ایک شادی تھی۔ میری بیٹی بھی وہاں گئی ہوئی تھی۔ خان محمد بھی وہاں آ گیا اور میٹھی میٹھی باتیں کر کے اسے اپنے گھر لے گیا۔ اسی وقت مولوی بلا کر اس نے اپنے بیٹے کے ساتھ میری دھی کا نکاح پڑھوا دیا۔ ہمیں دوسرے روز پتہ چلا کہ ہماری لڑکی کی شادی بھی ہو چکی ہے۔ ہم وہاں گئے تو چوہدری تلقین کے آدمی ڈانگاں سوٹے لیے کھڑے تھے۔ خاں محمد نے کہا کہ اس نے کڑی شڑی کوئی نہیں دینی۔ اس کی شادی ہو گئی ہے وہ اب ادھر ہی رہے گی۔ ہماری لڑائی شڑائی ہو گئی۔ پانچ چھ بندوں کے سر پاٹے۔ چوہدری تلقین نے رائفل نکال لی اور کہا کہ ہم بھاگ جائیں ورنہ وہ ایک ایک کو گولی مار دے گا۔ ہم واپس آ گئے۔ کوئی دس پندرہ دن بعد حسین محمد کے خون نے جوش مارا اور وہ آٹھ دس بندے لے کر بہن کو چھڑانے کے لیے چلا گیا۔ پر چوہدری تلقین کے سامنے اس کی ایک نہ چلی۔ اس نے گولی چلا دی۔ دو بندے پھٹل ہوئے۔ حسین محمد کو بھی چوٹیں آئیں۔ اس کے بعد ہم نے حسین محمد کو گھر سے ہی نہیں نکلنے دیا...... کل رات ہمارے چوہدری رحیم شاہ کے دو بندے آئے اور حسین سے کہنے لگے کہ اسے چوہدری صاحب بلا رہے ہیں۔ ہماری بلا کو پتہ تھا کہ وہاں تلقین کے بھائی بھی آئے ہوں گے۔ حسین چلا گیا تو کچھ دیر بعد چوہدری رحیم شاہ کا ایک ہمسایہ آیا اور اس نے آ کر بتایا کہ حویلی میں تلقین کے بھائی بھی آئے ہوئے ہیں اور وہ سب مل کر حسین محمد کو مار رہے ہیں۔''

حسین محمد کے باپ نے سب کچھ بتا دیا تو میں نے حسین محمد سے ملنے کی خواہش ظاہر

کی۔ حسین کے ماموں نے دوسرے کمرے میں جا کر عورتوں کو کسی ساتھ والے کمرے میں بھیج دیا اور ہمیں حسین کے پاس لے گیا۔ حسین محمد کھدر کی رضائی اوڑھے لیٹا تھا۔ پاس ہی ایک لالٹین جل رہی تھی اور تپائی پر کچھ حکیمی دوائیاں پڑی تھیں۔ حسین ایک بیس بائیں سالہ خوش شکل نوجوان تھا مگر اس وقت چہرا بگڑا ہوا تھا۔ بائیں آنکھ نیلی ہو کر سوجھی ہوئی تھی ماتھے پر بھی پٹی نظر آ رہی تھی۔ میں نے اس سے بات چیت شروع کی۔ اس نے قسمیں کھائیں کہ چوہدری تلقین کی موت سے اس کا کوئی تعلق نہیں...... لیکن اس کی ایک بات مجھے شبے میں ڈال گئی وہ کہنے لگا۔

''تھانیدار صاحب! آپ تصدیق کرا سکتے ہیں کہ جس رات چوہدری تلقین مرا میں یہاں سے اٹھارہ میل دور اپنی پھوپھی کے گاؤں میں تھا......''

تھوڑی دیر پہلے حسین کے ماموں اور باپ نے کہا تھا کہ جب سے چوہدری تلقین وغیرہ سے جھگڑا ہوا ہے حسین کو اس کی ماں نے گھر سے ہی نہیں نکلنے دیا اور اب لڑکا خود کہہ رہا تھا کہ وہ واردات کے وقت گھر میں موجود نہیں تھا۔ میں چونکہ اچانک یہاں آیا تھا، اس لیے لڑکے اور لڑکے کے ماموں کے بیان آپس میں نہیں مل رہے تھے۔ میں نے حسین سے اس کی پھوپھی کے گاؤں کا اتہ پتہ پوچھا اور کچھ دیگر سوال کیے۔ اس دوران میں نے حسین سے اس کی بہن کے بارے میں بھی بات چیت کی۔ وہ رونے لگا اور بولا۔ ''ہمارے ساتھ بڑی زیادتی ہوئی ہے جی! کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں ہیں ہم۔''

میں نے حسین کے ماموں سے کہا کہ وہ لوگ صبح تھانے آ کر پرچہ درج کرائیں۔ میں تفتیش کرتا ہوں اور اگر ان کا دعویٰ درست نکلا تو میں لڑکی کو برآمد کرا لوں گا...... اتنے میں ایک عورت روتی ہوئی اندر آ گئی۔ غالباً وہ دروازے کے پیچھے کھڑی ہماری باتیں سن رہی تھی۔ جیسا کہ بعد میں پتہ چلا کہ وہ حسین کی ماں تھی۔ اس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

''بس تھانیدار جی! اب اس بات کو یہیں رہنے دیں۔ جو ہونا تھا ہو چکا اب جتنی مٹی اڑے گی ہمارے ہی سر میں پڑے گی۔ اس بدنصیب کی قسمت میں یہی لکھا تھا۔ اب یہی دعا ہے کہ وہ اپنے گھر میں خوش رہے۔'' پھر اس نے اپنے بھائیوں اور شوہر کو مخاطب کر کے کہا۔ ''میں تمہارے آگے بھی ہاتھ جوڑتی ہوں اب اس بات کو اور نہ بڑھاؤ۔ بیٹی تو ہی ہے اب میرے پتر کی جان کے لیے بھی کوئی سیاپا نہ ڈال دینا......'' حسین نے آنکھوں آنکھوں میں ماں کو جھڑک کر اشارہ کیا کہ وہ باہر چلی جائے۔ وہ جیسے آئی تھی ویسے ہی روتی ہوئی باہر چلی گئی۔ حسین کے باپ نے اٹھ کر دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ حسین کی

آنکھوں میں غصے کی لالی آ گئی ہے۔ پتہ نہیں ماں کو روتے دیکھ کر ایسا ہوا تھا یا اسے ماں کی باتوں سے اختلاف تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ لوگ پرچہ درج کرانا نہیں چاہتے۔ جب تک پرچہ درج نہ ہوتا میں کارروائی کیسے کر سکتا تھا۔

میں حسین کے پاس سے اٹھ کر جانے ہی والا تھا جب ایک چیز نے مجھے پکڑ کر بٹھا دیا۔ حسین نے تپائی پر رکھا ہوا ایک گلاس اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور مجھ پر انکشاف ہوا کہ وہ بھی ''کھبو'' ہے۔ یعنی بایاں ہاتھ استعمال کرتا ہے۔

☆======☆======☆

دوپہر کا وقت تھا میں تھانے میں بیٹھا دو پارٹیوں میں راضی نامہ کرا رہا تھا مگر میرا دماغ وہیں صوفی جمیل کے قتل کیس میں الجھا ہوا تھا۔ رہ رہ کر حسین محمد کا چہرہ ذہن میں آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک دوسرا چہرہ بھی تھا اور وہ تھا کرم داد کے بیٹے سراج کا۔ اس وقت یہی دونوں چہرے زیادہ مشکوک تھے۔ عجیب اتفاق یہ تھا کہ یہ دونوں افراد کھبو بھی تھے۔ جسمانی لحاظ سے وہ دونوں صحت مند تھے اور اتنے طاقتور ضرور تھے کہ چوہدری تلقین جیسے نشئی کو پانی میں ڈبو کر ہلاک کر سکتے۔ خاص طور پر سراج کے لیے تو ایسا کرنا قطعی مشکل نہیں تھا۔ یہاں میں ایک بات آپ کو بتا دوں۔ سراج حالانکہ کرم داد کا بیٹا تھا لیکن یہ نہ سمجھیں کہ وہ کوئی نوجوان شخص تھا۔ اس کی عمر کم از کم اڑتیس سال تھی۔ کرم داد کی اپنی عمر تقریباً ستر برس تھی...... میں کوشش کر رہا تھا کہ کسی طرح چچا بھتیجے یعنی تلقین اور سراج کے کسی اندرونی معاملے کی ٹوہ لگ سکے مگر ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی تھی۔

اسی دوران بلال شاہ نے ایک بڑا اہم کام انجام دیا۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے۔ ہوشیار پور سے واپسی کے بعد وہ بڑا شرمندہ شرمندہ پھرتا تھا۔ مجھے معلوم تھا اپنی شرمندگی دور کرنے کے لیے وہ کسی طرح نمبر بنانے کی کوشش کرے گا۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ پچھلے کچھ دنوں سے وہ ''سادھوکی'' میں مقیم تھا۔ سادھوکی میں مَیں نے اسے امام صاحب کو بلانے کے لیے بھیجا تھا، امام صاحب کے گھر میں ہی اس نے اپنی ایک چاچی ڈھونڈ لی تھی۔ کہتا تو یہی تھا کہ وہ میری رشتے کی چاچی ہے۔ بہر حال نہیں بھی تھی تو اس کے لیے ایک آدھ چاچی بنا لینا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ جب وہ کسی کو چاچی بنانے پر آ جاتا تھا تو پھر اس کی جان چاچی بن کر ہی چھوٹتی تھی۔ اس دفعہ اس نے امام صاحب کی ایک سالی کو چاچی بنایا تھا۔ یہ ایک علیحدہ قصہ ہے جس کا اس کیس سے تعلق نہیں، میں آپ کو بلال شاہ کی رپورٹ کے بارے بتا رہا تھا۔ اس نے مقامی لوگوں میں گھل مل کر دو بڑی اہم باتیں معلوم کی تھیں۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ اس نے ایک

کاشت کار کا کھوج لگایا تھا جس نے پیر کی صبح صوفی تلقین کو اپنی گھوڑی پر سوار ہمارے گاؤں کی طرف مڑتے دیکھا تھا۔ اس کاشت کار کا نام یٰسین تھا اور اس کا کھیت راستے کے عین اوپر تھا۔ یٰسین کو بلال شاہ اپنے ساتھ ہی لایا تھا۔ اس نے جو بیان درج کرایا وہ یہ ہے۔

''میرا نام یٰسین ولد نذیر علی ہے۔ میرا کھیت نمبرداروں کے ٹیوب ویل کے سامنے کچے راستے کے اوپر ہے۔ پیر مورخہ بیس دسمبر کی صبح منہ اندھیرے میں اپنے کھیت میں کام کر رہا تھا کہ میں نے کسی کے بھاگتے قدموں کی آواز سنی۔ دیکھا تو ایک گھوڑے والا تھا۔ وہ گھوڑے کو شتالے کے کھیت کے اندر سے بھگاتا ہوا بائیں طرف والے رستے پر مڑ گیا۔ اس کے تھوڑی دیر بعد ایک اور بھاگتے ہوئے گھوڑے کی آواز آئی۔ یہ گھوڑا سیدھا میرے کھیت کے اندر سے چلا آ رہا تھا۔ میں نے گھوڑے والے کو للکارا مگر وہ میری بات سنی اَن سنی کرتے ہوئے سیدھا نکل گیا۔ وہ پاس سے گزرا تو میں نے اس کی سفید گھوڑی پہچان لی۔ وہ راہوالی کا صوفی جمیل تھا۔ اس سے پہلے بھی وہ کبھی کبھی صبح کے وقت میرے کھیت کے سامنے سے گزرا کرتا تھا...... میں سمجھ گیا کہ وہ آگے جانے والے گھڑ سوار کا پیچھا کر رہا ہے۔ اس کے بعد مجھے کچھ پتہ نہیں چلا وہ دونوں کدھر گئے۔ تیسرے دن خبر ملی کہ نالے پار کے گاؤں سے کوئی لاش ملی ہے۔ اس وقت میرے دماغ میں بالکل نہیں آیا کہ یہ صوفی جمیل کی لاش ہو گی۔ صرف دو دن پہلے مجھے پتہ چلا ہے کہ اس رات صوفی جمیل قتل ہوا تھا۔''

اس بیان کی آخری سطریں درست نہیں تھیں۔ کیونکہ یٰسین نامی یہ شخص تیسرے روز ہی صوفی جمیل کے قتل سے باخبر ہو گیا تھا مگر پولیس تفتیش اور گواہوں وغیرہ کے خوف سے اس نے تھانے آ کر بیان دینے کی کوشش نہیں کی تھی...... اب یہ بلال شاہ کی حکمت تھی کہ اسے بولنے پر مجبور کر دیا تھا۔

یٰسین نامی اس شخص کا بیان بہت اہم تھا۔ اب تک ہم یہی سمجھ رہے تھے کہ اگر صوفی جمیل، چوہدری تلقین والے واقعے کی وجہ سے قتل ہوا ہے تو اس کی وجہ یہی ہو گی کہ اس نے چوہدری تلقین کو قتل ہوتے دیکھ لیا ہو گا، بعد میں قاتلوں نے گواہی ختم کرنے کے لیے اسے بھی مار ڈالا ہو گا مگر اس بیان سے یہ بات سامنے آئی تھی کہ قاتل صرف ایک تھا، اور قاتل نے صوفی کا پیچھا نہیں کیا تھا بلکہ صوفی اس کے پیچھے گیا تھا۔

یٰسین کے بیان کے علاوہ جو دوسرا کھوج بلال شاہ نے لگایا وہ خاصا اہم تھا۔ اس نے پتہ کیا تھا کہ اپنی موت سے تین روز پہلے، صبح سویرے حویلی کے سامنے چوہدری تلقین نے ایک نوجوان کو مارا پیٹا تھا۔ وہ نوجوان لڑکا چنگڑوں کے قبیل کا تھا۔ صبح چوہدری تلقین پیشاب

کرنے کے لیے حویلی کے دروازے سے نکلا تو یہ لڑکا حویلی کے آس پاس گھوم رہا تھا۔ چوہدری تلقین نے اسے پکڑ لیا اور کہا کہ تُو چوری کرنے کی نیت سے پھر رہا ہے۔ چوہدری کی آواز سن کر اس کے تین چار کارندے بھی آ گئے۔ انہوں نے چانن نامی اس لڑکے کو خوب مارا اور کپڑے وغیرہ پھاڑ دیے۔ یہ لڑکا اکثر گاؤں میں نظر آتا رہتا تھا مگر جب سے چوہدری قتل ہوا ہے اسے کسی نے نہیں دیکھا۔ اب معلوم نہیں وہ مار پیٹ کی وجہ سے غائب ہوا ہے یا کوئی اور معاملہ ہے۔

یہ معاملہ توجہ طلب تھا۔ بلال شاہ کے بیان کے مطابق چنگڑوں کی وہ بستی ''سادھوکی'' گاؤں سے ایک ڈیڑھ میل کے فاصلے پر تھی۔ میں نے اسی وقت اپنے ایس آئی کو چار سپاہیوں کے ساتھ بھیجا اور انہیں کہا کہ وہ لڑکے کو لے آئیں...... کافی انتظار کرنا پڑا۔ ایس آئی قریباً چار گھنٹے بعد واپس آیا لڑکا اس کے ساتھ تھا۔ اس کے ہونٹوں سے خون بھی بہہ رہا تھا۔ ایس آئی نے بتایا کہ اس نے بھاگنے کی کوشش کی ہے۔ میں نے لڑکے کو کرسی پر بیٹھنے کا حکم دیا وہ لاپرواہی سے بیٹھ گیا اور ہتھکڑی لگے ہاتھوں سے اپنے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔ کافی اجڈ سا تھا۔ میں نے اسے ڈانٹ کر تمیز سے بیٹھنے کا حکم دیا۔ میرے لہجے سے اس نے بڑا معمولی اثر قبول کیا۔ اس کی عمر بیس کے لگ بھگ تھی۔ جسم مضبوط تھا۔ پنڈلیوں تک لمبی قمیض اور دھوتی پہنے ہوئے تھا۔ ایک کان میں سونے یا پیتل کی مُرکی تھی۔

میں نے پوچھا۔ ''تمہارا نام؟''

''چانن...... سخی بادشاہ''

''کیا کرتے ہو؟''

''وہی جو ہمارے پیو دادا کا کام ہے کوڑا اکٹھا کرتے ہیں سخی بادشاہ اور کیا کرنا ہے۔''

میں نے اس جواب کی وضاحت چاہی تو پتہ چلا کہ وہ کوڑے کے ڈھیروں میں سے کام کی چیزیں اکٹھی کرتے ہیں۔ بعد میں اپنے سردار کے ہاتھ بیچ دیتے ہیں۔ اس سردار کو وہ لوگ ''بھائیا'' کہتے تھے۔ غالباً سودھوکی میں بھی چانن کا آنا جانا اسی ''کاروبار'' کے سلسلے میں تھا۔

میں نے پوچھا۔ ''تم بھاگے کیوں؟''

وہ بولا۔ ''سخی بادشاہ! میں بے قصور ہوں میں نے کچھ نہیں کیا۔ بڑی سے بڑی قسم لے لیں مجھ سے۔ میں مسلمان ہوں مسجد میں لے جائیں مجھ کو۔''

میں نے کہا۔ ''چوہدری تلقین سے تیری کیا بات ہوئی تھی۔'' پہلے تو وہ بالکل انجان بن

گیا۔ پھر سمجھ گیا کہ ہم جانتے ہیں اور چھپانا فضول ہے۔ اس نے اپنے انداز میں ساری بات بتا دی اور کہا کہ وہ کبھی کبھی صبح سویرے ہی کام پر نکل آتا ہے۔ سویرے سویرے کوڑے سے اچھی چیزیں مل جاتی ہیں۔ اس روز بھی وہ جھولا ڈالے اِدھر اُدھر گھوم رہا تھا کہ چوہدری بادشاہ نے پکڑ لیا اور کہا کہ تم چوری کی نیت سے ہو......

میں نے چانن کی ہتھکڑیاں کھلوا دیں اور اِدھر اُدھر کے تفتیشی سوال کرنے لگا۔ میں نے پوچھا۔ ''تمہارے پاس گھوڑا کہاں سے آیا ہے؟''

''کک...... کون سا گھوڑا؟'' وہ حیرانی سے بولا۔

''سنا ہے تمہارے پاس گھوڑا بھی ہے؟''

''کون سا گھوڑا جی! کہیں آپ میرے ابّے کے کھوتے کو تو گھوڑا نہیں کہہ رہے۔''

میں نے کہا۔ ''اچھا جاؤ وہ سامنے میز سے میری چھڑی اٹھا کر لاؤ۔'' میرا خیال تھا چھڑی کے نام پر وہ گھبرا جائے گا مگر اس کے چہرے سے کچھ ظاہر نہیں ہوا۔ اس نے چھڑی لا کر میرے سامنے رکھ دی۔ وہ عام لوگوں کی طرح داہنا ہاتھ استعمال کر رہا تھا۔

میں نے کوئی ایک گھنٹے تک اس سے مغز ماری کی حکمت اختیار کی۔ ڈرایا دھمکایا بھی مگر کچھ حاصل نہیں ہوا۔ آخر میں نے اسے جانے کی اجازت دے دی لیکن یہ بتا دیا کہ وہ زیر تفتیش ہے۔ مجھے بتائے بغیر کہیں نہیں جا سکتا اور جب بھی میں سنتری بھیجوں اسے فوراً آنا ہو گا۔ بھاگنے کے جرمانے کے طور پر میں نے اس سے پورے تھانے کی صفائی کروائی تا کہ اسے کچھ نصیحت ہو۔

☆======☆======☆

دس پندرہ دن مزید گزر گئے۔ تفتیش کا اونٹ کسی کروٹ نہیں بیٹھ رہا تھا۔ یہ بات یقینی تھی کہ قتل ہوئے ہیں اور دونوں قتل ایک ہی آدمی نے کیے ہیں مگر وہ آدمی کون ہے؟ کرم داد کا بڑا بیٹا سراج احمد؟ زبردستی بیاہے جانے والی لڑکی کا بھائی حسین محمد، اکھڑ مزاج چانن...... یا کوئی اور؟ میں نے ابھی تک کوئی گرفتاری نہیں کی تھی اور ایسے ظاہر کر رہا تھا جیسے یہ کیس داخل دفتر ہونے والا ہے لیکن صورتِ حال اس کے برعکس تھی۔ میں نے تینوں مشکوک افراد سراج، حسین اور چانن پر نظر رکھی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ بھی ایک دو افراد زیرِ مشاہدہ تھے۔

بلال شاہ ابھی تک ''سادھوکی'' میں اپنی 'چاچی' کے گھر میں تھا۔ چاچی پر اس نے کوئی ایسا جادو کر رکھا تھا کہ وہ اسے آنے ہی نہیں دیتی تھی۔ وہ تو بلال شاہ کے بال بچوں کو بھی اپنے پاس بلانے کا ارادہ رکھتی تھی مگر جب اسے بلال شاہ کے بچوں کی تعداد کا پتہ چلا تو جذبات

تھوڑے سے سرد ہو گئے تھے۔ میں نے بلال شاہ کے ذمے کام لگایا کہ وہ سودھوکی میں چوہدری سراج اور ماچھی پورہ میں حسین محمد کی حرکات و سکنات پر نظر رکھے۔ سادھوکی اور ماچھی پورہ کا فاصلہ اتنا زیادہ نہیں تھا اور بلال شاہ چاچی کے گھر کی روٹی ہضم کرنے کے لیے دو تین چکر بخوشی لگا سکتا تھا۔

چنگڑ چانن بھی مشکوک افراد کی فہرست میں تھا۔ تفتیش کے دوران اس نے میرے سوالوں کے جواب بڑے اعتماد سے دیے تھے۔ ویسے بھی وہ کھتّو نہیں تھا مگر اس پر میرا شک کم نہیں ہوا تھا۔ ہو سکتا تھا ہمارا یہ انداز غلط ہو کہ قاتل ایک ہی شخص ہے۔ اس صورت میں واردات کے وقت چانن کا کوئی کھتّو ساتھی بھی اس کا شریک ہو سکتا تھا...... اور یہ بھی ممکن تھا کہ ہمارا یہ مفروضہ ہی صحیح نہ نکلے کہ قتل کرنے والا کھتّو ہے۔ اندھیرے کا پردہ چاک ہونے تک کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا اور تفتیش کرنے والے کو بارہا ایسی گھمن گھیریوں سے گزرنا پڑتا ہے...... میں نے چانن کی نگرانی کے لیے ایک خاص مخبر کا انتظام کیا۔ یہ شخص ضلع جالندھر کا ایک اصلی چنگڑ تھا اور پولیس کے لیے کام کرتا رہتا تھا۔ (ایسے قبیلوں میں مخبری کرنے والا بڑی مشکل سے ہی ملا کرتا ہے) اس کا نام دلبر تھا۔ میں نے دلبر کو تمام ضروری ہدایات کے ساتھ سادھوکی کے نواح میں چنگڑوں کی اس بستی میں بھیج دیا۔ اس نے سردار سے مل کر کسی نہ کسی طرح بستی میں رہنے کا انتظام کر لیا۔

......قریباً ڈیڑھ مہینہ گزر گیا۔ دوسرے کیسوں کے ساتھ ساتھ اس کیس کی تفتیش بھی جاری رہی۔ میرے تھانے کے دو قبرستانوں میں دو قبریں بن چکی تھیں۔ ایک قبر ایک شریف دین دار شخص صوفی جمیل کی تھی اور دوسری ایک بدنام چوہدری تلقین کی۔ پیر کی اس ابر آلود رات کو ان قبروں کے لیے مُردوں کا انتظام کرنے والا شخص کون تھا؟ اس کا کھوج لگانا میری ذمے داری تھی۔ بلال شاہ وقتاً فوقتاً مجھ سے رابطہ قائم کرتا تھا۔ میں نے اسے ہدایت کر رکھی تھی کہ اگر چوہدری کرم داد کی طرف سے حسین محمد پر کوئی زیادتی ہو تو مجھے فوراً اطلاع دے۔ حسین محمد کی دکھیاری ماں کے آنسو مجھے نہیں بھولے تھے۔ اگر اس کا بیٹا مجرم بھی تھا تو کسی چوہدری کو یہ حق نہیں پہنچتا تھا کہ وہ اسے خود سزا دے۔ میں نے یہی بات کرم داد کے کانوں سے بھی اچھی طرح گزار دی تھی اور اسے سمجھا دیا تھا کہ حسین محمد کی بہن سے اس کے سسرال میں برا سلوک نہیں ہونا چاہیے...... میرا دوسرا مخبر دلبر بھی رات کے اندھیرے میں رازداری سے آ کر اپنی خیر خبر دے جاتا تھا۔ میں نے مشکوک افراد کو مکمل طور پر ڈھیل دے رکھی تھی اور ان کی طرف سے بالکل لاتعلق ہو گیا تھا۔ تاہم ایک روز میرے نہ چاہنے کے باوجود چانن چنگڑ سے

میری ملاقات ہوگئی۔ میرا اے ایس آئی کتے لڑانے کے الزام میں چند لڑکوں کو پکڑ کر لایا۔ ان میں چانن بھی تھا۔ شرطوں کے سارے پیسے بھی اس کے پاس تھے۔ اصولی طور پر پرچہ اس کے خلاف ہونا چاہیے تھا مگر میں نے دوسرے دو لڑکوں پر پرچہ کردیا اور چانن کو باقی ساتھیوں سمیت جانے کی اجازت دے دی۔ اس سنگین کیس میں چھوٹ جانے پر چانن خوش خوش واپس چلا گیا۔

اس واقعے کے صرف 24 گھنٹے بعد میرا مخبر دلبر چنگڑوں کی بستی سے ایک اہم خبر لے کر آیا۔ اس وقت رات کے نو بجے تھے دلبر ایک کمبل کی بکل مارے میرے گھر میں داخل ہوا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ کل کسی وقت میری چانن سے ملاقات ہوئی تھی۔ میں نے ہاں میں جواب دیا۔ وہ کچھ مطمئن ہوگیا اور تفصیل سے مجھے خبر سنانے لگا۔ اس نے کہا۔

''نواز صاحب! کل رات میں چانن اور ایک لڑکی دلاری کی بات چیت سننے میں کامیاب رہا ہوں۔'' (دلبر اس سے پہلے مجھے بتا چکا تھا کہ چانن کی قبیلے ہی کی ایک لڑکی پھولاں سے شادی ہو رہی ہے۔ دلاری کے بارے بعد ازاں پتہ چلا کہ وہ پھولاں کی گہری سہیلی ہے) دلبر نے کہا۔ ''کل رات کوئی آٹھ بجے میں نے چانن کو بستی سے نکل کر ایک طرف جاتے دیکھا۔ میں بھی اس کے پیچھے چل پڑا۔ وہ کماد کے کھیتوں میں پہنچا یہاں وہ لڑکی دلاری بھی آ گئی۔ دونوں نے باتیں شروع کر دیں۔ میں ان کے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا۔ ساری آوازیں مجھ تک پہنچ رہی تھیں۔ دلاری اپنی سہیلی پھولاں کا کوئی پیغام لے کر آئی ہوئی تھی۔ اس نے چانن سے کہا۔

''پھولاں تیرے لیے بڑی پریشان تھی۔ جب تک تُو تھانے سے واپس نہیں آ گیا وہ روتی ہی رہی۔ کیوں تُو نے ایسا کام کیا۔ تجھے تو پتہ ہی ہے وہ تھانیدار پہلے ہی تیری جان کا دشمن بنا ہوا ہے۔''

جواب میں چانن ہنسنے لگا۔ اس نے آپ کے لیے بڑے غلط سلط لفظ استعمال کیے اور کہنے لگا۔ ''وہ تھانیدار اتنے جوگا نہیں کہ چانن پر ہاتھ ڈال سکے۔ ایسے تھانیداروں کے تو میں سری پائے پکا کر کھا جاؤں۔''

پھولاں کی سہیلی بولی۔ ''اس نے تجھ سے پہلے والی بات تو نہیں کی۔''

چانن بولا۔ ''اتنا دماغ نہیں ہے اس کا اور وہ کرتا بھی تو میں نے کون سا کچھ بتانا تھا۔ لوہے کے صندوق جیسا ہے اپنا سینہ جو اس میں بند ہوگیا...... ہوگیا۔''

دلاری نے کہا۔ ''دیکھ چانن! پھولاں نے تجھے اپنی قسم دی ہے کہ اب سارے دھندے

چھوڑ دے پُلس ایک بار جس کا گھر دیکھ لے اسے اتنی جلدی نہیں بھولتی۔ یہ نہ ہو کہ بنا بنایا کھیل بگڑ جائے۔''

چانن بولا۔ ''اپنی سہیلی سے کہہ کہ جگرا ذرا بڑا رکھے اسے چانن سے نباہ کرنا ہے کسی ایرے غیرے نتھو خیرے سے نہیں۔''

اس کے بعد وہ دونوں شادی وغیرہ کے بارے میں باتیں کرنے لگے اور پھر چلے گئے۔

دلبر چنگڑ کی رپورٹ اس کیس کی اہم ترین رپورٹ تھی۔ اس نے چانن اور دلاری کی گفتگو کا جو نقشہ کھینچا تھا اس سے صاف پتہ چلتا تھا کہ چنگڑوں کی اس جھونپڑا بستی میں کوئی زبردست کھچڑی پکی ہوئی ہے۔ حالانکہ دلبر کو بستی میں رہتے ہوئے ایک مہینہ ہو چکا تھا اور وہ خاصا ہوشیار بھی تھا مگر اسے بستی کے اندرونی معاملات کی زیادہ خبر نہیں ہونے دی گئی تھی۔ یہ چنگڑ لوگ راز داری کے معاملے میں اپنے سگے باپ پر بھی اعتبار نہیں کرتے اور جو بستی کی بات باہر پہنچاتا ہے اسے سردار کی طرف سے سخت سزا دی جاتی ہے۔

مجرم کی گرفتاری میں پہلے ہی کافی دیر ہو چکی تھی میں نے سوچا کہ اب براہِ راست قدم اٹھانا چاہیے۔ دلبر کی رپورٹ کے مطابق چانن کی گرفتاری ضروری ہوگئی تھی مگر میں نے چانن کی بجائے پہلے دلاری پر ہاتھ ڈالا۔ اسے تھانے پہنچانے کا کام دلبر نے ایک اے ایس آئی کے ساتھ مل کر کیا۔ اسے معلوم تھا دلاری اپنے ''کار'' کے لیے کس طرف جاتی ہے (کوڑے سے اشیاء اکٹھی کرنے کو وہ لوگ ''کار'' کہتے تھے) وہ اپنے ''کار'' پر نکلی تو دلبر اور اے ایس آئی سادہ لباس میں اس کے پیچھے تھے جونہی وہ کار کرتے کرتے اپنی دو ساتھیوں سے علیحدہ ہوئی انہوں نے اسے پکڑ لیا اور سیدھا تھانے لے آئے...... تھانے پہنچ کر دلاری کا خوف سے برا حال ہوگیا۔ میں نے دیکھا وہ بڑے بھرپور جسم کی لڑکی تھی۔ اپنی میلی چیکٹ کھلی کھلی قمیض کے اندر اس نے جوبن کا خزانہ چھپا رکھا تھا۔ یہی خزانہ کسی امیر عورت کے حصے میں آیا ہوتا تو اس کے پاؤں زمین پر نہ ٹکتے۔ مجھے اس بیچاری کی حالت پر ترس آ رہا تھا مگر اپنے فرض سے مجبور تھا۔ میں نے اسے تھانیداری انداز میں مار پیٹ کی دھمکی دی تو وہ تھر تھر کانپنے لگی۔ میں نے دلبر کو اس کے سامنے کر دیا اور کہا۔

''دیکھ لڑکی! یہ پولیس کا آدمی ہے۔ کل اس نے تیری اور چانن کی ساری بات سن لی ہے۔ اب تم لوگوں کی کوئی بات راز نہیں رہی۔ اپنی جان بچانے کا تیرے پاس ایک ہی طریقہ ہے کہ اپنی زبان سے ساری باتوں کا اقرار کر لے۔'' وہ رونے لگی اور اپنے بھائیے یعنی سردار کو پکارنے لگی۔ میں نے کہا ''بھائیے کی جان کو مت رو اسے بھی تیرے سامنے ہی چھتر پڑیں

گے۔"

آدھ پون گھنٹے کی محنت کے بعد میں نے دلاری کو زبان کھولنے پر آمادہ کرلیا۔ اس نے رک رک کر اور آنسو بہا بہا کر جو کہانی سنائی وہ میں مختصراً آپ کو بتا دیتا ہوں۔ اس کہانی سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ خانہ بدوش قبیلوں کی اندرونی دنیا ہماری دنیا سے کتنی مختلف ہوتی ہے۔ ہماری بستیوں کے پاس رہتے ہوئے بھی وہ درحقیقت ہم سے کتنے دور ہوتے ہیں۔

پھولاں ایک خوبصورت جوان لڑکی تھی۔ ان کا قبیلہ پانچ چھ سال سے سادھوکی کے نواح میں رہ رہا تھا۔ دو سال پہلے کی بات ہے چوہدری تلقین کے ایک دودھ پیتے بچے کو دستوں کی شکایت ہوگئی۔ کسی حکیم نے کہا کہ اسے صرف بکری کا دودھ پلایا جائے۔ اتفاق سے گاؤں میں ایک بھی دودھ والی بکری نہیں تھی۔ بکری کی تلاش میں چوہدری کے آدمی چنگڑوں کی بستی تک پہنچ گئے۔ یہاں پھولاں کے باپ کے پاس دودھ والی بکری تھی۔ پھولاں کا چھوٹا بھائی روز دودھ لے کر حویلی آنے لگا۔ ایک روز سخت بارش ہو رہی تھی اس نے اپنے ساتھ پھولاں کو لے لیا۔ بہن بھائی بھیگتے ہوئے حویلی میں پہنچے۔ یہاں ڈیوڑھی میں چوہدری تلقین شراب کے نشے میں دھت بیٹھا تھا۔ پھولاں کو دیکھ کر اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ دونوں بہن بھائی دودھ دے کر واپس جانے لگے تو اس نے لڑکے کو دودھ کے پیسے دینے کے لیے دس روپے کا نوٹ دیا اور کہا کہ وہ ریزگاری لے آئے۔ لڑکا چلا گیا تو وہ کتا بن کر پھولاں پر جھپٹ پڑا اور ڈیوڑھی کے ساتھ ایک تاریک کمرے میں اس کی عزت کا دامن تار تار کر دیا۔ پھولاں عزت لٹا کر واپس چلی گئی۔ یہ بات کب تک چھپی رہتی۔ پوری بستی میں مشہور ہوگئی۔ لٹیرا کوئی عام شخص ہوتا تو جھونپڑا بستی والے اس کے ٹکڑے کر دیتے مگر وہ تھا چوہدری تلقین، جس کی پشت پناہی اس کے چار بھائی بھی کرتے تھے۔ اس پر ہاتھ ڈالنے کا مطلب پانچ چوہدریوں سے ٹکر لینا تھا۔

کچھ عرصہ بعد جھونپڑا بستی والے اپنا ڈیرہ اٹھا کر ایک اور گاؤں کے نواح میں چلے گئے۔ دن ہفتوں اور ہفتے مہینوں میں بدلے مگر پھولاں کے دل کا زخم وقت کے مرہم سے مندمل نہ ہو سکا۔ وہ اپنی بستی کی سب سے دلکش لڑکی تھی۔ اس کی منگنی بھی ہو چکی تھی۔ اس نے اپنے منگیتر سے کہا کہ وہ چوہدری تلقین کو قتل کر دے۔ اس کا منگیتر اب بھی اس پر فدا تھا مگر اسے حاصل کرنے کے لیے وہ پھانسی کے پھندے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ اس نے چوہدری تلقین کو قتل کرنے سے انکار کیا تو پھولاں نے اس سے شادی سے انکار کر دیا۔ اس نے علی الاعلان کہہ دیا کہ وہ اپنا آپ اس مرد کے حوالے کرے گی جو تلقین کو قتل کرے گا، ورنہ

ساری عمر ایسے ہی بیٹھی رہے گی۔ اس بستی میں اس کا ایک خاموش عاشق بھی تھا۔ اس کا نام چانن تھا وہ پھولاں سے تین چار سال چھوٹا تھا مگر عشق ذات پات، عمر اور خاندان کے فرق کو کب دیکھتا ہے۔ چانن نے دل میں عہد کرلیا کہ وہ پھولاں کے سر سے چوہدری تلقین کی گالی ضرور اتارے گا۔ وہ ہر وقت موقعہ کی تلاش میں رہنے لگا۔ یہ ایک لمبی روئیداد ہے کہ وہ اس موقعے تک کیسے پہنچا۔ بالآخر اس نے چوہدری تلقین کو جالیا اور پانی میں ڈبو کر ہلاک کر دیا۔

دلاری اس قتل کی تمام تفصیلات جانتی تھی۔ اس نے بتایا کہ پیر کی اس رات کو چانن چوہدری تلقین کی گھات میں بیٹھا تھا۔ وہ پیشاب کرنے کے لیے جوہڑ کے کنارے بیٹھا تھا اس نے اسے اندر دھکا دے دیا اور بعد میں ڈبو ڈالا۔ دلاری نے یہ بھی بتایا کہ چانن نے اس واردات کے لیے ایک قریبی گاؤں سے گھوڑا چرایا تھا۔ میں نے دلاری سے پوچھا۔ "چانن نے اور کچھ نہیں بتایا۔ میرا مطلب ہے چوہدری تلقین کو مارنے کے بعد وہ کہاں گیا؟"

دلاری نے کہا۔ "اس کے بعد اس نے کھولا ہوا گھوڑا واپس چھوڑا اور بستی میں آگیا۔"

میں سمجھ گیا کہ چانن کے دوسرے قتل کے بارے دلاری کو بھی علم نہیں۔ دلاری بری طرح رو رہی تھی۔ ہچکیوں سے اس کا سینہ ایسے دہل رہا تھا جیسے سمندر میں طوفان مچل رہا ہو۔ وہ چانن کا انجام اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"چانن اور پھولاں کی شادی کب ہو رہی ہے؟"

ولاری نے جواب دیا کہ ان کا بندھن تو ہو چکا ہے بس سہاگ رات گزارنی باقی ہے۔ سہاگ رات کے لیے اس نے کوئی عجیب سا لفظ استعمال کیا تھا جو میرے ذہن میں نہیں آرہا۔ ان لوگوں کے کچھ اپنے ہی رسم و رواج تھے۔

میں نے پوچھا۔ "کب ہے ان کی سہاگ رات۔"

وہ روتے ہوئے بولی۔ "کل" پھر اس نے میرے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

"تھانیدار صیب! وہ ایک دوسرے سے بڑا پیار کرتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے بنا مر جائیں گے۔ بڑا انتظار کیا ہے انہوں نے اس ویلے کا ان کو معاف کر دیں۔"

مجھے اس لڑکی پر ترس آرہا تھا۔ وہ اپنے لیے نہیں کسی اور کے لیے رو رہی تھی اور بڑے درد سے رو رہی تھی۔ میں نے کہا۔

"تو اس کا فکر کیوں کر رہی ہو۔ وہ تو بڑا شیش ناگ ہے اسے مجھ جیسا تھانیدار بھلا کہاں پکڑ سکتا ہے کل یہی کہا تھا نا اس نے؟"

وہ کوئی جواب نہ دے سکی اور مسلسل روتی رہی۔ میں کچھ دیر گہری سوچ میں رہا...... آخر

میں نے کہا۔ ''دلاری! صرف ایک صورت میں وہ اپنی سہاگ رات منا سکتے ہیں۔ تُو کل تک اپنی زبان بند رکھ۔ میرے آدمی ہر وقت تمہاری بستی کے پاس موجود ہیں۔ اگر تُو نے زبان کھولی اور چانن نے بھاگنے کی کوشش کی تو فوراً پکڑا جائے گا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسی جگہ گولی کھا کر مر جائے۔ ہاں اگر تُو کسی کو کچھ نہ بتائے اور جیسے آئی ہے ویسے ہی واپس چلی جائے تو میں چانن کو کل تک کی مہلت دے سکتا ہوں...... جو بات یہاں ہو رہی ہے وہ صرف تیرے اور میرے درمیان رہنی چاہیے۔''

دلاری نے کراہ کر کہا۔ ''تھانیدار صیب! کیا چانن کی جان بچ نہیں سکتی؟''

میں نے کہا۔ ''اس کا پتہ مجھے نہیں عدالت کو ہے۔ میں جو ڈھیل دے رہا ہوں یہ بھی میرے اختیار میں نہیں۔ بہرحال اگر تُو چپ رہ سکتی ہے تو بتا۔ ورنہ میں اپنا کام پورا کروں۔''

وہ میری بات کچھ کچھ سمجھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں خوف کے ساتھ ساتھ رضامندی بھی نظر آ رہی تھی۔

☆======☆======☆

......اور پھر چانن کی سہاگ رات گزر گئی وہ بھی پیر کی رات تھی جب چانن نے نہایت سفاکی سے دو قتل کیے تھے اور یہ بھی پیر کی رات تھی۔ صبح کے پانچ بجنے والے تھے میں نے اپنا گھوڑا درختوں کے ایک جھنڈ میں روکا۔ یہاں میرا اسب انسپکٹر ست نام سنگھ اپنے عملے کے ساتھ موجود تھا۔ تھوڑے ہی فاصلے پر چنگڑوں کی بستی نظر آ رہی تھی۔ ان کے کتے بھونک رہے تھے اور مرغے اذانیں دے رہے تھے۔ میں تھوڑی دیر سب انسپکٹر کے پاس کھڑا صورت حال دریافت کرتا رہا۔ جب گھڑی نے ٹھیک ساڑھے پانچ بجائے تو میں نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور عملے کے ساتھ بستی کی طرف بڑھا۔ ہمارا مخبر دلبر جاگ رہا تھا اس نے دور ہی سے چانن کے جھونپڑے کی طرف اشارہ کر دیا۔ جھونپڑے سے باہر ایک بانس سے لالٹین لٹک رہی تھی اور کچھ جھنڈیاں وغیرہ بندھی ہوئی تھیں۔ ایک بوہلی کتا بھی زنجیر سے بندھا غرا رہا تھا۔ میں نے جا کر جھونپڑے کا دروازہ کھٹکھٹایا دوسری تیسری دستک پر چانن باہر نکلا۔ اس نے صرف ایک دھوتی پہن رکھی تھی۔ ہمیں سامنے دیکھ کر وہ ٹھٹک گیا۔ یکا یک اسے صورتِ حال کی سنگینی کا احساس ہوا۔ اس کے چہرے کا رنگ بدلا۔ پھر اس نے بڑی پھرتی کے ساتھ مجھے دھکا دے کر بھاگنے کی کوشش کی لیکن میں اس حرکت کے لیے پہلے سے تیار تھا۔ جونہی وہ بھاگا میں نے بھاگ کر اسے عقب سے زوردار دھکا دیا وہ اپنی ہی جھوک میں کئی قلابازیاں کھا گیا۔ میرے سب انسپکٹر اور حوالدار نے لپک کر اسے چھاپ لیا۔ وہ

انہیں بڑی زبردست قسم کی گالیاں دینے لگا اور خود کو چھڑانے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔

اتنے میں جھونپڑے کے دروازے سے وہ لڑکی بھی چیختی ہوئی برآمد ہوئی جو اس سارے واقعے کا مرکزی کردار تھی۔ یعنی پھولاں! اس کا رنگ سانولا تھا مگر وہ واقعی خوبصورت تھی۔ اس نے چولی گھاگرا پہن رکھا تھا اور بال کھلے ہوئے تھے۔ ایکا ایکی ساری بستی جاگ اٹھی اور اس شور میں چانن کی بکواس دب کر رہ گئی۔

چانن کو تھانے لایا گیا۔ اگلے دن اس کا ریمانڈ مل گیا۔ دو تین روز میں اس نے سب کچھ بک دیا۔ چوہدری تلقین کے قتل کے بارے میں تو میں دلاری کی زبانی سن ہی چکا تھا۔ صوفی جمیل کے بارے میں چانن نے بتایا کہ جب وہ تلقین کو ٹھکانے لگانے کے بعد پانی سے نکل رہا تھا سفید گھوڑی والے جمیل نے اسے دیکھ لیا۔ اس نے پوچھا۔ ''اوئے کون ہے؟'' چانن دوڑ کر اپنے گھوڑے پر سوار ہو گیا اور بھاگ نکلا۔ جمیل نے بھی گھوڑے کی کاٹھی سنبھالی اور اس کے پیچھے آیا۔ دونوں میں کافی دوڑ ہوئی۔ چانن نے بہت پیچھا چھڑانا چاہا مگر موت صوفی جمیل کو پیچھے لیے چلی آ رہی تھی۔ چانن ہمارے گاؤں کی طرف مڑ گیا تو صوفی جمیل نے بھی گھوڑی اس طرف ڈال دی۔ آخر جوی کے اس کھیت میں پہنچ کر چانن کے گھوڑے کو ٹھوکر لگی اور وہ گر گیا۔ صوفی جمیل نے گھوڑی سے چھلانگ لگا کر اسے چھاپ لیا۔ دونوں میں ہاتھا پائی ہوئی۔ صوفی جمیل بھی کافی تگڑا تھا مگر چانن کے پاس ایک کلہاڑی بھی تھی۔ لڑتے بھڑتے اس نے یہ کلہاڑی الٹی طرف سے صوفی کے سر پر دے ماری صوفی ذرا سا ڈگمگایا تو چانن نے خود کو چھڑانے کے لیے ایک اور ضرب سر پر لگائی۔ صوفی جمیل کے حلق سے کراہ نکلی اور وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح کھیت میں ڈھیر ہو گیا۔ چانن سخت گھبرایا ہوا تھا کیونکہ دن چڑھنے والا تھا۔ اسے قریب ہی ایک چھوٹا سا گڑھا نظر آیا اس نے اپنی کلہاڑی سے اس گڑھے کو تھوڑا سا کشادہ اور گہرا کیا اور صوفی کی نبض ٹٹولنے کے بعد اس کی لاش کو گڑھے میں رکھ کر مٹی ڈال دی۔ اس کے بعد اس نے چرایا ہوا گھوڑا واپس چھوڑا اور اپنی بستی میں پہنچ گیا۔

چانن کے تفصیلی بیان سے ساری کڑیاں مل گئی تھیں لیکن ایک بات مجھے ابھی تک الجھن میں مبتلا کر رہی تھی۔ وہ ہاتھ والا چکر ابھی تک سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ اور دیگر شہادتوں سے اشارہ ملتا تھا کہ قاتل اپنا بایاں ہاتھ استعمال کرتا ہے جب کہ چانن دایاں کرتا تھا۔ یہ معمہ اس وقت حل ہوا جب گرفتاری کے تیسرے یا چوتھے دن ملزم چانن کو دائیں کندھے میں شدید درد ہوا۔ پوچھنے پر اس نے بتایا کہ کچھ دن پہلے یہ کندھا اتر گیا تھا اور ابھی تک پوری طرح ٹھیک نہیں ہوا۔ میں نے اس بارے میں مزید پوچھا تو انکشاف ہوا کہ یہ

کندھا اس وقت اترا تھا جب اپنے قتل سے صرف تین روز پہلے چوہدری تلقین نے چوری کے غلط شبے میں اس کی پٹائی کروائی تھی۔ اس کا مطلب تھا تین روز بعد جب چانن نے چوہدری کو قتل کیا اس وقت بھی اس کا دایاں بازو ٹھیک نہیں تھا۔ ظاہر ہے اس صورت میں اس نے کھبّو نہ ہونے کے باوجود بایاں ہاتھ استعمال کرنا تھا۔ پولیس سرجن نے بالکل درست اندازہ لگایا تھا اور میرا قیافہ بھی درست تھا۔

چوہدری سراج اور حسین محمد پر میرا شبہ غلط ثابت ہو چکا تھا۔ وہ دونوں بے قصور تھے۔ صوفی جمیل کی پہلی بیوی کے بھائیوں کا بھی اس قتل سے کوئی تعلق نہیں تھا جہاں تک صوفی جمیل کا تعلق ہے مجھے اس کی موت پر افسوس تھا۔ اس نے اپنی طرف سے ایک اچھا کام کرنے کی کوشش کی لیکن بے موت مارا گیا۔ سیانے کہتے ہیں کہ بندے کے کرم اس کے سامنے ضرور آتے ہیں۔ شاید صوفی جمیل کے سامنے بھی اس کا کوئی ایسا ہی کرم آ گیا تھا۔ تفتیش کے دوران مجھے معلوم ہوا تھا کہ صوفی جمیل فطرتاً ایک سخت مزاج شخص تھا اور پہلی بیوی کے ساتھ اس کا سلوک بہت خراب تھا۔ کیا معلوم اپنے ہی کسی معصوم بچے کی آہ اسے لے ڈوبی ہو۔ چانن نے اسے قتل کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ صرف اس سے پیچھا چھڑانا چاہا تھا مگر ضرب ایسی کاری لگی کہ وہ جانبر نہ ہو سکا...... چوہدری تلقین کے قتل میں تو کوئی الجھن والی بات ہی نہیں تھی۔ اس کو کسی کے ہاتھوں مرنا ہی تھا۔ اگر میرے بس میں ہوتا تو چانن کو اس قتل پر شاباش دیتا...... بلکہ میں نے اسے ''شاباش'' دی بھی تھی۔ یہ شاباش زبانی کلامی نہیں تھی۔ اسے اپنی محبوبہ کے ساتھ رات گزارنے کی مہلت دے کر میں نے اپنی ''خاموش شاباش'' کو عملی جامہ پہنایا تھا...... چانن کو دوہرے قتل کے الزام میں سزائے موت ہوئی......

☆======☆======☆

گونگی واردات

وہ شادی نہیں تھی ایک عورت سے ایک چوہدری کا انتقام تھا۔ نواز خاں اس انتقام کے آگے دیوار بننے کی جرأت کر بیٹھا۔

سردیاں ابھی شروع نہیں ہوئی تھیں۔ دوپہر کا وقت تھا۔ بلال شاہ لسی کے دو بڑے گلاس لے آیا۔ ایک گلاس اس نے میرے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ ''لو خاں صاحب! آج آپ بھی پئیں۔ پیڑوں والی لسی ہے سمجھیں آبِ حیات ہے۔ جگر کی گرمی کاٹ کر وہ پھینک دیتی ہے۔'' اس نے باقاعدہ انگلی سے اشارہ کر کے بتایا کہ جگر کی گرمی کٹ کر کتنی دور گرتی ہے۔

مونچھیں ہونٹوں سے ہٹا کر بلال شاہ نے لسی کے گلاس کو بڑی ہوس ناک نظروں سے دیکھا۔ پھر ایک دم جذباتی ہو کر اس کا بوسہ لے لیا۔ یہ بوسہ خاصا طویل ثابت ہوا۔ قریباً آدھی لسی بلال شاہ کے معدے میں چلی گئی۔ اس نے مونچھیں صاف کر کے نشیلی نظروں سے مجھے گھورا۔ ''پی لیں خاں صاحب! پی لیں اس کے بعد آپ کو ایک بڑی مزے دار خبر سناتا ہوں آپ کے چودہ طبق روشن ہو جائیں گے۔''

میں نے کہا۔ ''کیا خبر سننے کے لیے لسی پینا ضروری ہے؟''

وہ بولا۔ ''نہیں ایسا ضروری تو نہیں لیکن لسی پی کر آپ کو خبر سننے کا صحیح مزا آئے گا۔ لسی چیز ہی بڑے کمال کی ہے۔''

اس موقع پر بلال شاہ کی ہاں میں ہاں ملانا ضروری تھا۔ ورنہ وہ پٹری سے اتر بھی سکتا تھا۔ میں نے لسی پی لی۔ واقعی مزیدار تھی۔ ایسی لسی پی کر بندہ شام تک ہل چلاتا رہے تو بھی بھوک نہ لگے لیکن میں جانتا تھا بلال شاہ ابھی دو گھنٹے بعد پھر پیٹ پر ہاتھ پھیرنے لگے گا...... میں نے کہا۔ ''ہاں بھئی بتاؤ اب...... کیا خبر ہے؟''

وہ کئی گز لمبا ڈکار مار کر بولا۔ ''خبر یہ ہے جناب...... کہ بس کمال ہی ہو گیا ہے۔ نمبردار رمضان کی چھوٹی بہن نے شہر جا کر نذر حسینی کے منڈے صدیق سے شادی رچالی ہے۔ کسی کو

کانوں کان خبر نہیں ہوئی۔ اب خیر سے دولہا دلہن شہر سے بھی غائب ہو گئے ہیں۔ پتہ نہیں کس طرف گئے ہیں۔ یہ اطلاع کل شام خیرو قصائی نے لا کر دی تھی۔ اس وقت سے نمبردار اور اس کے بندے پاگل کتوں کی طرح ان دونوں کو ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔''

میں نے حیرانی سے یہ اطلاع سنی۔ نمبردار رمضان اس قصبے اور اردگرد کے دیہات کا سب سے معزز شخص سمجھا جاتا تھا۔ جبکہ نذر حسینی ایک عام سا کاشت کار تھا۔ ایسا غریب نہیں تھا لیکن اتنا امیر بھی نہیں تھا۔ دیہات میں کسانوں کی اولاد عموماً زیادہ ہوتی ہے لیکن حسینی کے صرف دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ ایک بیٹا شہر میں نوکر تھا جبکہ دوسرا یہاں کھیتی باڑی کرتا تھا۔ اسی کا نام صدیق تھا۔ اونچا لمبا خوش شکل نوجوان تھا۔ شکل سے بڑا بھلا مانس نظر آتا تھا۔ لگتا نہیں تھا کہ ایسا کام کر سکتا ہے۔ بہر حال بلال شاہ کو جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی۔ بلال شاہ نے اس واقعے کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا کہ لڑکی پچھلے سات آٹھ روز سے غائب تھی لیکن نمبردار اور اس کے خاندان والوں نے بات باہر نہیں نکلنے دی۔ بس خاموشی سے اسے تلاش کرتے رہے۔ خیرو قصائی کل کھالیں بیچنے کے لیے جالندھر گیا ہوا تھا۔ وہیں پر اسے صدیق نظر آیا۔ وہ ایک برقعے والی لڑکی کے ساتھ تانگے میں بیٹھا ہوا تھا برقعے کے نیچے لڑکی کی گوٹے والی سرخ شلوار اور چمکدار جوتی نظر آ رہی تھی۔ صدیق نے بھی نئے نکور کپڑے پہن رکھے تھے۔ خیرو قصائی کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ دونوں دولہا دلہن ہیں۔ کچھ آگے جا کر تانگہ بس سٹاپ پر رک گیا۔ لڑکی نے چہرے سے نقاب کھسکایا اور سنبھل سنبھل کر نیچے اترنے لگی۔ اس وقت خیرو نے پہچان لیا۔ وہ نمبردار رمضان کی بہن سلمیٰ تھی۔ خیرو نے قصبے میں واپس آ کر یہ خبر اپنے بھائی کو بتائی۔ بھائی نے اپنی بیوی سے ذکر کیا۔ بیوی نے پڑوسیوں کو بتایا۔ تھوڑی دیر میں کانوں کان یہ خبر پورے قصبے میں پھیل گئی۔ آج صبح سویرے نمبردار رمضان اس کا چھوٹا بھائی راجہ انور ان کا بہنوئی سلیمان اور آٹھ دس بندے مفرور جوڑے کو ڈھونڈنے نکل گئے تھے۔ ابھی تک ان کی واپسی نہیں ہوئی تھی۔

پوری خبر سننے کے بعد میں نے کہا۔ ''بلال شاہ لسی تو تم نے سُستی والی پلائی ہے اور خبر چُستی والی دے رہے ہو۔ بڑا غلط جوڑ ملایا ہے تم نے۔ ایسی خبر کے ساتھ تو تمہیں کڑک چائے پلانی چاہیے تھی۔ اب مجھے تو آ رہی ہے نیند...... اگر قصبے میں کوئی گڑ بڑ ہوئی تو تم خود ہی سنبھال لینا۔''

''کیا مطلب؟'' بلال شاہ نے آنکھیں گھمائیں۔

''مطلب یہ کہ...... اگر حالات ویسے ہی ہیں جیسے تم نے بتائے ہیں تو عین ممکن ہے کہ

شام تک یا آج رات کسی وقت دونوں پارٹیوں میں ٹاکرا ہو جائے۔ ایک دو بندے زخمی ہو جائیں یا مر جائیں۔ ایسے موقعوں پر بڑی پسوڑی پڑ جاتی ہے...... بڑی ہوشیاری سے معاملے کو سنبھالنا پڑتا ہے...... لیکن میری ساری ہوشیاری تو غرق ہو گئی ہے تمہاری لسی میں۔"

بلال شاہ مسکرا کر بولا۔ "دیکھیں جی! الفاظ ہوتے تو میں واپس لے لیتا مگر لسی تو واپس نہیں لی جاسکتی ناں۔ اب آپ کہیں تو میں آپ کو کڑک چائے پلوا دیتا ہوں......"

ابھی ہم باتیں ہی کر رہے تھے کہ ایک شخص تیز تیز قدموں سے اندر داخل ہوا۔ یہ قصبے کا پہلا نمبردار خوشی محمد تھا۔ خوشی محمد اب کافی بوڑھا ہو چکا تھا تاہم قصبے کے حالات پر اس کی گہری نظر رہتی تھی۔ اس نے بڑے رازدارانہ لہجے میں ہمیں بتایا کہ نمبردار کی حویلی میں "زبردست کھچڑی" پک رہی ہے۔ وہ لوگ نذر حسینی کے گھر پر حملہ کر دیں گے۔ دوسری طرف نذر حسینی نے بھی پندرہ بیس بندے اکٹھے کر کے اپنے گھر کی بیٹھک میں بٹھائے ہوئے ہیں۔ اگر دونوں پارٹیوں کو فوری طور پر روکا نہ گیا تو زبردست خون خرابہ ہو سکتا ہے۔

سابقہ نمبردار خوشی محمد کی یہ اطلاع بہت اہم اور بروقت تھی۔ اب ضروری ہو گیا تھا کہ میں فوری طور پر کارروائی کروں اور اپنے تھانے کی حدود میں ہونے والے خون خرابے کو روک لوں۔ میں نے اسی وقت گارد تیار کی اور کیل کانٹے سے لیس ہو کر نمبرداروں کی حویلی میں پہنچ گیا۔ حویلی کے احاطے میں دس پندرہ گھوڑے موجود تھے اور چارپائیوں پر چند خطرناک صورتوں والے مسلح افراد بیٹھے تھے۔ ان میں سے کچھ قصبے کے تھے اور کچھ مضافات کے، میری آمد کا سن کر نمبردار خود بھی احاطے میں آ گیا۔ اس کی عمر تیس بتیس برس کے قریب تھی بے حد گھنی مونچھیں، سرخ و سپید رنگت اور بادامی آنکھیں۔ وہ اس وقت غصے میں بھرا ہوا تھا۔ آنکھوں سے جیسے چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگا۔

"تھانیدار! تم اس معاملے میں مت آؤ۔ نذر حسینی کے بیٹے نے میری عزت پر وار کیا ہے اور اس وار کا جواب بھی میں خود ہی دوں گا۔"

میں نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ "میں اس معاملے میں کیسے نہ آؤں رمضان علی۔ یہ میرا تھانہ ہے یہاں ہونے والے ہر غیر قانونی کام کی ذمے داری مجھ پر آتی ہے۔ اگر نذر حسینی کے بیٹے نے کوئی جرم کیا ہے تو اس کی سزا اسے ضرور ملے گی میں تمہیں قانون سے کھیلنے کی اجازت نہیں دوں گا۔"

اسی شام میرے مشورے پر قصبے کی پنچایت بیٹھی۔ پنچوں نے دونوں فریقوں کے معتبر افراد کو سامنے بلایا اور تسلی سے ان کی بات سنی۔ میں تھانے میں تھا تاہم بلال شاہ مجھے پل پل

کی خبر لا کر دے رہا تھا۔ شام کو شروع ہونے والی یہ پنچایت رات گیارہ بجے تک جاری رہی۔ اس دوران ایک دو بار جھگڑا ہونے کا خدشہ بھی پیدا ہوا لیکن جھگڑے کی نوبت نہیں آئی۔ میں نے احتیاطی طور پر اپنے پانچ چھ سادہ پوش پنچایت میں بھیج رکھے تھے۔ ان میں میرا اے ایس آئی باجوہ بھی تھا۔ میں نے اسے ہدایت کر رکھی تھی کہ وہ کسی صورت میں خون خرابہ نہ ہونے دے۔

رات گئے پنچایت ملتوی کر دی گئی...... پنچایت کے آخر میں دونوں فریقوں نے وعدہ کیا کہ وہ کوئی فیصلہ ہونے تک خون خرابے سے دور رہیں گے۔ اگلے روز بعد دوپہر پھر پنچایت کی کارروائی شروع ہوئی۔ تین چار گھنٹے کی بحث تکرار کے بعد آخر دونوں پارٹیوں میں راضی نامہ ہو گیا۔ یہ راضی نامہ مشروط تھا، اور شرط یہ تھی کہ نمبردار کی بہن سلمٰی کے بدلے نذر حسینی اپنی بیٹی خالدہ کا رشتہ نمبردار کے چھوٹے بھائی راجہ انوار کو دے گا۔ درحقیقت اس بات کا فیصلہ کل ہی ہو گیا تھا۔ جھگڑا صرف یہ تھا کہ نکاح کب ہو گا۔ نمبرداروں کا اصرار تھا کہ نکاح ابھی کر دیا جائے اور رخصتی دو تین ماہ بعد دے دی جائے۔ جبکہ نذر حسینی کا کہنا تھا کہ تین ماہ بعد فصل کی کٹائی پر نکاح اور رخصتی کا کام ایک ساتھ کر دیا جائے گا۔ آخر آج فیصلہ ہو گیا تھا۔ ٹھیک دو ماہ بعد نکاح اور رخصتی کی تاریخ طے کر دی گئی تھی۔

یہ فیصلہ بظاہر عجیب نظر آتا ہے لیکن دیہات میں جھگڑوں کا فیصلہ عموماً اسی انداز میں کیا جاتا تھا اور آج بھی کیا جاتا ہے۔ خاص طور پر پنچایتوں میں ہونے والے فیصلے اسی قسم کے ہوتے ہیں۔ یہاں ایک بات کا ذکر کرنا میں ضروری سمجھتا ہوں، راجہ انوار جس سے خالدہ کی بات طے ہوئی تھی ایک بازو سے محروم تھا۔ چند برس پہلے ایک جھگڑے میں اسے گولی لگی تھی اور دایاں ہاتھ کاٹنا پڑ گیا تھا۔ شاید اپنے بھائی کی اسی معذوری کو سامنے رکھتے ہوئے نمبردار رمضان نے نذر حسینی سے اس کی خوبصورت بیٹی کا رشتہ مانگ لیا تھا۔ پرانے رسم و رواج میں جھگڑے نبٹانے کی خاطر عورت کی قربانی دینے کا طریقہ بہت پرانا ہے۔ یہ تو تقسیم ہندوستان سے پہلے کی بات ہے، آج بھی پاکستان کے مختلف علاقوں میں اس قسم کی رسمیں موجود ہیں۔

☆======☆======☆

یہ کوئی ایک ماہ بعد کی بات ہے۔ راجہ انوار تھانے میں میرے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ وہ آج کل ایک پلاٹ کے چکر میں پڑا ہوا تھا۔ قصبے کے قبرستان کے پاس یہ قریباً تین کنال زمین تھی۔ عرصہ پانچ چھ برس سے نمبردار یہاں اپنے مویشی باندھ رہے تھے۔ اب زمین کا اصل مالک لاہور سے واپس آ گیا تھا۔ وہ اپنی زمین واگزار کرانا چاہتا تھا جبکہ نمبرداروں کی نیت

خراب ہو چکی تھی۔ راجہ انوار دو تین دفعہ میرے پاس آ چکا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں اس معاملے میں ان کی سائیڈ لوں۔ میرے لیے ایسا کرنا ممکن نہیں تھا۔ کیونکہ میں صاف طور پر دیکھ رہا تھا کہ وہ ناجائز بات کر رہے ہیں۔ راجہ انوار کافی دیر میرے پاس بیٹھا اس معاملے پر بات چیت کرتا رہا جبکہ اس کا پستول بردار گونگا ملازم باہر اسٹول پر بیٹھا جمائیاں لیتا رہا۔ راجہ انوار اپنے بڑے بھائی نمبردار رمضان سے قریباً چھ برس چھوٹا تھا لیکن چہرے پر پختگی تھی اور دنیاداری کی سوجھ بوجھ میں اپنے بھائی سے کسی طرح بھی کم نہیں تھا۔ بڑے بھائی کی طرح اس کا رنگ بھی سرخ و سپید تھا لیکن وہ خوبصورت نہیں تھا۔ رہی سہی کسر اس کے جسمانی عیبوں نے پوری کر دی تھی۔ نہ صرف ایک بازو کٹا ہوا تھا بلکہ چہرے پر بھی کلہاڑی یا کسی تیز دھار آلے کا گہرا زخم موجود تھا۔ صاف اندازہ ہوتا تھا کہ نذر حسینی نے مجبوری کے سبب اسے اپنی بیٹی کا رشتہ دیا ہے ورنہ وہ کسی طرح اس لڑکی کے قابل نہیں تھا۔ میں نے باتوں باتوں میں راجہ انوار سے پوچھا۔

''ہاں بھئی! کب چاول کھلا رہے ہو شادی کے؟''

وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ ''چاول شاول تو نہیں پکیں گے جی! لیکن آپ کو ضرور کھلا دیں گے۔''

میں نے پوچھا۔ ''کیا مطلب ہے چاول کیوں نہیں پکیں گے؟''

اس کے چہرے پر ایک دم گہری سنجیدگی طاری ہو گئی۔ زہریلے لہجے میں بولا۔ ''یہ شادی ویسے ہی ہو گی جی، جیسے ہماری بہن کی ہوئی تھی۔ اس وقت کون سے چاول پکے تھے اور باجے بجے تھے۔ میں بھی نذر حسینی کی بیٹی کو اسی طرح لے کے آؤں گا۔ چار بندے جائیں گے اور نکاح کر کے اسے ساتھ لے آئیں گے۔''

راجہ انوار کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں کینے کی چمک تھی۔ یوں لگ رہا تھا وہ اپنی شادی کی بات نہیں کر رہا کسی دشمن سے بدلہ لینے کی بات کر رہا ہے۔ کتنے دکھ کی بات تھی ایک بیٹی اپنے بابل کے گھر میں سولہ برس دلہن بننے کے خواب دیکھتی رہی تھی۔ پھولوں کی مہکتی سیج پر اپنے دولہا کی محبت بھری مسکراہٹ جس کی آنکھوں کا سب سے حسین سپنا تھی، ایک ایسے شخص کے سپرد کی جانے والی تھی جس سے اس کا محبت کا نہیں نفرت کا رشتہ تھا۔

راجہ انوار کی آواز نے مجھے میرے خیال سے چونکایا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ میں اس کے ساتھ چل کر موقعہ ملاحظہ کروں۔ میں نے اسے ٹالتے ہوئے کہا۔

''نہیں راجہ! مجھے اس وقت ضروری کام ہے۔ تم جاؤ...... میں کل کسی وقت خود دیکھ لوں

گا۔''

وہ اٹھ کر روانہ ہو گیا۔ اس کا گونگا باڈی گارڈ بھی ساتھ تھا...... میں دروازے کی چق سے ان دونوں کو جاتے دیکھتا رہا۔ تھانے کے احاطے سے گزر کر وہ دونوں مین گیٹ پر پہنچے پھر ایک سیکنڈ بعد گلی میں داخل ہو گئے۔ یہی وقت تھا جب مجھے چیخ و پکار اور شور شرابے کی آوازیں آئیں۔ میں نے راجہ انوار کے گونگے ملازم کو چونکتے اور ایک دم پیچھے ہٹتے دیکھا...... پھر ایک ریڑھا فراٹے بھرتا ہوا گیٹ کے سامنے سے گزر گیا۔ گیٹ پر کھڑا سنتری گھبرا کر گلی میں داخل ہوا۔ تھانے کا باقی عملہ بھی دیکھا دیکھی گلی کی طرف بھاگا۔ میری چھٹی حس نے پکار کر کہا کہ گلی میں کوئی زبردست حادثہ رونما ہو چکا ہے۔ میں احاطہ کراس کر کے بھاگتا ہوا گلی میں پہنچا۔ ایک سنسنی خیز منظر سامنے آیا۔ گوبر سے لدا ہوا ایک ریڑھا چند گز آگے دیوار سے ٹکرا کر الٹ چکا تھا۔ گلی میں گوبر کا ڈھیر نظر آ رہا تھا اور سنتری سمیت کئی افراد دیوانہ وار اس ڈھیر میں کچھ تلاش کر رہے تھے۔ پھر ایک شخص کی ٹانگیں گوبر میں سے برآمد ہوئیں اسے کھینچ کر باہر نکال لیا گیا، لیکن وہ پوری طرح نہیں نکل سکا۔ اس کا ایک بازو ابھی تک گھوڑے کی لگام سے الجھا ہوا تھا۔ میں نے بھی آگے بڑھ کر مدد کی اور اس الجھے ہوئے شخص کو ریڑھے اور گھوڑے کے پاس سے ہٹایا...... وہ راجہ انوار تھا۔ اس کا سارا جسم خون اور گوبر میں لتھڑا گیا تھا۔

''میری جیپ لاؤ رام سنگھ!'' میں نے پکار کر سنتری سے کہا اور پاکٹ سے چابی نکال کر اس کی طرف اچھال دی۔ سنتری جیپ کی طرف بھاگا لیکن جلد ہی مجھے احساس ہو گیا کہ یہ بھاگ دوڑ فضول ہے۔ راجہ انوار اپنا دانہ پانی پورا کر چکا تھا۔ ریڑھے کا پہیہ عین اس کی گردن پر سے گزرا تھا۔ گوبر کے نیچے سے اس کی کٹی ہوئی شہہ رگ صاف نظر آ رہی تھی۔ پیٹ پر بھی ایک گہرا گھاؤ تھا جو یقیناً گھوڑے کے سم سے آیا تھا...... راجہ انوار نے ہمارے ہاتھوں میں چند زوردار جھٹکے لیے پھر ایک ہچکی سے دم توڑ دیا۔ میں حیران و ششدر کھڑا تھا۔ چند لمحے پہلے جو جیتا جاگتا شخص میرے سامنے بیٹھا تھا اور لمبے چوڑے منصوبوں کی باتیں کر رہا تھا، اب کٹی پھٹی لاش میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اس کی تنی ہوئی گردن کے چیتھڑے اُڑ گئے تھے اور خون کے دھبوں والی خالی آستین ہوا میں جھول رہی تھی۔ راجہ انوار کا گونگا ملازم بھی زخمی ہوا تھا۔ اس کا پستول ہولسٹر سے نکل کر دور جا گرا تھا اور وہ اپنے زخمی کندھے سے ابلتے ہوئے خون کو روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ ریڑھا قصبے کے ایک غریب کاشت کار چاچے مہتاب کا تھا۔ ریڑھے کا گھوڑا نمبرداروں کے ہی ایک کتے سے ڈر کر بھاگا تھا اور یہاں آ کر اس نے راجہ انوار کو راہی

عدم کر دیا تھا۔ اس حادثے میں ایک بڑھیا بھی ہلاک ہوئی اس کے علاوہ چار پانچ راہگیروں کو زخم آئے۔ راجہ انوار میں اب کچھ بھی باقی نہیں بچا تھا۔ پھر بھی لوگ اسے میری جیپ میں ڈال کر ہسپتال کی طرف لے گئے۔ تھوڑی دیر بعد نمبردار رمضان علی خود بھی موقعہ پر پہنچ گیا۔ وہ غم و غصے سے پاگل سا ہو رہا تھا۔ اس نے ریڑھے کے نیچے دبے ہوئے زخمی گھوڑے کو خونی نظروں سے دیکھا، پھر پستول نکالا اور چھ کی چھ گولیاں اس کے جسم میں پیوست کر دیں۔ اتنے میں اس کا ایک کارندہ مٹی کے تیل کا کنستر لیے نمودار ہوا۔ اس نے تیل ریڑھے پر پھینکا اور آگ لگا دی...... پورے قصبے سے لوگ جائے حادثہ کی طرف بھاگے چلے آ رہے تھے۔ شکر تھا کہ ریڑھے کا مالک مہتاب اس وقت موقعہ پر موجود نہیں تھا ورنہ ممکن تھا کہ نمبردار غضب کے عالم میں پستول کی گولیاں گھوڑے اور گھوڑے کے مالک میں برابر تقسیم کر دیتا۔

......نمبردار رمضان علی کا جواں سال بھائی مر گیا اور یوں قدرت کے ہاتھ نے اس فیصلے کو ملیا میٹ کر دیا۔ جو پنچایت کے دانشوروں نے کیا تھا اور جس کے مطابق مجرم کی بہن کو ناکردہ گناہ کی سزا دی جانے والی تھی۔ ''شکر'' کا مقام تھا کہ راجہ انوار کی موت ایک حادثے کی وجہ سے ہوئی اور اس حادثے کو درجنوں افراد نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اگر راجہ انوار کی موت میں تھوڑی بہت بھی شبہے کی گنجائش ہوتی تو نمبردار فوراً نذر حسینی کے گھرانے کو قاتل قرار دے دیتے۔ راجہ انوار کی موت دردناک ضرور تھی لیکن اس موت پر کئی لوگوں نے سکھ کا سانس لیا۔ ان میں وہ بھی تھے جو اس کی زیادتیوں کا شکار ہوئے تھے اور وہ بھی جو اسے زیادتیاں کرتے دیکھتے تھے اور کچھ کہہ نہیں سکتے تھے۔ بلال شاہ کی زبانی مجھے پتہ چلا کہ قصبے کے بیشتر لوگ اس بات پر خوش ہیں کہ نذر حسینی کی معصوم بیٹی راجہ انوار جیسے بدقماش کے پلے بندھنے سے بچ گئی ہے۔

☆======☆======☆

دو ڈھائی ماہ کا عرصہ مزید گزر گیا۔ اب سخت سردیوں کے دن تھے۔ ایک روز شام کے وقت میں موضع آبیال سے ایک واردات کا موقع دیکھ کر واپس آ رہا تھا۔ بلال شاہ اور ایک کانسٹیبل ریاض بھی میرے ساتھ تھے۔ ہم دو گھوڑوں پر سوار تھے۔ ایک پر میں تھا اور دوسرے پر بلال شاہ اور ریاض۔ ابھی ہم قصبے سے تین چار فرلانگ دور ہی تھے کہ دور چری کے کھیتوں میں بھاگ دوڑ کے آثار نظر آئے۔ کچھ دیہاتی لاٹھیاں لیے تیزی سے ہماری طرف آ رہے تھے اسی دوران قریبی جھاڑیوں میں گھوڑے کی ٹاپیں گونجیں۔ کوئی گھڑ سوار سرپٹ گھوڑا بھگاتا ہوا ہمارے دائیں جانب کوئی چالیس قدم کے فاصلے سے گزر گیا تھا۔ جھاڑیوں کی وجہ سے ہم

اس کی صورت نہیں دیکھ سکے۔ پھر کچے راستے پر ایک سرپٹ بھاگتا ریڑھا نظر آیا۔ ریڑھابان لگامیں تھامے ریڑھے پر کھڑا تھا اور اس کی نیلی دھوتی ہوا میں پھڑ پھڑا رہی تھی۔ ریڑھے پر دو اور افراد بھی موجود تھے۔ پیدل لوگ ریڑھے سے کافی پیچھے تھے۔ جونہی ریڑھا نزدیک پہنچا ریڑھابان نے مجھے دیکھ لیا۔ وہ گاؤں ہی کا ایک نوجوان صادق تھا اس نے باگیں کھینچ کر ریڑھا ہمارے نزدیک روک لیا اور ہانپتے ہوئے لہجے میں بولا۔

''تھانیدار جی! وہ نمبرداروں کا گونگا ملازم گنگو نذر حسینی کی دھی خالدہ کو اٹھا کر لے گیا ہے۔ جلدی کریں جی...... اس کا پیچھا کریں۔ اس کے پاس مشکی گھوڑا ہے۔ دیر ہوگئی تو بڑی دور نکل جائے گا۔''

صادق کی بات پر یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ میں نے فوراً گھوڑے کا رخ موڑا اور ان جھاڑیوں کی طرف لپکا جہاں تھوڑی دیر پہلے گھوڑے کی ٹاپیں گونجی تھیں۔ یہاں ایک کچا راستہ تھا۔ یہ سیدھا راستہ دور تک نظر آ رہا تھا۔ قریباً نصف فرلانگ دور ابھی تک دھول اڑ رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا گنگو ابھی زیادہ دور نہیں گیا۔ میں نے رکابوں پر کھڑے ہو کر گھوڑے کو چابک دکھایا۔ اصیل گھوڑا کمان سے نکلے تیر کی طرح مفرور کے تعاقب میں دوڑا۔ راستہ ہموار ہو تو اصیل گھوڑا دوڑانے کا مزہ آ جاتا ہے۔ سوار کے اشارے گھوڑے کی سمجھ میں آنے لگیں تو پھر وہ طوفان میل بن کر دکھا دیتا ہے۔ ایسے واقعات مشہور ہیں کہ ایک اصیل گھوڑا سوار کے اشاروں پر سرپٹ بھاگتے ہوئے ہانپ کر مر گیا لیکن رکا اور نہ رفتار کم کی۔

تین چار منٹ بعد میں نے گنگو کو جا لیا۔ اس نے لڑکی کو اپنے آگے بٹھا کر جکڑ رکھا تھا اور گھوڑے پر توازن برقرار رکھنے کی کوشش میں تھا۔ گھوڑے کی رفتار میں بھی اب زیادہ تیزی نہیں تھی۔ یوں لگ رہا تھا کہ لڑکی ہوش میں ہے اور مزاحمت کر رہی ہے۔ گاہے گاہے اس کی چیخ بھی بلند ہو جاتی تھی۔ میرا گھوڑا قریب پہنچا تو گنگو رخ پھیر کر دیکھنے لگا۔ اسی وقت اچانک لڑکی گنگو کی گرفت سے آزاد ہوئی اور لڑھک کر جھاڑیوں میں جا گری۔ میں نے اسے آنکھوں کے سامنے قلابازی کھاتے اور ایک گڑھے میں گرتے دیکھا۔ گنگو نے رکنے کی کوشش نہیں کی اور گھوڑا بھگاتا سیدھا نکل گیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا کوئی ایک فرلانگ پیچھے بلال شاہ اور ریاض چلے آ رہے تھے۔ یقینی بات تھی کہ لڑکی کے گھوڑے سے گرنے کا منظر انہوں نے بھی دیکھ لیا ہے اور نہ بھی دیکھا ہو تو وہ انہیں چیخ کر اپنی طرف متوجہ کر سکتی تھی۔ لہٰذا میں نے رکے بغیر گنگو کا تعاقب جاری رکھا۔

یہ ایک طویل تعاقب ثابت ہوا۔ لڑکی کے بوجھ سے نجات پا کر گنگو کی رفتار خاصی تیز ہو

گئی تھی۔ ویسے بھی وہ راستے کی ہر اونچ نیچ سے واقف تھا اور بلا تکلف بھاگا چلا جا رہا تھا۔ پستول میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے دو تین ہوائی فائر کیے اور چلا کر دھمکی دی کہ وہ رک جائے لیکن اس نے بھی شاید پختہ ارادہ کر رکھا تھا کہ آخر تک جان بچانے کی پوری کوشش کرے گا۔ گولی چلانا نقصان دہ تھا۔ ایک شاندار گھوڑا بیکار ہو جاتا یا گنگو کو جان کے لالے پڑ جاتے لیکن یہ بھی خطرہ تھا کہ تعاقب چند منٹ اور جاری رہا تو گنگو شام کے جھٹپٹے کا فائدہ اٹھا کر بچ نکلنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ میں نے کوشش کر کے اپنا اور گنگو کا درمیانی فاصلہ کچھ اور کم کیا...... اس حرکت سے بڑی برکت پیدا ہوئی۔ گنگو جو پہلے ہی بدحواس تھا کچھ اور بدحواس ہو گیا۔ اس کے گھوڑے نے ٹھوکر کھائی اور گنگو اوپر سے لڑھکتا ہوا جوہڑ میں جا گرا۔ یہ ٹھٹھرے ہوئے پانی کا گہرا جوہڑ تھا۔ سخت سردی میں اس جوہڑ کے اندر گر جانا گنگو کی بدقسمتی ہی قرار دی جا سکتی تھی لیکن گنگو کے ساتھ ساتھ یہ میری بھی بدقسمتی تھی۔ کیونکہ جب گنگو نے اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی تو مجبوراً مجھے بھی برفیلے پانی میں چھلانگ لگانا پڑی۔ تاہم چھلانگ لگانے سے پہلے میں نے اتنی عقلمندی ضرور کی کہ پستول بمعہ گولیوں والی بیلٹ کے کنارے پر پھینک دیا۔

اس ٹھٹھری ہوئی ابر آلود شام کو برفیلے پانی میں چھلانگ لگانا اور گنگو سے ہاتھا پائی کرنا مجھے آج تک یاد ہے۔ وہ خاصا ہٹا کٹا شخص تھا۔ بھیگنے کے بعد میرے ہاتھوں سے ڈولا مچھلی کی طرح پھسل پھسل جا رہا تھا لیکن مجھے بھی سخت غصہ تھا۔ ایسی کڑاکے کی سردی میں اس نے چھپڑ کا غسل کرایا تھا۔ میں نے اس کے بال مٹھی میں جکڑ کر چند زوردار مکے اس کے جبڑوں پر رسید کیے۔ اس نے میری ٹانگوں کے درمیان سر اڑا کر مجھے اٹھانا چاہا لیکن میں نے اس کے جھکے ہوئے چہرے پر گھٹنے کی بھرپور ضرب لگائی۔ یہ ضرب اس کی داہنی آنکھ پر پڑی۔ وہ تیورا کر پانی میں گر گیا۔ میں نے اس کی گردن دبوچی اور کنارے کی طرف کھینچنا شروع کر دیا۔

کنارے پر پہنچ کر گنگو نے عجب انداز میں واویلا شروع کر دیا۔ وہ مجھے کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ بولنے کی کوشش میں اس کے حلق سے عجیب و غریب آوازیں نکل رہی تھیں۔ معذور شخص پر آدمی کو عموماً ترس آ جاتا ہے لیکن میں جانتا تھا کہ گنگو کسی طرح بھی ترس کے قابل نہیں۔ وہ ایک چھٹا ہوا بدمعاش اور شرابی تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو راجہ انوار جیسے لوفر کا ملازم خاص کیسے بنتا۔ اسے نمبردار کے پاس ملازمت کرتے ہوئے ایک سال سے زیادہ نہیں ہوا تھا لیکن اپنی غنڈہ گردی کے سبب وہ نمبردار کے چہیتے ملازموں میں شامل ہو چکا تھا۔

مجھے فوری طور پر سمجھ نہیں آئی کہ گنگو نے خالدہ کے اغوا کا قدم اپنی مرضی سے اٹھایا ہے یا نمبردار کے کہنے پر۔ وہ جو واویلا کر رہا تھا اور جس طرح کا چہرہ بنا رہا تھا اس سے یہ بھی شک ہو

رہا تھا کہ وہ اس اغوا کو کوئی بڑا نیکی یا بھلائی کا کام بتا رہا ہے۔ یعنی ایک شریف لڑکی کو زمانے کے سامنے رسوا کر کے اس نے کوئی بہت بڑی سماجی خدمت کی ہے۔ وہ بار بار اپنی شہادت کی انگلی ناک سے لگا کر یہ سمجھا رہا تھا کہ میں لڑکی کا بیان لوں...... لڑکی کا بیان بھلا میں کیا لیتا۔ میں نے خود اسے گنگو کی گرفت میں تڑپتے مچلتے اور چلاتے سنا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ گنگو اسے زبردستی لایا ہے۔

بہر حال میں نے گنگو کی شلوار میں سے آزار بند نکلوایا اور اسے کہا کہ وہ شلوار کے نیفے کو گرہ دے کر کمر سے باندھ لے۔ آزار بند سے میں نے گنگو کے ہاتھ پشت پر باندھے اور اسے گھوڑے پر بٹھا دیا۔ گھوڑے کی لگام میں نے اپنے گھوڑے کی زین سے باندھ لی۔ یوں گنگو کی سواری ''باد بہاری'' میرے پیچھے واپس قصبے کی طرف روانہ ہوئی۔ گنگو مسلسل واویلا کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے لہٰذا گھوڑے پر توازن برقرار رکھنا اس کے لیے خاصا دشوار ہو رہا تھا۔ کسی وقت جب گھوڑے آگے پیچھے بھاگنے لگتے تو گنگو اوندھے منہ گھوڑے کی پشت پر گر پڑتا اور دیر تک وہاں پڑا رہتا۔ قصبے کو جانے والے راستے پر، ہم قریباً دو میل گئے تھے کہ تاریکی میں بہت سی روشنیاں نظر آئیں۔ جلد ہی میرا اندازہ درست ثابت ہو گیا۔ یہ قصبے ہی کے لوگ تھے۔ ان میں بلال شاہ اور کانسٹیبل ریاض بھی شامل تھے۔ وہ سب گھوڑوں پر سوار تھے چند لالٹینیں بھی ان کے ساتھ تھیں۔ ہمارے بھیگے لباسوں میں سے ٹھنڈی ہوا چھریاں چلاتی گزر رہی تھی۔ میں نے قمیض اور جرسی اتار کر پھینک دی اور ایک دیہاتی سے اس کا کمبل لے کر لپیٹ لیا۔ گنگو کے لیے بھی اس سے ملتا جلتا انتظام کر دیا گیا۔

بلال شاہ نے مجھے بتایا کہ انہوں نے لڑکی کو جھاڑیوں میں سے اٹھا لیا تھا۔ وہ نیم بے ہوش ہو چکی تھی۔ تاہم جلد ہی وہ ٹھیک ہو گئی۔ اسے چند افراد کے ساتھ واپس قصبے بھیج دیا گیا تھا۔ راستے میں دوسرے لوگ بھی مجھ سے باتیں کرتے رہے۔ انہوں نے بتایا کہ گنگو نے خالدہ کو کنوئیں سے اٹھایا تھا۔ وہ وہاں پانی بھرنے کے لیے آئی تھی۔ گنگو پاس ہی مکئی کے کھیت میں چھپا ہوا تھا۔ اچانک وہ کھیت سے نکلا اور خالدہ کو دبوچ کر گھوڑے پر بٹھا لیا۔ اتفاقاً کھیت میں کام کرتی ہوئی دو عورتوں نے یہ منظر دیکھ لیا اور شور مچا دیا۔ نتیجے میں ''دار'' گنگو کے پیچھے لگ گئی...... سب لوگ گنگو کو صلواتیں سنا رہے تھے اور کچھ دبے لفظوں میں نمبرداروں پر بھی شک کر رہے تھے۔ یعنی ان کا خیال تھا کہ اس واردات میں نمبرداروں کا ہاتھ ہے۔

ہم نو بجے کے قریب واپس تھانے پہنچے۔ نذر حسینی، اس کی بیوی اور بیٹی خالدہ تھانے ہی میں موجود تھے۔ خالدہ کی عمر اٹھارہ انیس برس کے قریب تھی۔ اس نے سر پر ٹاسے کی چادر

ڈال رکھی تھی۔ میں نے چادر کے پیچھے سے اس کی صرف ایک جھلک دیکھی۔ وہ بڑی بڑی معصوم آنکھوں والی ایک خوش شکل لڑکی تھی۔ اس کے چہرے پر خراشیں نظر آ رہی تھیں اور رخساروں پر لگاتار آنسو بہہ رہے تھے۔ خالدہ کی ماں بھی مسلسل رو رہی تھی۔ اس نے روتے روتے کہا۔

''تھانیدار صاحب! ہم برباد ہوگئے، کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہے۔ اس گونگے نے ہماری عزت مٹی میں رول دی......'' یہ کہتے کہتے بڑھیا جذباتی ہوگئی۔ اس نے اٹھ کر گنگو پر جھپٹنا چاہا لیکن ایک کانسٹیبل نے اسے کندھوں سے تھام کر پھر کرسی پر بٹھا دیا۔ وہ گنگو کو دنیا جہان کی بددعائیں دینے لگی۔ مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ خالدہ کے وارثوں میں سے کسی نے بھی نمبرداروں کو الزام دینے کی کوشش نہیں کی......اس کا مطلب تھا انہیں نمبرداروں پر کوئی شک نہیں اور وہ اس واردات کو گنگو کا ذاتی فعل سمجھ رہے ہیں۔ میں نے خالدہ کے والدین سے چند ضروری سوالات پوچھے۔ میرا مقصد یہ جاننا تھا کہ اس سے پہلے بھی انہیں گنگو سے کوئی شکایت پیدا ہوئی ہے یا نہیں۔

خالدہ کے والد نذر حسینی نے کہا۔ ''تھانیدار جی! پچھلے ہفتے کی بات ہے رات کسی وقت گنگو نے ہمارا دروازہ آ کھٹکھٹایا...... میں نے دروازہ کھول کر پوچھا کہ کیا بات ہے اور وہ اس وقت یہاں کیوں آیا ہے۔ گنگو کے منہ سے شراب کی بو آ رہی تھی۔ اس نے حلق سے غوں غاں کی آوازیں نکالیں اور پھر مجھے دھکیل کر اندر داخل ہونے کی کوشش کی۔ میں نے اسے اندر نہیں گھسنے دیا۔ اتنے میں گلی کی طرف سے چوکیدار کی آواز آئی۔ گنگو ایک دم گھبرا گیا اور لمبے لمبے قدم اٹھاتا گلی کے موڑ پر غائب ہو گیا۔ میں نے اس بات کا ذکر نمبردار رمضان سے کیا۔ رمضان بولا کہ اسے کچھ پتہ نہیں، شاید گنگو نشے کی وجہ سے اس طرف چلا گیا ہو۔ اس نے گنگو کو میرے سامنے بلا کر جھاڑیں پلائیں اور واپس بھیج دیا...... تین چار دن بعد گنگو نے خالدہ کو کھیت میں روک لیا اور اسے تنگ کرنے لگا۔ خالدہ اس سے جان چھڑا کر گھر بھاگ آئی اور ماں کو ساری بات بتائی۔ شام کو مجھے بھی پتہ چل گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ نمبردار رمضان شہر گیا ہوا ہے نہیں تو اسی سے کچھ کہتا۔ میں نے سوچا جتنا شور مچاؤں گا اپنے ہی سر پر مٹی پڑے گی اس لیے نمبردار کے آنے تک خاموش رہنے کا فیصلہ کیا۔ اس کمبخت کو میری خاموشی سے اور ہلاشیری ہوئی اور آج اس نے میری بیٹی کی عزت پر ہاتھ ڈال دیا۔''

مجھے یاد آیا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے جوہڑ کے کنارے گنگو نے واویلا کر کے مجھے سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ میں لڑکی یعنی خالدہ کا بیان لوں۔ خالدہ ابھی تک خاموش بیٹھی تھی۔ عین

ممکن تھا کہ اس کا بیان اپنے والدین سے مختلف ہوتا۔ وہ کوئی ایسی بات بتا سکتی تھی جو دوسرے لوگوں نے مجھے نہ بتائی ہو۔ میں نے نذر حسینی سے پوچھا کہ کیا وہ مجھے تنہائی میں اپنی بیٹی سے ایک دو سوال کرنے کی اجازت دے گا؟ نذر حسینی کے چہرے پر پہلے تو کشمکش کے آثار نظر آئے پھر وہ اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ''آپ ہمارے حاکم ہیں جی...... آپ سے کیا پردہ ہے۔ آپ جو چاہے پوچھ سکتے ہیں۔''

پھر نذر حسینی اپنی بیوی اور دوسرے لوگوں کے ساتھ باہر چلا گیا۔ خالدہ سخت پریشانی کے عالم میں بیٹھی تھی۔ کبھی دروازے کی طرف اور کبھی میری جانب دیکھتی تھی۔ میں نے کہا۔ ''گھبرانے کی ضرورت نہیں میں تمہارا ہمدرد ہوں۔ دشمن نہیں۔ تم بالغ اور سمجھ دار ہو اپنا اچھا برا سمجھتی ہو۔ اگر تم کوئی بیان دینا چاہتی ہو تو بلا جھجک دے سکتی ہو۔''

خالدہ نے اپنی لمبی پلکیں اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ ان جھیل سی گہری آنکھوں کی تہہ تک پہنچنا ناممکن تھا۔ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''میں نے کچھ نہیں کہنا تھانیدار صاحب! جو بھی بات تھی وہ میرے چاچے (باپ) نے آپ کو بتا دی ہے۔ وہ لوفر ایک رات ہمارے گھر پر آیا تھا پھر اس نے مجھے کھیت میں روک کر چھیڑ خانی کی کوشش کی اور آج شام مجھے کنویں سے زبردستی گھوڑے پر بٹھا کر لے گیا۔''

میں نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس کے علاوہ تو کوئی بات نہیں؟''

وہ ذرا ناگواری سے بولی۔ ''جی نہیں، اس کے علاوہ تو کوئی بات نہیں؟''

میں نے کہا۔ ''کچھ عرصہ پہلے تمہاری شادی نمبردار کے چھوٹے بھائی سے کی جا رہی تھی۔ کیا تم اس شادی کے لیے تیار تھیں؟''

وہ پہلے تو چپ رہی لیکن میں نے اپنا سوال دہرایا تو وہ مدھم لہجے میں بولی۔ ''ماں باپ کا فیصلہ تھا تو مجھے کیوں قبول نہ ہوتا۔''

میں نے کہا۔ ''ایک آخری سوال اور پوچھنا چاہتا ہوں...... کیا تمہیں یہ شبہ نہیں کہ آج والے واقعے میں نمبرداروں کا ہاتھ ہے؟''

وہ اعتماد سے بولی۔ ''نہیں جی...... نمبردار صاحب کو ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔''

میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے، اب تم جا سکتی ہو۔''

نذر حسینی اور اس کے خاندان برادری والوں کو میں نے تسلی تشفی دے کر واپس بھیج دیا اور انہیں یقین دلایا کہ مجرم سزا سے بچ نہیں سکے گا۔

☆======☆======☆

اگلے روز علی الصبح میں نے نمبردار رمضان علی کو تھانے بلا بھیجا۔ بھائی کی ناگہانی موت کے بعد وہ ''پنج وقتی'' نماز پڑھنے لگا تھا اور اکثر سر پر ٹوپی بھی نظر آتی تھی۔ میں نے اس سے گنگو کی کارستانی کا ذکر کیا۔ وہ بولا۔

''تھانیدار صاحب! میری طرف سے آپ کو کھلی اجازت ہے جو جی چاہے اس سے سلوک کریں۔ ہم نے اس شخص کو جی دار سمجھ کر ملازم رکھا تھا لیکن یہ چھٹا ہوا بدمعاش ہے۔ میں نے تو اسے دو ہفتے پہلے ہی نوکری سے نکال دیا تھا۔ پھر معافیاں مانگنے لگا۔'' کہنے لگا کہ اب بالکل بندے کا پتر بن جاؤں گا..... مگر کتے کی دم بھی کبھی سیدھی ہوئی ہے۔''

نمبردار کی گفتگو سے یہ بات صاف ہوگئی کہ اسے مجرم سے قطعی کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ اسے پھانسی پر بھی لٹکا دیا جائے تو نمبردار کو کوئی افسوس نہیں ہوگا۔ ان حالات سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ خالدہ کو اغوا کرنے والا جرم گنگو کا ذاتی جرم ہے۔ وہ فطری طور پر بدقماش شخص تھا۔ راہ چلتے کہیں اس نے خالدہ کو دیکھ لیا تھا اور اس کی خوبصورتی پر اپنی رال ٹپکانی شروع کر دی تھی۔

دوپہر کے وقت میں نے حوالات میں گنگو سے ملاقات کی۔ اس کی عمر پچیس برس کے قریب تھی۔ قد لمبا اور جسم مضبوط تھا۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کثرت سے شراب نوشی کرتا ہے۔ کل شام میرا گھنٹا اس کی آنکھ پر لگا تھا۔ یہ آنکھ اب گہری نیلی نظر آ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر گنگو ایک بار پھر اپنی زبان کو شدت سے حرکت دینے لگا۔ اس کے حلق سے عجیب وغریب آوازیں نکل رہی تھیں۔ وہ ہاتھوں کے تند و تیز اشاروں اور چہرے کے تاثرات سے مجھے پتہ نہیں کیا سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن بہت کم باتیں میری سمجھ میں آ رہی تھیں، اور جو سمجھ میں آ رہی تھیں ان کا بھی سر پیر نہیں تھا۔ وہ اپنی انگلی کو بار بار ناک سے ملاتا اور خالدہ کا ذکر کرتا تھا پھر سر پر اونچی شملے دار پگڑی کا اشارہ کرتا اور ہاتھ گلے پر پھیر کر گردن کٹنے کی اداکاری کرتا۔ شاید وہ یہ بتا رہا تھا کہ نمبردار رمضان کو کوئی قتل کر دے گا یا نمبردار رمضان کسی کی جان لے لے گا۔ وہ شہادت کی دونوں انگلیوں کو ایک دوسرے میں پھنسا کر بار بار کسی بندھن کا ذکر بھی کر رہا تھا۔ مصیبت یہ تھی کہ گنگو چٹا اَن پڑھ تھا ورنہ کاغذ قلم کے ذریعے اس کے اندر کی بات باہر لائی جا سکتی تھی۔ زندگی میں پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ اَن پڑھ شخص کی بے زبانی کتنی بڑی معذوری ہوتی ہے۔ جب گنگو کسی طرح بھی مجھے اپنی بات نہیں سمجھا سکا تو اس کے چہرے پر بے بسی کی چھاپ لگ گئی۔ ایک دم اس پر جھلاہٹ سوار ہو گئی اور وہ اپنے دائیں ہاتھ کا مکا پیشانی پر مار مار کر لاچارگی کا اظہار کرنے لگا۔

اس سے پہلے بھی میرا واسطہ ایک گونگی لڑکی سے پڑ چکا تھا۔ وہ کئی روز میرے زیر تفتیش رہی تھی۔ لیکن فرق یہ تھا کہ وہ صرف گونگی تھی بہری نہیں تھی۔ میں نے اس سے مختلف سوالات پوچھے تھے اور وہ ''ہاں یا نہ'' میں جواب دیتی چلی گئی تھی اور یوں اس کا مکمل بیان قلمبند کر لیا گیا تھا...... لیکن یہاں صورتِ حال مختلف تھی گنگو بے زبان ہونے کے علاوہ بہرا بھی تھا۔ ایسے لوگوں کے ساتھ صرف اشاروں میں بات کی جا سکتی ہے اور یہ اشارے بھی صرف وہی سمجھ سکتا ہے جو طویل عرصے تک ان کے ساتھ رہا ہو۔ میں نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح گنگو کی بات میرے پلے پڑ سکے۔ وضاحت کے لیے اشاروں کنایوں میں اس سے سوالات کیے لیکن کچھ بھی حاصل نہیں ہوا۔

جیسا کہ میں نے بتایا ہے گنگو صرف ایک برس پہلے نمبرداروں کے پاس ملازم ہوا تھا۔ وہ جنوبی سندھ کے کسی علاقے کا رہنے والا تھا لیکن صحیح پتے ٹھکانے کا علم کسی کو نہیں تھا۔ نہ ہی کبھی کوئی باہر کا آدمی اس سے ملنے آیا تھا۔ میں نے اشاروں کنایوں میں اس سے پوچھنے کی کوشش کی کہ اس کے والی وارث کس علاقے میں ''پائے جاتے'' ہیں۔ کافی تگ و دو کے بعد وہ میرا یہ سوال سمجھ سکا لیکن اس سوال کا جواب دینے کی اس نے کوئی ضرورت محسوس نہیں کی۔ ظاہر تھا کہ وہ اپنا ماضی چھپانا چاہتا ہے۔ اس کے خلاف کافی شہادتیں اور موقعے کے گواہ موجود تھے۔ اس کا سابقہ ریکارڈ بھی گواہ تھا کہ وہ ایک بدقماش شخص ہے...... میں نے اس کے خلاف پرچہ کاٹا اور چند ہی روز میں چالان مکمل کر کے عدالت میں بھیج دیا۔ گنگو جوڈیشنل ریمانڈ پر جیل چلا گیا اور سیشن کورٹ میں اس پر اغوا کے جرم میں کیس چلنے لگا۔

وقت اپنی دھیمی رفتار سے رینگتا رہا۔ مجھے ایک انکوائری کے سلسلے میں دو تین ہفتے ڈلہوزی، چمبا اور پٹھانکوٹ وغیرہ میں گزارنا پڑے۔ پھر ایک ذاتی کام کے سلسلے میں اپنے آبائی قصبے پسرور کا رخ کرنا پڑا۔ فراغت پا کر جب میں دوبارہ اپنے تھانے پہنچا تو ایک نئی اطلاع میری منتظر تھی۔ بلال شاہ کی زبانی پتہ چلا کہ نمبردار رمضان علی دوسری شادی کر رہا ہے۔

یہ اطلاع میرے لیے حیران کن تھی۔ میں نے کہا۔ ''یہ نمبردار کو کیا سوجھی ہے؟''

بلال شاہ مسکرا کر بولا۔ ''ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے جی! سولہ اور سولہ بتیس ویسے بھی بندہ اور گھوڑا کبھی بوڑھے نہیں ہوتے۔''

میں نے کہا۔ ''یہ مقولہ بھی عیاش مردوں نے بنایا ہوا ہے۔ بہرحال کہاں شادی ہو رہی ہے نمبردار کی؟''

بلال شاہ بولا۔ ''آپ سن کر حیران ہو جائیں گے۔''

میں نے کہا۔ ''کروناں حیران۔''

وہ بولا۔ ''نذر حسینی کی بیٹی خالدہ سے۔''

خبر واقعی حیران کر دینے والی تھی۔ راجہ انوار کی موت کے بعد سے ہی میں محسوس کر رہا تھا کہ کچھ نہ کچھ ہو گا ضرور۔ نمبردار اپنا بدلہ چھوڑیں گے نہیں۔ اپنی لڑکی کے نکل جانے سے ان کی ناک نیچی ہو گئی تھی۔ اب یہ ناک اسی صورت اونچی ہو سکتی تھی کہ نذر حسینی کی بیٹی ان کے گھر آ جاتی......

لیکن جو کچھ نمبردار کر رہا تھا یہ ٹھیک نہیں تھا۔ اگر اس نے نذر حسینی کی بیٹی کا رشتہ لینا ہی تھا تو اپنی برادری کے کسی اور لڑکے کے لیے لے سکتا تھا۔ کسی چچا زاد بھائی بھتیجے وغیرہ کو سامنے لا سکتا تھا لیکن لگتا تھا کہ وہ نذر حسینی کو ذلیل کرنے پر تلا ہوا ہے۔ وہ لڑکی کو اسی چار دیواری میں لانا چاہتا تھا جہاں سے ان کی لڑکی گئی تھی اور یہ مقصد حاصل کرنے کے لیے وہ پختہ عمر میں سر پر سہرا سجانے کو تیار ہو گیا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق خالدہ نمبردار سے کم از کم چودہ برس چھوٹی تھی۔ غالباً نمبردار کی اپنی بیٹی بھی ہوتی تو قد کاٹھ میں خالدہ کے برابر ہوتی۔ اس کے باوجود نمبردار کو شرم نہیں آئی تھی۔ میں نمبردار کی پہلی بیوی کو جانتا تھا، وہ خاصی دھڑلے والی عورت تھی۔ اس کے چار بیٹے تھے۔ ویسے بھی وہ چوہدریوں کے خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ مجھے حیرانی ہوئی کہ اس نے اس شادی پر احتجاج کیوں نہیں کیا۔ معلوم نہیں وہ ڈر گئی تھی یا نمبردار نے اپنی چرب زبانی سے اسے بہلا پھسلا کر چپ کرا دیا تھا۔

میں نے بلال شاہ سے پوچھا۔ ''خالدہ کے گھر والے اس شادی پر کیسے راضی ہو گئے۔''

''یہ تو اللہ ہی جانتا ہے جی!'' بلال شاہ نے جواب دیا۔ ''بہرحال وہ راضی ہو گئے ہیں اور ایک مہینے بعد شادی کی تاریخ بھی طے ہو گئی ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''کہیں انہیں ڈرایا دھمکایا تو نہیں گیا۔''

وہ بولا۔ ''ہو سکتا ہے اور نہیں بھی...... ویسے بھی دریا میں رہ کر مگرمچھ سے بیر کون لیتا ہے۔ نذر حسینی پنچایت میں رشتہ دینے کا اقرار کر چکا تھا، اب وہ بیٹی کی شادی کہیں اور کر ہی نہیں سکتا تھا۔ اگر کرتا تو نمبردار طوفان کھڑا کر دیتے۔ میرے خیال میں تو اس نے جو کیا ٹھیک ہی کیا ہے۔''

اس اطلاع کے بعد بلال شاہ نے مجھے ''خوشخبری'' سنائی کہ اس کی بیوی کو پھر الٹیاں لگی ہوئی ہیں لہٰذا دوا کے لیے اسے سو پچاس روپے کی سخت ضرورت ہے۔ جنوری فروری کے

مہینوں میں بلال شاہ عموماً ایسی ہی خوشخبری سنایا کرتا تھا۔ کسی سال ناغہ ہو گیا ہو تو ہو گیا ہو ورنہ وہ اپنے ''معمولات'' کا بڑا پکا تھا۔ میں نے کہا۔ ''بلال شاہ! ابھی جو تم نے کہا تھا کہ آدمی اور گھوڑا کبھی بوڑھے نہیں ہوتے تو اب مجھے اس بات پر یقین آ گیا ہے۔ آدمی غور کرے تو اللہ کی قدرت ہر کام میں ظاہر ہوتی ہے۔''

بلال شاہ نے برا منایا۔ کہنے لگا ''تو آپ مجھے بوڑھا سمجھ رہے ہیں...... ناکارہ ہو گیا ہوں میں؟''

میں نے کہا۔ ''نہیں...... نہیں۔ ناکارہ نہیں ہو تم۔ تمہاری ''کاریگری'' پر کون کافر شبہ کر سکتا ہے۔ میں تو یونہی بات کر رہا تھا۔''

وہ کچھ اور بھڑک گیا۔ انگلی اٹھا کر بولا۔ ''دیکھیں...... دیکھیں آپ نے پھر مذاق کیا ہے۔ کاریگری سے کیا مطلب ہے آپ کا...... کیا کہنا چاہتے ہیں آپ۔''

میں نے کہا۔ ''میں بھلا کچھ کہنے کی جرأت کر سکتا ہوں...... یونہی مذاق کر رہا تھا میں۔''

بلال شاہ نے لڑاکا بیوی جیسا چہرہ بنایا اور منہ میں بڑبڑاتا ہوا باہر نکل گیا۔ وہ پچاس روپے لے کر نہیں گیا تھا لیکن اس میں میرا ہی نقصان تھا۔ اس نے اب سو روپے سے کم میں منہ سیدھا نہیں کرنا تھا۔ بہرطور جاتے جاتے اس کے ذریعے مجھے ایک اہم اطلاع مل گئی تھی۔ میں نے فوراً ایک ہیڈ کانسٹیبل کو بھیجا اور نذر حسینی کو تھانے بلا لیا۔

نذر حسینی کچھ گھبرایا ہوا سا تھانے میں داخل ہوا اور سلام دعا کے بعد میرے سامنے موڑھے پر بیٹھ گیا۔ میں نے سب سے پہلے اس سے سلمٰی اور صدیق کے بارے میں پوچھا۔ اس نے حلفیہ کہا کہ ابھی تک اسے ان دونوں کا کچھ پتہ نہیں چلا۔ نہ کوئی اطلاع ملی ہے اور نہ وہ خود ان سے ملا ہے۔ (یعنی خیرو قصائی کی طرف سے جو اطلاع ملی وہ آخری تھی وہ دونوں دولہا دلہن کے لباس میں تانگے سے لاری اڈے پر اترے تھے اور نامعلوم بس میں بیٹھ کر جالندھر سے روانہ ہو گئے تھے) چند رسمی باتوں کے بعد میں نے نذر حسینی سے خالدہ کے رشتے کے بارے میں پوچھا اس نے اقرار کیا کہ یہ شادی طے ہو چکی ہے اور اگلے چاند کی دس تاریخ کو رخصتی ہو جائے گی۔ اس بے جوڑ شادی کے بارے میں نذر حسینی نے بھی وہی باتیں کیں جو اس سے پہلے بلال شاہ کر چکا تھا۔ یعنی پنچایت میں اقرار کے بعد نمبرداروں کو رشتہ دینا ضروری ہو گیا تھا۔ ویسے بھی یہ دشمنی ختم کرنے کا کوئی اور راستہ نظر نہیں آتا تھا۔ نذر حسینی نے یہ بات بھی بتائی کہ پہلی بیوی سے نمبردار کے چھ لڑکے ہوئے ہیں جن میں سے دو فوت ہو چکے ہیں لیکن لڑکی کوئی نہیں ہوئی۔ اب نمبردارنی مزید اولاد پیدا نہیں کر سکتی اور نمبردار کو بیٹی کی بڑی

پرانی خواہش ہے۔ اس لیے وہ دوسری شادی پر مجبور ہوا ہے۔

میں نے نذر حسینی سے کہا۔ ''یہ بات تم سے یقیناً نمبردار نے کہی ہوگی...... لیکن کیا تمہیں خود بھی اس بات پر یقین ہے؟''

نذر حسینی سر جھکا کر نیچے دیکھنے لگا۔ صاف ظاہر تھا کہ اسے میری بات سمجھ میں آ گئی ہے۔ ''من حرامی حجتاں ڈھیر'' والا معاملہ تھا۔ نمبردار ہر صورت پنچایت کے فیصلے پر عمل کرانا چاہتا تھا۔ لہٰذا وہ اس شادی کے لیے طرح طرح کی حجتیں پیدا کر رہا تھا...... دیہات میں کم لوگوں کو ہی لڑکی کی خواہش ہوتی ہے۔ ہر شخص اولاد نرینہ کے پیچھے بھاگتا ہے۔ خاص طور پر نمبردار جیسے عیاش فطرت تو لڑکی سے محرومی کو اپنے لیے بہت بڑی نعمت سمجھتے ہیں...... یہ سب نمبردار کی حیلے بازیاں تھیں...... اسے لڑکی کی نہیں ''نذر حسینی کی لڑکی'' کی ضرورت تھی تاکہ وہ اپنی ضد کا جھنڈا اونچا کر سکے۔ وہ سمجھتا تھا کہ قدرت نے اس کے ہاتھ میں طاقت کی لاٹھی دے رکھی ہے اب وہ جس کی بھینس چاہے ہانک سکتا ہے۔

میرا خیال تھا کہ نذر حسینی کو نمبردار کی طرف سے ڈرایا دھمکایا گیا ہے۔ ورنہ وہ یوں اپنی پھول سی بچی کو ادھیڑ عمر نمبردار کے حوالے کرنے پر تیار نہ ہوتا۔ میں نے نذر حسینی کو کریدنے کی کوشش کی لیکن وہ صاف انکاری رہا۔ اس نے کہا کہ اس شادی کا فیصلہ انہوں نے بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے کیونکہ اس کے علاوہ دشمنی ختم کرنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ نذر حسینی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ وہ بولا۔

''صدیق نے نمبردار کی بہن کے ساتھ بھاگ کر ہمارے سر میں خاک ڈال دی ہے...... ہمیں جیتے جی مار ڈالا ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ اس نے جرم کیا ہے لیکن اس جرم کی سزا ہمارے خاندان کے بے گناہ بچوں کو ملے، یہ ہمیں منظور نہیں ہے۔ میں اس سے بہتر سمجھتا ہوں کہ اپنی بیٹی قربان کر دوں۔''

میں نے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے نمبردار کی طرف سے تم لوگوں کو دھمکیاں وغیرہ ملی ہیں۔''

وہ ایک بار پھر پہلو بچا گیا۔ ''دھمکیاں ملی نہیں لیکن مل تو سکتی ہیں۔ وہ لوگ زور آور ہیں کسی وقت کچھ بھی کر سکتے ہیں بہتر ہے کہ اس آگ کو بھانبڑ بننے سے پہلے بجھا دیا جائے۔''

ایک طرح سے اس معاملے میں پولیس کی مداخلت کچھ مناسب نہیں تھی۔ پنچایت فیصلہ کر چکی تھی اور دونوں پارٹیوں میں راضی نامہ بھی ہو چکا تھا۔ اب نمبردار رمضان پر اخلاقی دباؤ تو ڈالا جا سکتا تھا کہ وہ اس بے جوڑ شادی سے باز رہے لیکن اسے قانونی طور پر مجبور نہیں کیا جا

سکتا۔ باپ اپنی بیٹی کی خود شادی کر رہا تھا۔ لڑکی بالغ تھی اور بڑوں کے فیصلے کو اپنا فیصلہ بتا رہی تھی۔ نمبردار کی پہلی بیوی کو بھی کوئی اعتراض نہیں تھا۔ یعنی نمبردار رمضان کے لیے میدان ہر طرح صاف تھا۔

چند دنوں بعد انیس سالہ خالدہ تینتیس سالہ نمبردار رمضان کی بیوی بن کر اس کی حویلی میں چلی گئی۔ یہ شادی زیادہ دھوم دھام سے نہیں ہوئی پھر بھی کافی شور شرابا رہا۔ نمبردار نے شہر سے طوائفیں بلائیں اور حویلی کے پچھواڑے باغ میں رقص و سرور کی محفل جمائی گئی۔ اس کے علاوہ قوالیوں کا انتظام بھی ہوا۔ یعنی ایک ہی رات کے پہلے حصے میں اللہ کا نام لیا گیا اور دوسرے حصے میں گھنگروؤں کی چھنا چھن میں نوٹوں کی بارش کی گئی۔ چھوٹے بھائی کی موت کے بعد نمبردار نے جو چند دن نمازیں پڑھنے اور صدقہ خیرات کرنے میں گزارے تھے وہ اب بھولی بسری بات ہو چکی تھی۔ اب وہ پھر وہی پرانا نمبردار تھا۔ گردن اکڑا کر چلنے والا، بات بات پر نوک دار مونچھوں کو بل دینے والا اور اپنی گہری بادامی آنکھوں میں بجلیاں چھپا کر رکھنے والا۔ اس شادی سے کوئی دو ہفتے بعد کی بات ہے۔ صبح سویرے قصبے کا چوکیدار نصر اللہ ہانپتا ہوا میرے دروازے پر آیا۔ میں ابھی بستر سے نکلا ہی تھا اور صحن سے کیکر کی مسواک توڑ کر سیر کو جانے کا ارادہ کر رہا تھا۔ دستک کی آواز پر میں نے دروازہ کھولا۔ چوکیدار نصر اللہ نے پہلے سلام کیا۔ پھر بولا۔

''انسپکٹر صاحب! میں نے ایک بات پوچھنی تھی آپ سے۔'' اس کا لہجہ کچھ ڈانواں ڈول سا تھا۔

''ہاں پوچھو۔'' میں نے کہا۔

''وہ جی...... گنگو جسے آپ نے اغوا کے کیس میں پکڑا تھا، اب کہاں ہے؟''

''جیل میں ہوگا اور کہاں ہے۔''

''وہ جی میں نے ابھی اسے نمبردار کی حویلی کے پاس دیکھا ہے اس کے ہاتھ میں لاٹھی تھی۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ کماد کے کھیت میں گھس گیا۔''

میں اس اطلاع پر حیران رہ گیا۔ بات یقین کرنے والی نہیں تھی اور نصر اللہ بھی ایسے انداز میں بتا رہا تھا جیسے وہ خود بھی ٹھیک طرح دیکھ نہیں سکا۔ ''تمہیں دھوکا ہوا ہوگا وہ تو اس وقت ڈسٹرکٹ جیل میں ہے۔''

نصر اللہ بولا۔ ''مجھے تو وہ بالکل گنگو ہی لگا ہے جی اور اس کی چال ڈھال بھی چور اچکوں والی تھی۔ آپ...... آپ پتہ تو کرائیں۔ کہیں وہ جیل سے بھاگ تو نہیں آیا۔''

نصر اللہ کی بات مجھے الجھن میں مبتلا کر گئی۔ وہ بڑا پرانا چوکیدار تھا اور کافی ہوشیار واقع ہوا تھا۔ اس کی اطلاع کو نظر انداز کرنا مناسب نہیں تھا۔ میں نے اس سے پوچھا ”نمبرداروں کی حویلی میں تو سب ٹھیک ہے نا؟“

”ہاں جی! میں دروازہ کھٹکھٹا کے سن گن لے آیا ہوں۔ وہاں خیریت ہی ہے۔“

قصبے میں تو ٹیلیفون نہیں تھا، میرا اے ایس آئی باجوہ سرکاری کام سے جالندھر جا رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ ڈسٹرکٹ جیل میں سپرنٹنڈنٹ کلونت رائے سے رابطہ قائم کر کے عبدالغنی عرف گنگو کا پتہ کرے...... اے ایس آئی کی واپسی شام پانچ بجے کے قریب ہوئی۔ اس کے پاس میرے لیے ایک سنسنی خیز اطلاع تھی۔ چوکیدار نصر اللہ کی اطلاع بالکل درست تھی گنگو جیل میں نہیں تھا۔ کل شام جب مشقت کے بعد قیدیوں کو بیرکوں کی طرف لے جایا جا رہا تھا دو قیدی ایک مقدم کا سر پھاڑ کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک غنی عرف گنگو تھا......

گنگو ایک خطرناک شخص تھا اور اب وہ نمبردار کی حویلی کے گرد منڈلا رہا تھا۔ صورتِ حال بہت واضح تھی۔ اس نے ابھی تک خالدہ کا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ اب وہ ایک شادی شدہ عورت تھی۔ نمبردار کی حویلی میں اسے تھوڑی بہت عزت ملی ہوئی تھی۔ قصبے والے اسے چھوٹی لمبڑی (چھوٹی نمبردارنی) کہہ کر بلاتے تھے...... اور گنگو ایک بار پھر اس کی زندگی کو تہہ و بالا کرنے آ گیا تھا۔ میں نے تہیہ کیا کہ اگر اس مرتبہ اس نے خالدہ پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تو ایسے شکنجے میں جکڑوں گا اسے کہ ساری زندگی باہر نہیں نکل سکے گا۔

میں نے اسی وقت اے ایس آئی باجوہ کو بلایا اور اسے ہدایت کی کہ آج رات اسے سادہ کپڑوں میں نمبردار کے مکان پر نظر رکھنی ہے۔ اگر وہ چاہے تو اپنے ساتھ دو تین سپاہی بھی لے سکتا ہے لیکن سب کو سادہ کپڑوں میں ہونا چاہیے۔ باجوہ ایسے کاموں میں بڑا ہوشیار تھا۔ فوراً بولا۔ ”آپ بے فکر رہیں جی! نمبردار کے گھر کی تین طرف تو کھیت ہیں وہاں سے گھر پر باآسانی نظر رکھی جا سکتی ہے...... لیکن معاملہ کیا ہے؟“

میں نے مختصر لفظوں میں اسے ساری بات بتائی، اور ضروری ہدایات دے کر رات کی ڈیوٹی سونپ دی۔

شام کے بعد میں تھانے سے گھر چلا گیا اور باجوہ دو سادہ لباس والوں کے ساتھ اپنی ڈیوٹی پر روانہ ہو گیا...... نمبردار کے مکان کی نگرانی بے حد کارآمد ثابت ہوئی۔ تیر بالکل نشانے پر لگا تھا۔ رات کوئی ایک بجے باجوہ نے مجھے گھر پر آ جگایا۔ کہنے لگا۔ ”نواز صاحب بندہ پکڑا

گیا ہے۔ لاک اپ میں بند کر کے آیا ہوں۔“

”گنگو ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”جی ہاں۔“ اس نے جواب دیا۔

میں جلدی جلدی لباس بدل کر باجوہ کے ساتھ تھانے پہنچا۔ تھانے میں ہلچل تھی۔ گنگو کے علاوہ نمبردار رمضان اس کا بہنوئی سلیمان اور حویلی کے دو تین ملازم بھی نظر آ رہے تھے۔ کمرے میں پہنچ کر میں نے اپنی میز سنبھالی، باجوہ نے مجھے کارروائی کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

”ہم ساڑھے آٹھ بجے سے نگرانی پر تھے۔ قریباً گیارہ بجے ایک سایہ سا کماد کے کھیت سے نکلا اور حویلی کی پچھلی دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ آوارہ کتے اس کے گرد بھونک رہے تھے جب تھوڑی دیر بعد کتے واپس چلے گئے تو وہ اچھل کر دیوار پر چڑھ گیا اور پھرتی سے صحن میں اتر گیا۔ میں نے سپاہی نور محمد اور رائفل مین جے سنگھ کو دیوار کے ساتھ کھڑا کیا اور خود بھاگ کر حویلی کے سامنے والے دروازے پر پہنچا۔ میرے دستک دینے سے نمبردار صاحب جاگ گئے۔ برآمدے میں سوئے ہوئے دو ملازم بھی اٹھ بیٹھے۔ اندر گھسنے والا گنگو تھا۔ اس نے جب دیکھا کہ گھر والے جاگ گئے ہیں تو الٹے پاؤں واپس بھاگا۔ جونہی دیوار پر چڑھ کر وہ نیچے کودا سپاہی نور محمد اور جے سنگھ نے اسے پکڑ لیا۔ اس نے قمیض کے نیچے سے یہ چھرا نکال لیا۔“ اے ایس آئی باجوہ نے رومال میں لپٹا ہوا ایک خنجر میرے سامنے میز پر رکھ دیا۔ پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”جے سنگھ نے ہوشیاری سے رائفل کی نال اس کے ہاتھ پر ماری اور نور محمد نے پیچھے سے گردن دبوچ لی۔ اتنے میں ہم بھی موقعے پر پہنچ گئے اور اسے چھرے سمیت قابو کر لیا۔“

نمبردار رمضان بھی گنگو کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ نمبردار خود بھی شرافت کے لبادے میں ایک بدمعاش تھا، اس کے باوجود وہ اپنے جیسے دوسرے بدمعاش کو کچا چبا جانا چاہتا تھا۔ خالدہ اب اس کی ملکیت تھی، اس کی حویلی کی رونق اور خواب گاہ کی رنگینی تھی، وہ کیسے برداشت کر سکتا تھا کہ ایک دوسرا بدمعاش اس کی طرف حریص نظروں سے دیکھے۔ میں نے نمبردار کو تسلی تشفی دی اور واپس بھیج دیا۔ خالدہ کا والد نذر حسینی بھی پریشانی کی تصویر بنا تھانے میں موجود تھا۔ وہ بار بار اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔ اسے یہ فکر بھی لاحق تھی کہ کہیں اس کا داماد اس معاملے میں اس کی بیٹی پر ہی شبہ نہ کرنے لگے۔ لہٰذا وہ بار بار دہائی دے رہا تھا۔ ”تھانیدار جی! وہ ظالم پتہ نہیں کیوں میری بیٹی کے پیچھے پڑ گیا ہے۔ میری معصوم

بچی نے کیا بگاڑا تھا اس کا۔ وہ تو اس درندے کا سن کر ہی مرنے والی ہو جاتی ہے۔ رات کو اٹھ کر چیخنے لگتی ہے، وہ گھوڑا لے کر آ گیا ہے، وہ مجھے اٹھا کر لے جائے گا.....“

میں نے نذر حسینی کی بھی دلجوئی کی اور اسے گنگو کے عبرت ناک انجام کی بشارت دے کر واپس بھیج دیا۔ اس کے بعد میں حوالات میں گنگو کے پاس پہنچا۔ وہ دیوار سے ٹیک لگائے پرالی پر خاموش بیٹھا تھا۔ اس نے براؤن شلوار قمیض پہن رکھی تھی۔ ہاتھ سے خون رس رہا تھا۔ سپاہیوں کے ساتھ دھینگا مشتی میں اس کی قمیض کئی جگہوں سے پھٹ چکی تھی...... یہ شخص ہمارے لیے دردِ سر بن کر رہ گیا تھا نہ بول سکتا تھا، نہ لکھ سکتا تھا، نہ اس کے اشارے ہی ہماری سمجھ میں آتے تھے۔ اوپر سے حرکتیں ایسی کر رہا تھا کہ ہسٹری شیٹر اور دس نمبریے بھی کیا کرتے ہوں گے۔ جی چاہا کہ حوالات میں گھس کر اس پر مکوں اور ٹھڈوں کی بارش کر دوں لیکن پھر حسب عادت خود پر ضبط کیا۔ مجھے اپنے سامنے پا کر گنگو کی آنکھوں میں عجیب سی چمک نمودار ہو گئی۔ وہ اٹھ کر میرے سامنے آیا اور ایک بار پھر اس کے حلق سے بے معنی آوازوں کا شور بلند ہونے لگا۔ وہ آنکھیں گھما گھما کر اور ہاتھ نچا نچا کر پتہ نہیں کیا کہانی سنا رہا تھا۔ شہادت کی دونوں انگلیوں کو ایک دوسرے میں پھنسا کر وہ بار بار کسی بندھن کا ذکر کرتا تھا اور پھر گلے پر ہاتھ پھیر کر کسی کے قتل کا اشارہ دینے لگتا تھا۔ کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ خالدہ کے قتل کی پیش گوئی کر رہا ہے اور یہ بتا رہا ہے کہ قاتل نمبرداروں میں سے کوئی ہو گا...... اس کی یہ بات توجہ کے قابل تھی...... اس کے ساتھ ساتھ وہ ہاتھوں سے نمبردار کی اونچی حویلی کی شکل بناتا تھا اور ہاتھوں کی انگلیاں کھول کھول کر پھلجڑیوں اور پٹاخوں کے اشارے دیتا تھا۔ ایسا کرتے ہوئے اس کے چہرے پر خوف کے آثار نمودار ہو جاتے تھے اور وہ حلق سے چیخ نکالنے کی کوشش کرتا تھا۔ گنگو کے اشاروں کے سبب میرا دھیان شب برات کی طرف چلا گیا۔ شب برات آنے میں چند روز ہی باقی تھے۔ اس قصبے میں پچانوے فیصد آبادی مسلمانوں کی تھی، لہٰذا معراج شریف اور شب برات وغیرہ کے تہوار بڑے اہتمام سے منائے جاتے تھے۔ خاص طور پر نمبرداروں کی حویلی میں زبردست چراغاں ہوتا تھا اور ساری رات آتش بازی چلتی تھی۔ صبح تک ہوائیاں چھوٹتی تھیں اور پٹاخے چلتے تھے۔ شاید گنگو اسی تہوار کا ذکر کر کے کچھ سمجھانا چاہ رہا تھا۔ کچھ تو اس کے اشارے عجیب و غریب تھے کچھ بلال شاہ نے افراتفری پھیلائی ہوئی تھی۔ وہ میرے ساتھ موجود تھا اور گنگو کی اشاراتی زبان سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کبھی وہ کہتا کہ گنگو چوری کی کسی پرانی واردات کا اعتراف کر رہا ہے جس میں اس نے آتش بازی کی ایک بڑی دکان کا صفایا کر دیا تھا کبھی انکشاف کرتا کہ گنگو بردہ فروشوں کے گروہ کا

رکن ہے اور مدراس سے اغوا کی ہوئی ایک ولایتی میم ابھی تک اس کے قبضے میں ہے۔ کبھی کہتا کہ گنگو اپنی ماں کے بارے میں بتا رہا ہے جو لاہور کے میو ہسپتال میں زیر علاج ہے۔ معلوم نہیں بلال شاہ کو یہ ساری باتیں کس طرح سمجھ میں آ رہی تھیں اور مدراس، ولایتی میم اور میو ہسپتال کے اشارے وہ کس طرح سمجھ پایا تھا۔ بس یہ بلال شاہ کی باتیں تھیں اور وہی بتا سکتا تھا (بعد ازاں بلال شاہ کے لگائے ہوئے اندازوں میں سے کوئی اندازہ بھی درست ثابت نہیں ہوا) گنگو جب ہمارے سامنے واویلا کرتے کرتے تھک گیا تو اچانک اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ وہ رونے لگا۔ میں اس کا یہ بدلا ہوا روپ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ کہاں چھٹا ہوا بدمعاش اور شرابی غنڈہ اور کہاں یہ بے بسی سے آنسو بہاتا قیدی۔ مجھے پہلی بار گنگو پر ترس آیا اور دل سے یہ آواز آئی کہ مجھے اس کی بات سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ روتے روتے گنگو نے اپنی مٹھی دو تین بار پیشانی پر ماری۔ اس کا چہرہ بے چارگی کی تصویر تھا۔ اچانک وہ میری طرف گھوما اور اس نے سلاخوں میں سے ہاتھ نکال کر میرے پاؤں تھام لیے۔ اس کے بعد ہاتھ جوڑنے لگا اور اشاروں سے سمجھانے لگا کہ میں اسے حوالات سے نکالوں اور اس کے ساتھ کسی جگہ چلوں۔ اس کے انداز میں ایسی عاجزی تھی کہ میں کوشش کے باوجود انکار نہیں کر سکا۔

میں نے سنتری سے کہا اور اس نے چابیوں کا گچھا نکال کر لاک اپ کا دروازہ کھول دیا۔ گنگو باہر نکلا اور ہاتھ کے اشارے سے بتانے لگا کہ میں اس کے ساتھ چلوں اور اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ کر اپنے کانوں سے سن لوں۔ میں نے دیوار سے اپنا جیکٹ نما کوٹ اتار کر پہنا۔ کمر سے ریوالور باندھا اور گنگو سے کہا کہ چلو۔ وہ سر کو زور زور سے نفی میں ہلانے لگا۔ ہاتھ کے اشارے سے بتانے لگا کہ ہمیں کافی دور جانا ہے، بس پر بیٹھنا ہے اور اس وقت تک بس میں بیٹھے رہنا ہے جب تک گھڑی کی چھوٹی سوئی دو چکر مکمل نہیں کر لیتی۔ یعنی ایک طویل سفر درکار ہے...... میرا دھیان فوراً گنگو کے آبائی علاقے کی طرف چلا گیا۔ بلال شاہ سے مجھے معلوم ہوا تھا کہ گنگو شمالی سندھ کے کسی علاقے کا رہنے والا ہے۔ غالباً خیر پور کے قریب کوئی جگہ ہے۔ گنگو سفر کا جو ”حساب کتاب“ بتا رہا تھا اس سے اشارہ ملتا تھا کہ وہ مجھے اپنے پچھلے ٹھکانے پر لے جانا چاہتا ہے۔ شاید اپنے آبائی گاؤں میں یہ ایک ٹیڑھا مسئلہ تھا۔ میں تھانہ چھوڑ کر اتنی دور کیسے جا سکتا تھا۔ اے ایس آئی باجوہ بھی مصروف تھا۔ میں نے سوچا کہ بلال شاہ یا کسی ہیڈ کانسٹیبل کو ساتھ بھیج دوں۔ میں نے بلال شاہ کو آگے کیا تو گنگو زور زور سے نفی میں سر ہلانے لگا۔ اس نے میرا بازو تھام لیا اور منتیں کرنے لگا کہ میں اس کے ساتھ چلوں......

کچھ سوچ بچار کے بعد میں نے گنگو کی بات ماننے کا فیصلہ کر لیا۔ اے ایس آئی باجوہ کو

بلا کر اسے کچھ ضروری ہدایات دیں راستے کے خرچے کے لیے گھر سے کچھ پیسے منگوائے اور سادہ کپڑوں میں گنگو کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ سادہ کپڑوں میں ایک کانسٹیبل بھی میں نے ساتھ لے لیا تھا۔ ہم صبح سات بجے قصبے سے روانہ ہوئے۔ ساڑھے سات بجے والی بس میں بیٹھ کر جالندھر پہنچے۔ جالندھر سے لاہور پہنچتے پہنچتے ہمیں شام ہو گئی۔ اگلے روز نو بجے ہم نے لاہور سے کراچی جانے والی ٹرین پکڑی اور ایک سُست و طویل سفر کے بعد سکھر پہنچ گئے۔ ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا گنگو ہمیں کہاں لے جا رہا ہے۔ بس اس کے پیچھے چلتے جا رہے تھے۔ سکھر اسٹیشن پر اتر کر ہم نے پھر بس پکڑی اور خیر پور کی طرف روانہ ہو گئے۔ خیر پور کے مضافات میں گنگو ہمیں لے کر بس سے اتر گیا اور چند فرلانگ پیدل چلا کر ایک چھوٹے سے ''تانگہ اڈے'' پر جا پہنچا۔ خستہ حال تانگوں پر بیٹھے سندھی تانگہ بان مختلف آوازیں لگا کر مسافروں کو اپنی طرف متوجہ کر رہے تھے۔ یہاں ایک دو تانگہ بان گنگو کے واقف نکل آئے۔ گنگو سے مل کر انہیں سخت حیرانی ہوئی۔ وہ اشاروں میں اس کی خیر خیریت دریافت کرنے لگے۔ لگتا تھا انہوں نے گنگو کو ایک طویل عرصے کے بعد دیکھا ہے۔ ویسے وہ گنگو سے کچھ ڈرے ڈرے بھی تھے۔ انہوں نے ہمیں بھی شک کی نظروں سے دیکھا اور ہم سے کھل کر بات نہیں کی۔ ایک تانگہ بان نے ہمیں تانگے پر سوار کر لیا۔ راستہ بے حد ناہموار اور گرد آلود تھا۔ نہ کوئی سایہ نہ آبادی کا نشان، قریباً آٹھ میل کے ''جوڑا کھاڑ'' سفر کے بعد ہم ایک چھوٹے سے گاؤں میں پہنچے۔ تانگہ بان نے اس گاؤں کا نام متھال پور بتایا اور یہ اطلاع بھی دی کہ گنگو یہیں کا رہنے والا ہے۔

گاؤں میں بھی لوگوں نے گنگو کو حیرت آمیز بیگانگی کے ساتھ دیکھا۔ چند ہی تھے جنہوں نے اس سے سلام دعا کی یا اشاروں میں اس کا حال احوال پوچھا۔ اس دور دراز گاؤں میں زندگی کی سہولتیں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ جھونپڑا نما مکانوں کے درمیان سے گزر کر گندی نالیوں کو پھلانگتے ہوئے ہم ایک چھوٹے سے مکان کے سامنے پہنچ کر رک گئے۔ یہاں دروازے کے سامنے چند ننگ دھڑنگ بچے کھیل رہے تھے۔ گنگو کو دیکھ کر وہ پہلے تو چونکے پھر بھاگ کر اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئے۔ وہ اسے ''چاچا'' کہہ کر بلا رہے تھے۔ گنگو نے سب سے چھوٹے دو بچوں کو گود میں اٹھا لیا اور ان سے پیار کرنے لگا۔ بچوں کا شور سن کر ایک عورت باہر نکل آئی۔ سانولے رنگ کی وہ ایک چوبیس پچیس سالہ گھریلو عورت تھی۔ گنگو کو دیکھ کر وہ پہلے تو بری طرح چونکی پھر اپنا گھونگھٹ سیدھا کرنے لگی۔ گنگو حلق سے ناقابل فہم آوازیں نکال کر اس ''علیک، سلیک'' کر رہا تھا لیکن عورت نے کوئی جواب نہیں دیا اور بچوں کو سمیٹ کر

اندر چلی گئی۔ گنگو اس کے پیچھے ہی گھر میں داخل ہو گیا...... ہم باہر کھڑے رہے اور گاؤں کے آوارہ کتے ہماری شناخت پریڈ کرتے رہے۔ کوئی پانچ منٹ بعد گنگو باہر نکلا اور ہمیں گھر میں لے گیا۔ ایک چھوٹے سے کمرے میں ہمیں میلی سی دری پر بٹھا کر اس نے فٹافٹ ہمارے سامنے کھانے کے برتن رکھ دیے۔ کھانا تو کیا کھانا تھا گنگو کا دل رکھنے کے لیے باسی روٹی اور ٹھنڈے سالن کے چند لقمے لے لیے اور انتہائی گدلا پانی پی کر خدا کا شکر ادا کیا۔

تھوڑی دیر بعد گنگو ہمیں میلی دری والے کمرے سے اٹھا کر دوسرے کمرے میں لے گیا۔ یہاں چارپائی پر ایک بوڑھی عورت لیٹی تھی۔ اس کی اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں اس بات کی گواہ تھیں کہ وہ بیمار ہے۔ غالباً اسے شدید قسم کا یرقان تھا، کیونکہ آنکھوں کی پتلیاں گہری زرد دکھائی دے رہی تھیں۔ تنگ و تاریک کمرے میں دو موڑھے رکھے تھے، ہم ان پر بیٹھ گئے۔ عورت نے ڈبی دار چادر کا پلو اس طرح چہرے پر ڈال رکھا تھا کہ چھوٹا سا گھونگھٹ بن گیا تھا۔ تاہم وہ اس گھونگھٹ کو چہرے سے ہٹا کر بار بار ہمیں دیکھ بھی لیتی تھی۔ گنگو ہمیں بٹھا کر بڑھیا کے سرہانے کھڑا ہو گیا۔ بڑھیا نے اپنی نحیف آواز میں بتایا کہ وہ گنگو کی ماں ہے اور آج سے قریباً چار مہینے پہلے وہ بیٹے سے ملنے پنجاب گئی تھی اور جالندھر کے اس دور دراز علاقے میں پہنچی تھی۔

میں نے بڑھیا سے کہا۔ ''اماں جی! ہم بڑی دور سے صرف آپ کی بات سننے کے لیے یہاں آئے ہیں۔ اگر آپ اپنے بیٹے کے بارے میں ذرا تفصیل سے بتا دیں تو بہت مہربانی ہو گی۔''

بڑھیا نے آنکھوں میں آنسو بھر لیے اور گلوگیر لہجے میں بولی۔ ''تھانیدار صاحب! میرا بیٹا اس معاملے میں بالکل بے قصور ہے۔ اگر کسی کا قصور ہے تو میرا ہے۔ میرے ہی کہنے پر اس نے یہ سب کچھ کیا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''اماں جی! میں پھر عرض کروں گا کہ آپ شروع سے بات بتائیں تاکہ میں کچھ سمجھ سکوں۔''

جواب میں بڑھیا نے جو کچھ کہا اور جو کچھ ہم نے اس سے کہلوایا اس کا مختصر احوال یہ ہے۔

بڑھیا کے چار بیٹے تھے، جن میں سے ایک عبدالغنی (گنگو) تھا۔ شروع میں اپنے دوسرے بھائیوں کی طرح وہ بھی سیدھا سادا محنت کش تھا۔ کھیتی باڑی میں اپنے تینوں بڑے بھائیوں کا ہاتھ بٹاتا تھا اور ماں باپ کا فرمانبردار تھا لیکن پھر ایک واقعہ ایسا ہوا جس نے گنگو کو

غلط راہوں پر ڈال دیا۔ گنگو کی بڑی بہن کی شادی تھی۔ سارے بھائی جہیز جوڑنے کے لیے سخت کوشش کر رہے تھے۔ گنگو نے ایک کھیت ٹھیکے پر لے رکھا تھا۔ فصل بالکل تیار کھڑی تھی اور گنگو کو امید تھی کہ وہ اس فصل سے دو تین سو روپیہ بچانے میں کامیاب ہو جائے گا لیکن ایک رات زمیندار پیر سونگی کے بندوں نے شرارت کی اور اپنے مویشی گنگو کے کھیت میں چھوڑ دیے۔ صبح گنگو نے کھیت کی حالت دیکھی تو سر پیٹ لیا۔ وہ فریاد لے کر پیر سونگی کے ڈیرے پر پہنچا لیکن اس نے گنگو کا نقصان پورا کرنے کی بجائے اس کی پٹائی کر دی۔ پیر سونگی کا کہنا تھا کہ گنگو اپنے کھیت کے پاس سے کسی کو گزرنے نہیں دیتا اور راہگیروں کا راستہ روکتا ہے۔ گنگو بہت رویا چلایا لیکن کسی نے اس کی فریاد نہیں سنی۔ غصے سے بے قابو ہو کر گنگو نے پیر سونگی پر حملہ کر دیا۔ اس نے پیر سونگی کو تو کیا نقصان پہنچانا تھا...... ہاں اپنے لیے بہت برا کیا۔ پیر سونگی کے آدمیوں نے اسے مار مار کر ادھ موا کر دیا اور گاؤں کی حدود سے باہر جا پھینکا۔ پیر سونگی کے حکم کے مطابق اس کا گاؤں میں داخلہ بند ہو چکا تھا۔

گنگو کی بہن کی شادی ہوئی۔ اس کا باپ مرا، اس کی ماں کو جان کے لالے پڑے لیکن وہ کسی موقع پر گاؤں میں داخل نہیں ہو سکا۔ پے در پے صدموں نے گنگو کو غلط صحبت کا شکار کر دیا۔ وہ جرائم پیشہ نوجوانوں میں اٹھنے بیٹھنے لگا یہاں تک کہ خود بھی مجرم بن گیا۔ اب کئی تھانوں میں اس کا نام لکھا ہوا تھا۔ اس کے بھائی اس سے ناطہ توڑ چکے تھے اور گاؤں کے لوگ بھی اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے...... لیکن ایک رشتہ ابھی قائم تھا...... اور یہ ماں بیٹے کا رشتہ تھا۔ گنگو اس گاؤں میں داخل نہیں ہو سکتا تھا لیکن ماں تو گنگو سے ملنے اس گاؤں سے نکل سکتی تھی...... اور چار ماہ پہلے وہ ایک روز نکل کھڑی ہوئی۔ اسے کسی طرح پتہ چل گیا تھا کہ اس کا گنگو جالندھر کے قریب ایک قصبے میں ہے۔ اس نے دوسرے بیٹوں سے چوری چوری تیاری کی۔ کچھ پیسے جمع کیے اور اپنے ایک نوعمر بھتیجے کو لے کر چپکے سے ''ممتا'' کے سفر پر روانہ ہو گئی...... وہ خیر پور کے اس دور دراز گاؤں سے گنگو تک کیسے پہنچی اور اپنے بیٹے کی صورت دیکھنے کے لیے اسے کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑے۔ یہ ایک طویل کہانی ہے...... قصہ مختصر کہ پیاسی ممتا اپنے جگر گوشے تک جا پہنچی۔ ایک شام گنگو کندھے سے ریوالور لٹکائے نمبردار رمضان کی حویلی سے باہر آ رہا تھا کہ چادر میں لپٹی ایک بدحال عورت اس کے سامنے آ گئی۔ یہ اس کی مصیبت ماری ماں تھی۔ گنگو ماں کو اپنے روبرو پا کر سخت پریشان ہوا۔ خیر پور کی پولیس اس کی تلاش میں تھی۔ وہ ہر صورت اپنے ماضی سے دور رہنا چاہتا تھا...... لیکن سامنے ماضی نہیں ماں تھی۔ جس کا دودھ گنگو کی شریانوں میں دوڑتا تھا اور جس کے بوسے ابھی تک اس کی پیشانی پر چمکتے

تھے۔ بے شمار گناہوں کی سیاہی بھی ان بوسوں کی چمک ماند نہیں کر سکی تھی۔ وہ ماں کو اپنے کمبل میں لپیٹ کر خاموشی سے حویلی میں لے آیا۔ یہاں نمبردار نے رہنے کے لیے ایک علیحدہ کمرہ دے رکھا تھا۔ یہ کمرہ حویلی کی اصل عمارت سے ذرا ہٹ کر تھا۔ گنگو نے بڑی ہوشیاری سے یہاں اپنی والدہ کو چھ سات روز رکھا اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونے دی۔ وہ کسی کام سے جاتا تو کمرے کو باہر سے تالا لگا جاتا اور اس کی ماں خاموشی سے اندر بیٹھی رہتی۔ وہ گنگو کو بتا چکی تھی کہ اس کا ایک دور پار کا بھتیجا بھی اس کے ساتھ ہے اور قصبے کی مسجد میں ٹھہرا ہوا ہے۔ گنگو نے مسجد میں ہی اس کے قیام کا انتظام کر دیا تھا...... ایک روز عجیب واقعہ ہوا راجہ انوار کے چہلم کا انتظام ہو رہا تھا۔ گنگو کسی کام سے شہر گیا ہوا تھا۔ کمرے میں اس کی ماں اکیلی تھی۔ باہر سے تالا لگا ہوا تھا۔ برآمدے کی طرف سے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ گنگو کی ماں نے سنا نمبردار رمضان کسی عورت سے باتیں کر رہا تھا۔ احاطے میں لگے ہوئے چھوٹے پودوں کے درمیان ٹہلتے وہ کمرے کی کھڑکی کے بالکل پاس آن رکے۔ نمبردار رمضان اپنی بیوی کو دوسری شادی کے لیے منا رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

''نذیراں! مجھ سے اشٹام لکھوا لے۔ قرآن اٹھوا لے مجھ سے...... جو میں کہہ رہا ہوں وہی ہو گا۔ تیرے بچوں کی جائیداد میں کوئی حصے دار نہیں بنے گا، یہ میرا وعدہ ہے تجھ سے، تیری سوکن اس حویلی میں صرف تین مہینوں کی مہمان ہو گی۔ شب برات کے دن آتش بازی کے ساتھ وہ بھی چل جائے گی۔ تیری آنکھوں کے سامنے جل کر مرے گی...... اور یہ بھی میں تجھے زیادہ سے زیادہ وقت دے رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے اس سے پہلے ہی کوئی اچھا سبب بن جائے...... میری بات سمجھ رہی ہو ناں تم؟'' نمبردارنی خاموش تھی۔ اس کی خاموشی سے نیم رضامندی کے اشارے مل رہے تھے۔ نمبردار رمضان نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ''نذیراں تُو جانتی ہے میرے سینے میں بھانبھڑ جل رہا ہے۔ یہ اسی صورت ٹھنڈا ہو گا کہ نذر حسینی کی بیٹی میرے ہاتھوں برباد ہو اور اپنے انجام کو پہنچے۔ تُو میری جیون ساتھی ہے۔ اگر اس موقعے پر تُو نے میرا ساتھ نہ دیا تو مجھے ساری حیاتی دکھ رہے گا......''

اندر بند کمرے میں ماں یہ باتیں سن کر حیران ہو رہی تھی۔ کچھ دیر بعد نمبردار اور اس کی بیوی دوسری طرف چلے گئے۔ شام کو گنگو واپس آیا تو اس کی ماں نے اسے ساری بات بتائی۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے گونگے کی رمزیں گونگے کی ماں ہی جانتی ہے۔ اس نے گنگو کو جنم دیا تھا، اسے پالا پوسا تھا۔ ایک ایک پور اسے بڑھتا پھولتا دیکھتی رہی تھی۔ وہ گنگو کی زبان کیوں نہ سمجھتی اور گنگو اس کی باتوں سے کیوں بے خبر رہتا۔ ماں نے اپنے گونگے بیٹے کو وہ سب کچھ

بتایا جو اس نے سنا تھا اور ساتھ ہی کہا کہ وہ اس بدنصیب لڑکی کو بچانے کی کوشش کرے۔ وہ بھی کسی کی بیٹی ہوگی۔ کسی باپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہوگی۔ جہاں وہ برے کاموں کے لیے جان مصیبت میں ڈالتا رہا ہے، وہاں ایک اچھے کام کے لیے بھی کوشش کرے۔

ماں کا کہنا گنگو کے لیے حکم کا درجہ رکھتا تھا۔ اس نے دل میں ارادہ کرلیا کہ وہ نذر حسینی کی بیٹی کو موت کے پھندے سے بچانے کی پوری کوشش کرے گا۔ دو تین دن بعد گنگو کی ماں جس خاموشی سے آئی تھی اسی خاموشی سے اپنے بھتیجے کے ساتھ واپس چلی گئی...... گنگو نے نذر حسینی سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ کئی دن موقعے کی تلاش میں رہا۔ اس کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ اس کی بے زبانی تھی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس بات کو تمام باریکیوں کے ساتھ نذر حسینی کے سامنے کیسے بیان کرے۔ ایک رات وہ نذر حسینی کے دروازے پر جا پہنچا۔ اس نے نذر حسینی سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن وہ کچھ اور ہی مطلب لینے لگا...... گنگو کی شہرت اچھی نہیں تھی اور یوں بھی وہ نصف شب کے وقت حسینی کے دروازے پر کھڑا تھا۔ حسینی گھبرا گیا اور اس نے گنگو کو دروازے سے باہر دھکیلنے کی کوشش کی۔ گنگو وہاں سے مایوس لوٹ آیا...... تاہم چند روز بعد اسے ایک اور موقعہ ملا۔ خالدہ باپ کو کھانا پہنچا کر کھیت سے اکیلی واپس آ رہی تھی۔ گنگو نے نہایت عاجزی کے ساتھ اس سے رکنے اور بات سننے کی گزارش کی۔ سابقہ تجربے کی روشنی میں خالدہ بھی اس سے ڈر گئی...... وہ جتنا واویلا کر رہا تھا وہ اتنی ہی خوفزدہ ہوتی چلی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ کھانے کے برتن پھینک کر وہاں سے بھاگ نکلی۔

اسی دوران ''اندر خانے'' نمبردار رمضان نے خالدہ کے گھر والوں پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا تھا اور آہستہ آہستہ انہیں اپنے راستے پر لا رہا تھا...... آخر یہ نوبت آئی کہ نذر حسینی نے بیٹی کا ہاتھ نمبردار رمضان کے ہاتھ میں دینے کا فیصلہ کرلیا۔ یہ فیصلہ بہت رازداری سے کیا گیا تھا اور صرف چند خاص افراد کو اس کا علم تھا۔ پتہ نہیں کس طرح گنگو بھی ان خاص افراد میں شامل ہوگیا۔ یہ جان کہ کر خالدہ کو موت کے منہ میں بھیجنے کی تیاری مکمل ہو چکی ہے اس کی بے قراری عروج پر پہنچ گئی۔ اس نے ایک بار پھر نذر حسینی سے بات کرنے کی کوشش کی اور اس کی کوشش میں ناکام ہو کر خالدہ کو اس چنگل سے نکالنے کا فیصلہ کرلیا۔ ایک ٹھٹھری ہوئی شام کو اس نے گھات لگائی اور خالدہ کو گھوڑے پر بٹھا کر قصبے سے بھاگ نکلا۔ بدقسمتی سے لوگ ان کے پیچھے لگ گئے اور نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے تعاقب کر کے اسے یخ بستہ جوہڑ کے اندر سے جا پکڑا...... اس کے بعد گنگو جیل پہنچ گیا اور خالدہ اپنی زندگی کی سب سے بڑی بدقسمتی کا شکار ہو

کر نمبردار کے حجلہ عروسی میں داخل ہوگئی...... اس شادی کے موقعے پر گنگو جیل کی چار دیواری میں تلملا رہا تھا لیکن کر کچھ نہیں سکتا تھا...... شادی کے قریباً دو ہفتے بعد ایک روز اتفاقاً اسے جیل سے بھاگ نکلنے کا موقعہ مل گیا۔ اس نے اس موقعے سے پورا فائدہ اٹھایا اور بھاگ کر واپس قصبے آ گیا۔ ماں کا کہا ہر وقت اس کی آنکھوں کے سامنے رہتا تھا۔ وہ کسی بھی قیمت پر خالدہ کی جان بچانا چاہتا لیکن مشکل یہ تھی کہ کوئی اس کی بات سمجھ نہیں رہا تھا۔ جن سے وہ دشمنی مول لے رہا تھا وہ تو اسے بُرا سمجھتے ہی تھے جن کی مدد کرنا چاہ رہا تھا وہ بھی اس سے نفرت کر رہے تھے...... ایسے میں اس کا دھیان پھر ماں کی طرف چلا گیا۔ ماں ہی وہ واحد ہستی تھی جو اس راز میں اس کی شریک تھی...... لیکن ماں یہاں نہیں تھی۔ وہ سینکڑوں میل کے فاصلے پر اس دور دراز گاؤں میں تھی اور اس گاؤں میں گنگو کا داخلہ بھی بند تھا۔ وہ کیا کرتا؟ موت کے سائے تیزی سے ''بدقسمت لمبڑی'' کی طرف بڑھ رہے تھے۔ شب برات میں چند دن باقی تھے اور حویلی میں کسی بھی وقت ایک بے گناہ کے خون کی ہولی کھیلی جانے والی تھی۔ گنگو نے ایک بار پھر خالدہ کو موت کے پھندے سے نکالنے کی کوشش کی۔ اس نے کہیں سے ایک خنجر حاصل کیا اور نتائج سے بے پروا ہو کر حویلی میں گھس گیا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ نئی نویلی دلہن تک پہنچ سکتا، پولیس پھر اس کے راستے میں رکاوٹ بنی اور وہ پکڑ لیا گیا۔

یہ روئیداد سنسنی خیز تھی۔ گنگو کی ماں نے شب برات کا ذکر کیا تھا اور شب برات میں صرف دو روز باقی تھے۔ میں نے سوالیہ نظروں سے گنگو کی طرف دیکھا۔ وہ بدستور ماں کے سرہانے کھڑا تھا۔ اب اس کے چہرے پر غصے کی سرخی تھی اور آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ وہ مجھ سے مخاطب ہو کر تیز تیز بولنے لگا۔ ''غوں غاں غاں غاں غوں غاں......'' ساتھ ساتھ وہ دونوں ہاتھوں کو حرکت دے رہا تھا۔ کبھی اپنے جسم کی چوٹیں دکھانے لگتا تھا۔ کبھی گریبان کھول کر مجھے گولی چلانے کی دعوت دینے لگتا تھا۔ آنسو مسلسل اس کی آنکھوں سے رواں تھے۔ غالباً وہ دکھ کا اظہار کر رہا تھا کہ ہم نے اسے غلط سمجھا اور اس کی ''بھلائی'' کے بدلے اسے ذلیل و رسوا کیا۔ میں نے اٹھ کر اس کا کندھا تھپتھپایا اور معذرت کے الفاظ کہے۔ وہ بار بار مجھے اپنی کلائی دکھانے لگا۔ جہاں اجے سنگھ کی رائفل لگنے سے شدید چوٹ آئی تھی...... دفعتاً دروازے کی طرف سے شور و غل سنائی دیا۔ دروازے پر ملنے والی عورت جو گنگو کی بڑی بھابی تھی تیزی سے اندر آئی اور جلے کٹے انداز میں بولی۔

''تجھے کہاں تھا ناں، تو ہم سب کے لیے مصیبت کھڑی کرے گا...... لے اب سنبھال وہ آ گئے ہیں تیری ٹانگیں چیرنے والے۔''

گنگو کی ماں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ''ہائے میرا پتر'' اس کے حلق سے گھٹی گھٹی آواز نکلی۔ گنگو نے ہراساں نظروں سے میری طرف دیکھا۔ اتنے میں دروازے پر زوردار دستک ہوئی میں باہر نکلا۔ تین ہٹے کٹے لاٹھیال دروازے پر کھڑے تھے۔ دس پندرہ قدم دور بھاری بھرکم مونچھوں والا ایک ''وڈیرانما'' شخص سندھی ٹوپی پہنے گھوڑے پر بیٹھا تھا۔

میں باہر نکلا تو ایک لاٹھیال نے کڑے لہجے میں پوچھا ''کون ہو تم؟''

میں نے لاٹھیال کو ایک طرف ہٹایا اور مستحکم قدموں سے چلتا گھڑ سوار کے سامنے پہنچ گیا۔ تعارف سے پہلے ہی میں جان چکا تھا کہ یہی شخص پیر سونگی ہے۔ میں نے جیب سے اپنا شناختی کارڈ نکال کر اسے دکھایا۔ کارڈ دیکھ کر پیر سونگی گھوڑے سے نیچے اتر آیا۔ اس کا چہرہ بھی ذرا نرم پڑ گیا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ گنگو ایک کیس میں ملوث ہے۔ میں اسے تفتیش پر یہاں لایا ہوں اس کی ماں سے چند باتیں پوچھنا تھیں۔

پیر سونگی نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔ ''پھر تو ٹھیک ہے سائیں...... ورنہ آج ہم نے اس حرام زادے کی ہڈی پسلی ایک کر دینی تھی۔ یہ گاؤں کی کمیٹی کا فیصلہ ہے کہ یہ بدمعاش گاؤں کی حد میں قدم نہیں رکھے گا۔''

پیر سونگی اس بارے میں مزید تفصیل بھی بتانا چاہتا تھا لیکن میں نے دلچسپی ظاہر نہیں کی...... پھر وہ ٹوہ لینے لگا کہ گنگو پر کیا کیس بنا ہوا ہے۔ میں نے مختصر الفاظ میں اس کی تسلی کی اور چلتا کیا۔ تھوڑی دیر بعد میں گنگو کو لے کر ''متھال پور'' نامی اس خستہ حال گاؤں سے روانہ ہو رہا تھا۔

ہم جلد از جلد واپس جالندھر پہنچنا چاہتے تھے لیکن یہ کوئی آسان سفر نہیں تھا۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں ہم مختلف سواریاں بدل کر قریباً چھتیس گھنٹے میں یہاں پہنچ پائے تھے۔ واپسی پر بھی کم وبیش اتنی ہی دیر لگنی تھی۔ اب سب کچھ ٹھیک ٹھاک رہتا تو ہم شب برات سے صرف ایک روز پہلے جالندھر پہنچ سکتے تھے۔ حتی الامکان تیزی سے ہم نے سفر شروع کیا اور مختلف مرحلوں سے گزرتے ہوئے اگلے روز سہ پہر چار بجے لاہور ریلوے اسٹیشن پہنچ گئے۔ یہاں سے ہم نے بس پکڑی اور جالندھر روانہ ہو گئے۔ بس میں سفر کے دوران مسافروں کی گفتگو سے مجھ پر یہ خوفناک انکشاف ہوا کہ شب برات کا تہوار کل نہیں بلکہ آج ہے...... میں سناٹے میں رہ گیا...... یہ کوئی چاند وغیرہ کا چکر تھا۔ ہم سکھر کے حساب سے کل شب برات سمجھ رہے تھے جبکہ یہاں آج ہی منڈیروں پر چراغاں ہو رہی تھی۔ سفر کی افراتفری میں ہمیں تاریخوں کا حساب نہیں رہا تھا اور یہ لاعلمی ایک سنگین غلطی کی صورت اختیار کر گئی تھی۔ آج شب برات تھی اور آج نمبردار رمضان

کی حویلی میں...... کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ شام کی اذانیں تو ہمیں امرتسر کے نواح میں ہی ہو گئی تھیں۔ اب گزرتے وقت کے ساتھ اندھیرا گہرا ہو رہا تھا۔ جالندھر ابھی پچیس تیس میل دور تھا کہ بس کے انجن میں کوئی خرابی واقع ہو گئی اور ڈرائیور اس کا بونٹ کھول کر بیٹھ گیا۔ میں نے ایک پرائیویٹ کار کو ہاتھ دے کر روکا اور اس سے جالندھر تک کے لیے لفٹ طلب کی۔ وہ بخوشی راضی ہو گیا۔ راستے میں جب ہم نے اسے اپنی ایمرجنسی کے متعلق بتایا تو وہ بھلا مانس مزید تعاون پر تیار ہو گیا۔ اس نے کہا کہ وہ ہمیں اپنی کار میں قصبے تک پہنچائے گا۔

جس وقت ہم قصبے میں داخل ہوئے رات کے نو بج چکے تھے۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے اس قصبے میں بیشتر آبادی مسلمانوں کی تھی۔ اسلامی تہوار یہاں زبردست جوش وخروش اور مقابلے کی فضا میں منائے جاتے تھے۔ ہندوؤں کی دیوالی کا جواب مسلمان شب برات میں دیتے تھے اور گلیوں بازاروں میں رات گئے تک ہلا گلا جاری رہتا تھا۔ قوالیاں ہوتی تھیں مسجدیں سجائی جاتی تھیں، چمکیلے لباسوں والے بچے زردے اور حلوے کی رکابیاں لیے اِدھر سے اُدھر بھاگے پھرتے تھے۔ ہم قصبے میں پہنچے تو یہ ساری رونقیں موجود تھیں۔ ہماری گاڑی قصبے کے پُرہجوم چوراہے سے گزری اور نمبردار کی حویلی کو جانے والے راستے پر مڑ گئی۔ سامنے ہی حویلی کی روشنیاں نظر آنے لگیں۔ حویلی گھی کے چراغوں اور موم بتیوں سے جھلمل کر رہی تھی۔ حویلی کی چھت پر آتش بازی چھوٹ رہی تھی اور بچے پھلجھڑیاں ومہتابیاں لیے اِدھر سے اُدھر بھاگے پھر رہے تھے۔ نمبردار کی حویلی کے سامنے ہی ایک دوسرے زمیندار کی حویلی تھی، وہاں بھی چھت پر مردوزن کا ہجوم تھا۔ چیخ وپکار ہو رہی تھی اور ایک دوسرے کے مقابلے میں ہوائیاں چھوڑی جا رہی تھیں۔ گاڑی نمبردار کی حویلی کے عین سامنے رکی۔ میں نے دروازے پر دستک دی۔ ایک کارندہ باہر آیا۔ میں نے اسے نمبردار کو بلانے کا کہا۔ تھوڑی ہی دیر بعد نمبردار میرے سامنے تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ حیران ہو رہا تھا۔

''خیریت تو ہے تھانیدارا!'' اس نے اپنی نوکدار مونچھوں کو چھوٹی انگلی سے سہلاتے ہوئے کہا۔

''میں تم سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''آؤ...... آؤ...... ست بسم اللہ!'' اس نے دروازہ پورا کھول دیا اور مجھے ساتھ لے کر بیٹھک میں چلا آیا۔ ابھی ہم آمنے سامنے بیٹھے ہی تھے کہ ایک میٹھی سریلی آواز آئی ''چوہدری جی'' اور اس کے ساتھ ہی ایک سرو قد لڑکی چھم سے اندر آ گئی چمکیلے ریشمی لباس اور خوبصورت گہنوں میں وہ ''تصویر'' نظر آ رہی تھی۔ میں نے پہچان لیا۔ وہ نوبیاہتا خالدہ تھی۔ اس کے

ہاتھوں میں حلوے کی پلیٹ تھی۔ غالباً وہ چوہدری کو تنہا سمجھ کر یہاں آئی تھی...... اور مجھے بیٹھا دیکھ کر ٹھٹک کر رہ گئی تھی۔ اس کی کشادہ آنکھیں، کھلا ہوا منہ اور حیرت زدہ چہرہ...... ایک خوبصورت منظر میری آنکھوں میں چمک کر غائب ہو گیا۔ وہ جتنی تیزی سے آئی تھی اس تیزی سے واپس چلی گئی۔ نمبردار مسکرانے لگا۔ کتنی بے ضرر مسکراہٹ تھی۔ میں یہ سوچ کر حیران رہ گیا کہ یہ مسکراتا ہوا چوہدری آج ایک بے گناہ عورت کو قتل کرنے کا ارادہ رکھتا ہے...... اور وہ عورت اپنے انجام سے بے خبر ابھی ایک معصوم ادا کے ساتھ یہاں کھڑی تھی۔ کتنی ناقابل یقین بات لگتی تھی لیکن ایسی ناقابل یقین بھی نہیں تھی۔ انسان بہروپیا ہے۔ اس کے روپ پیاز کے چھلکے کی مانند تہہ در تہہ ہوتے ہیں۔

میں نے نمبردار رمضان علی کی گہری بادامی آنکھوں میں دیکھا۔ کھڑکی سے باہر گلی میں ایک انار چھوٹ رہا تھا اور اس کی روشنی میں نمبردار کا سرخ وسپید چہرہ تمتما رہا تھا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''نمبردار رمضان! میں تمہیں گرفتار کرنے آیا ہوں۔''

میرے الفاظ دھماکے کی طرح کمرے میں گونجے۔ ''کیا...... کیا کہہ رہے ہو؟'' نمبردار کا چہرہ ایک لمحے میں تاریک ہو گیا۔

''میں غیر ملکی زبان میں بات نہیں کر رہا۔ میں تمہیں گرفتار کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ میرا کام جرم کی تفتیش کرنا ہی نہیں جرم روکنا بھی ہے۔''

''تت...... تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا۔'' کمبخت نمبردار پھٹ پڑا۔ وہ صوفے سے کھڑا ہو گیا تھا اور اس کا سارا جسم غصے سے لرز رہا تھا۔ اس کی بلند آواز سن کر ملازم بھی بیٹھک میں داخل ہو گئے۔ ان میں سے دو کے کندھوں پر رائفلیں جھول رہی تھیں۔ جب انہیں پتہ چلا کہ میں نمبردار کو گرفتار کرنے آیا ہوں تو ان کے تیور بھی خطرناک نظر آنے لگے۔ ایک ملازم بولا۔

''تہوار کی خوشی میں کہیں آپ نے بوتل تو نہیں چڑھا لی۔''

میں نے کہا۔ ''میں پوری ہوش میں ہوں اور ابھی تم لوگوں کے بھی ہوش ٹھکانے آنے والے ہیں۔'' اتنے میں نمبردار کا ایک بندہ بھاگتا ہوا اندر آیا۔ نمبردار سے کہنے لگا۔ ''باہر پولیس آئی ہے جی، اے ایس آئی ہے، حوالدار ہے اور ساتھ آٹھ دس سپاہی ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''نمبردار! اب یہ فیصلہ تم نے کرنا ہے کہ خاموشی کے ساتھ تھانے چلو گے یا شور شرابا کر کے اور ہتھکڑیاں لگوا کر۔''

نمبردار کا سرخ وسپید چہرہ ''مٹی رنگا'' ہو چکا تھا۔ اب صورتِ حال کی نزاکت اس کی سمجھ میں آتی جا رہی تھی۔ اس نے کمرے میں موجود تینوں ملازموں سے کہا۔ ''میں تھانیدار

کے ساتھ تھانے جا رہا ہوں۔ ابھی اس کی تسلی کرا کے آ جاتا ہوں۔ تم کسی کو خبر نہ ہونے دینا۔''

ملازموں نے اطاعت مندی سے سر جھکایا۔ میں نمبردار کو ساتھ لے کر حویلی سے باہر آ گیا۔ تھانے پہنچ کر میں نے نمبردار کے ساتھ آنے والے خاص ملازم کو بھی تفتیش میں بٹھا لیا۔ دونوں سے علیحدہ علیحدہ پوچھ گچھ شروع کی گئی۔ میں نے جب نمبردار سے کہا کہ وہ آج اپنی دوسری بیوی خالدہ کو قتل کرنے کا ارادہ رکھتا تھا تو وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر میری طرف دیکھنے لگا۔ ''اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ تم نشے میں ہو......'' دوسری طرف نمبردار کا ملازم خاص شاہو ملتانی بھی کسی ایسے منصوبے سے لاعلمی کا اظہار کر رہا تھا۔ میں جانتا تھا شاہو نمبردار کا دستِ راست ہے اور اسے کچھ نہ کچھ ضرور خبر ہو گی لیکن وہ بالکل بے خبر بنا ہوا تھا۔

ابھی ہم نمبردار رمضان اور شاہو ملتانی سے پوچھ گچھ کر ہی رہے تھے کہ قصبے کی شمالی طرف سے ایک زبردست دھماکے کی آواز آئی۔ یوں لگا جیسے کئی گرینیڈ ایک ساتھ پھٹ گئے ہیں۔ میں نے باجوہ کی طرف اور باجوہ نے بلال شاہ کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ہم تینوں جلدی سے اٹھ کر باہر آئے۔ کچھ سمجھ نہیں آئی کہ دھماکہ کس طرف ہوا ہے۔ میں نے بلال شاہ کو پتہ کرنے بھیجا۔ تھوڑی ہی دیر بعد بلال شاہ بھاگتا ہوا واپس آیا لیکن وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ آٹھ دس آدمی تھے۔ انہوں نے دو لہولہان بچوں کو ہاتھوں میں اٹھایا ہوا تھا۔

''کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

بلال شاہ نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''نمبردار کی حویلی میں آتش بازی پھٹ گئی ہے چھت کی پوری مٹی اڑ کر نیچے گلی میں جا گری ہے۔ سیڑھیوں میں بھی آگ لگی ہوئی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''یہ بچے کون ہیں؟''

بلال شاہ بولا۔ ''یہ بڑا تو نمبردار کا بیٹا ہے، دوسرا کوئی مہمان ہے۔''

ایک شخص بولا۔ ''مہمان نہیں...... شاہو ملتانی کا بیٹا ہے۔ ایک ہی بچہ ہے بیچارے کا۔''

میں نے دیکھا بچے کا سارا پیٹ جلا ہوا تھا اور بایاں ہاتھ بری طرح زخمی تھا۔ شاہو ملتانی وہی ملازم تھا جسے میں نے نمبردار کے ساتھ تفتیش میں بٹھایا ہوا تھا۔ میں نے بلال شاہ سے کہا کہ وہ شاہو ملتانی کو لے آئے۔ پھر لوگوں کے ساتھ مل کر دونوں بچوں کو اپنی جیپ میں ڈالا...... اے ایس آئی کو ضروری ہدایات دیں...... اور حتی الامکان رفتار سے جالندھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

☆======☆======☆

جالندھر کے سول ہسپتال میں ایک گھنٹے کے دوران تین اور زخمی لائے گئے۔ ان میں

ایک بچہ اور دو مرد تھے۔ یہ تینوں بھی نمبردار کی حویلی میں زخمی ہوئے تھے۔ زخمیوں میں شاہو کا بیٹا بری طرح جلا تھا لیکن اس سے بھی زیادہ خراب حالت نمبردار رمضان کے بیٹے کی تھی۔ دھماکے میں نہ صرف اس کا چہرہ جھلسا تھا بلکہ وہ چھت سے بھی نیچے جا گرا تھا۔ اس کو شدید اندرونی ضربیں آئی تھیں۔ پتہ چلا کہ قریبی حویلی سے ایک بڑی ہوائی اڑ کر اس مٹی میں جا گری تھی جہاں نمبردار نے آتش بازی کا ڈھیر لگا رکھا تھا۔ اس رات سول ہسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں جیسے پورا قصبہ اُمڈ آیا تھا۔ ہر چہرہ پریشانی کی تصویر بنا ہوا تھا۔ رات قریباً ایک بجے معلوم ہوا کہ نمبردار کا بیٹا پرویز جاں بحق ہو گیا ہے۔ نمبردار کے رشتے دار جو وہاں موجود تھے رونے پیٹنے لگے...... اس وقت میں نے نمبردار کے ملازم خاص شاہو کو دیکھا۔ میں اس کے قریب جا بیٹھا۔ میں نے کہا۔

”شاہو! خدا کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے۔ آج کی رات نمبردار ایک بے گناہ کی جان لینا چاہتا تھا مگر قدرت نے اس سے اس کا بیٹا چھین لیا۔ تمہیں معلوم ہے کہ نمبردار نے سازش کی ہے پھر تم خاموش رہ کر اس کے جرم میں شریک کیوں بن رہے ہو......“

اس گھڑی شاہو کا دل موم کی طرح نرم تھا۔ میری ایک ہی بات سے وہ پگھل کر پانی ہو گیا۔ اس نے اپنا چہرہ صافے میں چھپا لیا اور زار و قطار روتے ہوئے اقرار کیا کہ نمبردار رمضان نے ”چھوٹی لمبڑی“ کی جان لینے کا منصوبہ بنا رکھا تھا۔ آتش بازی کے دوران اس کے کپڑوں کو آگ لگا دی جانی تھی...... اور اس آگ نے اسے چھت پر ہی جلا کر بھسم کر دینا تھا...... یہ کام رات دس بجے کے بعد اس وقت کیا جانا تھا جب سب لوگ نیچے احاطے میں لنگر کھلنے کا منظر دیکھ رہے ہوتے۔

☆======☆======☆

شہادتیں اتنی ٹھوس تھیں کہ نمبردار کے خلاف قتل کی منصوبہ بندی کا الزام ثابت ہوا۔ اس کے علاوہ عدالت نے یہ بات بھی تسلیم کی کہ ملزم نے نذر حسینی کی دختر مسماۃ خالدہ سے نکاح کرنے کے لیے خالدہ کے لواحقین پر ناجائز دباؤ ڈالا۔ انہیں جان سے مارنے اور ان کے بچے اغوا کرنے کی دھمکیاں دیں اور کہا کہ اگر انہوں نے پولیس کی مدد حاصل کرنے کی کوشش کی تو سب کو زندہ جلا دیا جائے گا۔ تفتیش کے دوران مجھ پر یہ انکشاف بھی ہوا کہ شادی سے ایک ماہ پہلے نمبردار کے بندے نذر حسینی کو زبردستی اپنے ڈیرے پر لے گئے تھے اور دو دن اسے وہاں محبوس رکھ کر دباؤ ڈالتے رہے تھے (اس واردات کی شہادتیں بھی عدالت کو پیش کر دی گئی تھیں)

خالدہ کی جان بچ گئی...... (اس نے نمبردار سے خُلع حاصل کر لیا۔ کچھ عرصہ بعد والدین نے ایک مناسب جگہ دیکھ کر اس کی شادی کر دی۔ خاوند سرکاری ملازم اور شریف آدمی تھا۔ چند ماہ بعد اس کا تبادلہ ہوا اور وہ بیوی کو لے کر الٰہ آباد چلا گیا) نمبردار کے ملازم خاص شاہو ملتانی کے اکلوتے بیٹے کی جان بھی بچ گئی تھی۔ اس واقعے نے اس پر اتنا اثر کیا کہ اس کی زندگی بدل کر رکھ دی۔ جس روز سیشن کورٹ میں نمبردار کی پہلی پیشی ہوئی، وہ مجھے کچہری کے احاطے میں ملا۔ اس نے داڑھی رکھ لی تھی اور ماتھے پر محراب تھا۔ وہ ایک بدلا ہوا شخص نظر آتا تھا۔

اس واقعے کا سب سے اہم کردار غنی عرف گنگو ہے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جنہیں حالات کی آندھی جرم کے تاریک غار میں دھکیل دیتی ہے لیکن گہری تاریکیوں میں ہونے کے باوجود ان کے اندر روشنی کی ایک کرن موجود رہتی ہے۔ یہ روشنی کبھی کبھی چمک کر ہر طرف اجالا بکھیر دیتی ہے۔ ماں کا کہا مانتے ہوئے اس شخص نے بغیر کسی غرض و لالچ کے جان کی بازی لگائی تھی اور ایک بے گناہ لڑکی کی زندگی بچانے میں کامیاب رہا تھا۔ میں گنگو سے متاثر تھا اور چاہتا تھا کہ اس کے حالات بہتر بنانے کی کوشش کروں۔ ایک روز میں نے اسے بلایا اور سمجھایا کہ وہ اس وقت ایک مفرور قیدی ہے۔ پہلے وہ اپنی گرفتاری پیش کرے پھر میں تھانے کچہری کے چکر سے نکالنے کی مخلصانہ کوشش کروں گا۔ وہ میری باتیں توجہ سے سمجھنے کی کوشش کرتا رہا اور اقرار میں سر ہلاتا رہا۔ مجھے امید پیدا ہوئی کہ وہ میری بات مان لے گا...... لیکن اگلے ہی روز قصبے سے غائب ہو گیا...... اور پھر کبھی نظر نہیں آیا۔

معلوم نہیں وہ ڈر کر بھاگا تھا یا میری بات ہی اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ بلال شاہ کا خیال تھا کہ میری بات ہی اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ یہ سمجھتا رہا ہے کہ میں اسے بھاگنے کا مشورہ دے رہا ہوں...... اصل بات خواہ کچھ بھی تھی، گنگو جگنو کی طرح چمک کر ایک بار پھر جرم کی جان لیوا تاریکیوں میں کھو گیا تھا۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں شاید وہ زندگی کی طرف لوٹنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ یہاں کون تھا جو اس کی بات سمجھتا، اس کے دل کا حال جانتا۔ ایک ماں ہی تھی اور وہ چند دن پہلے اس سے روٹھ کر بہت دور جا چکی تھی۔ اب گونگا اپنی رمزوں کے ساتھ تنہا تھا اور تنہا آدمی زندگی سے اکتا ہی جایا کرتا ہے۔

☆======ختم شد======☆